خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ

زبان

مُصنّفہ

جناب مرزا سلطان احمد صاحب پنشنر ای - اے - سی

قادیان۔ تحصیل بٹالہ۔ ضلع گورداسپور (پنجاب)

(مُصنّف

فن شاعری۔ فنون لطیفہ۔ علوم القرآن وغیرہ)

معرفت "مرغوب ایجنسی لاہور" (چوک متی)

۱۹۲۳ء

قیمت ؏ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (۲۵۰) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۹-اپریل سنہ ۱۹۲۶ء (جہلم)

زبان کے متعلق ایک تمہیدی نوٹ
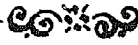
ادبی رنگ میں زبان سے مراد وہ حصۂ گوشت نہیں ہے جو ہر ایک انسان کے مُنہ میں ایک خاص شکل و ہیئت میں پایا جاتا ہے۔ زبان سے وہ الفاظ وہ کلمات مراد ہیں جو کسی ملک یا کسی حصۂ ملک کسی قوم اور کسی حصۂ قوم میں بولے جاتے اور مستعمل ہوں۔ اور جن کے ذریعہ سے انسان ایک دوسرے کے ساتھ بولتا چالتا اور گفتگو کرتا یا مطلب سمجھتا اور سمجھاتا ہو یا ایسے الفاظ جو کوئی نہ کوئی مفہوم۔ معنی اور مراد رکھتے ہوں یا ایسے الفاظ اور ایسے کلمات جو انسان کے مُنہ سے نکلیں اور انسان کی زبان سے بولے جائیں ۔

ان معنوں میں زبان کی تعریف یہ ہوئی کہ وہ چند ایسے مفردات اور مرکبات کا مجموعہ ہے جو مختلف انسانی جماعتوں میں بطور مقررّہ اشارات کے کام دیتے ہوں یا ایسے متلفظہ اشارات جو انسان کے مُنہ اور زبان سے مختلف رنگوں میں خارج ہوتے اور نکلتے ہوں جن کے کچھ نہ کچھ معانی اور تعبیرات ہوں یا ایسے الفاظ جو انسان کے مُنہ سے متلفظہ ہوں لیکن انسان اُنکو معانی اور تعبیرات سے واقف نہ ہو یا اُن کے معانی اور اُن کی تعبیرات مشخص نہ ہوں بالفاظ دیگر جنہیں الفاظ بے معنی سے تعبیر کیا جاتا ہے عُرفی پہلو سے زبان سے مراد صرف وہی الفاظ اور وہی کلمات

نکلتے ہیں جو کوئی مفہوم اور کوئی معنی رکھتے ہوں اور باعتبار اس کے کہ بے معنی الفاظ بھی انسان کے منہ اور زبان ہی سے نکلتے اور خارج ہوتے ہیں سلسلہ الفاظ میں ہی داخل ہیں۔ جبتک کہ کوئی شخص الفاظ متلفظ کے مقررہ اور موضوعہ معانی اور تعبیرات سے واقف نہ ہو اُس وقت تک وہ اُن کا مطلب نہیں نکال سکتا مثلاً جو شخص انگریزی الفاظ یا عربی الفاظ کے مقررہ اور موضوعہ معانی سے ناواقف ہے وہ کچھ نہیں سمجھ سکتا کہ انکا کیا مطلب اور کیا مراد ہے اگرچہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ اور کلمات کا مطلب سمجھ سکتا ہو۔ جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ زید یا بکر انگریزی زبان جانتا ہے تو بالفاظ دیگر اُس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ انگلش قوم کے اُن لفظی اشارات کے معانی سے واقف ہے جن کے ذریعہ سے انگلش قوم یا انگلستان کے لوگ اپنے روزمرہ مطالب اور مقاصد کا اظہار کرتے ہیں اور جو طریق اظہار مطالب اور تبلیغ مقاصد کا انگلش قوم میں معمول ہے اور جس کے سوائے اُن کا عموماً کوئی اور طریق تفہیم و افہام یا کلام نہیں ہے جسقدر الفاظ اور کلمات ایک قوم یا ایک ملک میں بولے جاتے ہیں وہ سب کے سب اشارات اور کنایات ہیں ؛

شروع شروع میں انسان اُن اشارات اور کنایات سے کام لیتا تھا جو تلفظی نہیں تھے بلکہ اشاری اعضائی مثلاً اشارہ چشم اشارہ ہاتھ۔ اشارہ سر اشارہ انگلی وغیرہ وغیرہ ؛

ان اشارات سے انسان ترقی کرتے کرتے اُن اشارات تک پہنچ گیا جو بذریعہ تلفظات اور کلام ادا ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ جن کا نام زبان پڑگیا یہ جتنے الفاظ اور جتنے کلمات انسان کے منہ سے نکلتے ہیں سب اشارات اور کنایات ہی ہیں جب ہم کوئی لفظ بولتے ہیں تو اُس سے مطلب بھی ایک اشارہ ہی ہوتا ہے۔ مثلاً ہم پہلے انگلی کے اشارہ سے دوسرے کو بلاتے

تھے اور اب ہم یہ کہکر بلاسکتے ہیں

"ادھر آؤ"

"آؤ"

"آئیے"

یہ سب اشارات ہی تو ہیں فرق صرف یہ ہے کہ ان کا تلفظ ہوتا ہے اور محض اشارات کوئی تلفظ نہیں رکھتے تھے۔ ان اشارات میں الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ اور دوسری قسم کے اشاروں میں حرکات اور سکنات سے زبان کی دو قسمیں ہیں

(الف) طبعی

(ب) وضعی

طبعی قسم میں اشارات کنایات اور دیگر کوائف شامل ہیں اور اس کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) طبعی بالصوت

(۲) طبعی بالحرکات

(۳) طبعی بالکوائف

پہلی قسم مثلاً آہ کرنا۔ آہ مارنا۔ آہ کھینچنا۔ وغیرہ وغیرہ

دوئم قسم آنکھوں اور ہاتھوں سے اشارہ کرنا۔

سوئم قسم بشرہ اور چہرہ وغیرہ کی رنگت اور کیفیت سے بعض حالات واردہ کا احساس اور ادراک۔

طبعی زبان کے ذریعہ سے کبھی انسان آپس میں بہت کچھ سمجھ اور سمجھا لیتے ہیں۔ اب تک بھی طبعی زبان سے ضرورت پر کام لیا جاتا ہے دیکھو ہم بغیر دریافت کے بعض وقت صرف بشرہ ہی سے دل کا کچھ نہ کچھ حال بتلا دیتے ہیں اسواء

کر لیتے ہیں۔ طبیب عموماً چہرہ سے ہی مزاج کی کیفیت معلوم کر لیتے ہیں نبض کی ضربات سے ایک حاذق طبیب بہت کچھ پا لیتا ہے۔ حرکات سے تو اس زمانہ میں ایک ایسے صحیح پیمانہ پر کام لیا جاتا ہے کہ پہلے زمانوں میں شاید اس کا خیال بھی نہیں ہوگا۔ بے تار ٹیلی فون۔ وائرلیس ہیلوگراف اشارات چندی حرکات ہی تو ہیں۔ اور یہ لفظ اور حروف بھی تو حرکات ہی ہیں۔ وضعی زبان یا وضعی زبانوں کی بنیاد طبعی زبان ہی سے پڑی ہے اگر یہ طبعی زبان نہ ہوتی تو وضعی زبان کی داغ بیل ہی نہ پڑتی۔ وضعی زبان وضعی زبانیں دوسرے الفاظ میں کیا ہیں۔

(الف) طبعی زبان کی ایک عملی یادگار

(ب) طبعی زبان کا ایک مکمل عکس

(ج) ناطق ہستیوں کا آپس میں ایک ناطقانہ معاہدہ

(د) چند مفاہیم کا ایک عملی رنگ

(ھ) چند مخصوصہ اور مقررہ اشارات جو چند مختلف النوع آوازوں یا اصوات کے ماتحت ہوتے ہیں۔

۲۳۔ مئی ۱۹۱۶ء (جہلم)

قدرتی زبانیں

اگرچہ غیر طبعی۔ خود پیدا کردہ۔ خود ساختہ۔ خود مرتبہ۔ ترکیبی اور اعتباری زبانیں آپس میں مختلف اور ایک دوسری سے متضاد ہیں لیکن قدرتی زبانیں یا جنہیں دوسرے الفاظ میں طبعی زبانیں کہنا زیادہ تر موزون ہوگا ایک ہی رنگ۔ ایک لوچ اور ایک ہی نشان رکھتی ہیں اُن میں یا تو سرے سے کچھ تفاوت ہی نہیں ہوتا اور یا بہت ہی تھوڑا فرق ہوتا ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم میں رہ کر

غور کرنے کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ قدرتی زبانوں میں چنداں یا معتدبہ تضاد نہیں ہے طبعی یا قدرتی زبانیں وہ ہیں جن کے الفاظ۔ انسان کے منہ اور زبان سے ارادتاً یا بعض وقت بے ساختہ یا خود بخود یا کسی کیفیت کے پیش آنے پر بلا تکلف نکل جاتے ہیں وہ اگرچہ کچھ مبہم سے اور بہت ہی مختصر ہوتے ہیں لیکن پھر بھی اُن کا مفہوم ایک وسعت رکھتا اور کچھ نہ کچھ ہوتا ہے کبھی وہ محض ایک جذبہ طبعی کے ماتحت سرزد ہوتے ہیں اور کبھی کسی واقعہ یا حادثہ کے پیش آنے پر اور کبھی کسی سوال اور صدا کے جواب میں اطلاق ہوتے ہیں۔

جس طرح غیر طبعی اور اعتباری زبانوں کے الفاظ بولے جانے کے بعد کسی نہ کسی اعتبار کی جہت سے اثر پذیر ہوتے ہیں اسی طرح قدرتی زبانوں کے الفاظ بھی مختلف رنگوں میں منتج ہوتے ہیں قدرتی زبانوں کے مقابلہ میں غیر طبعی۔ اور اعتباری زبانوں کی مد در اصل کوئی جداگانہ مد نہیں ہے غیر طبعی اور اعتباری زبانیں بھی دراصل قدرتی زبانوں ہی کا ظل یا اثر ہیں صرف اس واسطے انہیں دو مدوں میں رکھا گیا ہے کہ قدرتی زبانوں کی ترکیبی یا تفصیلی صورتیں۔ اشکال اور آثار وہ نہیں ہیں جو اعتباری زبانوں کے ہیں گو ان دونوں میں بہت کچھ نسبت بھی ہے پھر بھی ان دونوں میں فرق ہے اعتباری زبانیں گو کبھی کبھی طبعی بھی یہاں تک بھی کہی جاتی ہیں لیکن فرق اور تضاد بھی بہت کچھ ہے قدرتی زبانوں میں بمقابلہ ان کے بہت کچھ اتصال ہے قدرتی زبانیں کونسی ہیں یا اُن کی تعریف کیا ہے:۔

۱۔ یہ وہ زبانیں ہیں جو بغیر کسی قید اور ضابطہ لسانی کے ہر انسان کے اپنے اپنے رنگ میں اطلاق پاتی رہیں۔

۲۔ پیدا ہونے کے ساتھ ہی ہر انسان ان ہی زبانوں میں بولتا ہے۔ دراصل یہ سب زبانیں ایک ہی قاعدہ۔ ایک ہی ضابطہ اور ایک ہی صرف و نحو

کے ماتحت ہیں اور باوجود کسی قدر تضاد کے بھی ایک ہی ہیں

قدرتی زبانوں سے صرف ایک ہی طبعی زبان مراد ہے جس طرح انسان شخصی رنگ میں مختلف ہیں لیکن بلحاظ انسانیت اور نوعیت کے ایک ہی ہیں اسی طرح باعتبار زبان ہونے کے کل قدرتی زبانیں ایک ہی ہیں اگر کسی قدر اُن میں فرق بھی پایا جاتا ہے تو وہ محض ایک اعتباری یا تعبیری ہوتا ہے۔ اس توجیہ کے ماتحت قدرتی زبانوں سے ایک ایسی زبان مراد ہے جو ہر ایک شخص طبعی رنگ میں بول رہا ہے خواہ ایسا شخص ہندوستان کا رہنے والا ہو اور خواہ یورپ کا اور خواہ شام و مصر اور عرب کا۔ غور کرنے پر تمہیں معلوم ہو سکیگا کہ ہر شخص ہر گونہ دنیا میں برنگ طبعی ایک ہی قسم کی زبان سے کام لے رہا ہے گو اس طبعی زبان کے الفاظ معدودے چند ہی ہوں لیکن اُن کا مشتق اُن کا مصدر اور اُن کا مخزن ایک سرے سے لیکر دوسرے تک ایک ہی ہے ایک کل کا بچّہ بھی اُسی لے اور اُسی رنگ میں بولتا ہے اور ایک بالغ اور ایک سال خوردہ بھی اُسی ٹون میں ؛

ہم کبھی کبھی اعتباری زبانوں یا اعتباری الفاظ کے سوائے جو کچھ بولتے اور جو کچھ مُنہ سے نکالتے ہیں وہ سب کچھ طبعی زبان ہی کا سرمایۂ اندوختہ ہوتا ہے۔ آں۔ اُوں۔ غاں۔ غوں۔ آہ۔ اوہ۔ ایں۔ آں وغیرہ وغیرہ طبعی زبان ہی کے مرکّبات ہیں جو صدا جو آواز جو بول ہمارے مُنہ سے نکلتا ہے یہ سب طبعی زبان ہی کے الفاظ ہیں بجز اُن الفاظ اور اُن مرکّبات کے جو اعتباری یا خود ساختہ زبانوں کے اجزا ہیں جو کچھ ہمارے مُنہ سے نکلتا اور ہماری زبان سے ادا ہوتا ہے وہ سب طبعی زبان کے اجزا یا ذریات ہیں اگر ہم مدّتوں اعتباری زبان نہ بھی بولیں تب بھی ہم طبعی زبان کے بولنے یا اُس سے کام لینے سے باز نہیں رہ سکتے دیکھو ایک ہی روز کا بچّہ اور ستّو

سال کا مخبوط الحواس بوڑھا بچپن اور تعطل حواس کی صورت میں بھی طبعی ہی
زبان سے کام لیتا اور بولتا چالتا ہے گو دوسرے نہ سمجھیں یا نہ سمجھ سکیں
لیکن وہ خود اُن کے مفہوم اور مطلب سے آگاہ ہوتا ہے گو ایسی طبعی بولیاں
کسی قاعدہ صرف و نحو کے ماتحت نہ ہوں پھر بھی اُن کا کچھ نہ کچھ مطلب
ہوتا ہے جس وقت ایک بولنے والا منہ سے لفظ۔ ہوں۔ اوہ۔ نکالتا ہے
تو ایسے الفاظ بھی کوئی نہ کوئی مطلب رکھتے ہی ہیں حالانکہ اعتباری قواعد
زبان کے ماتحت اُن کا کوئی مفہوم نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ وہ محض طبعی
کشش اور حلقی تصرفات ہی ہوتے ہیں ؛

قدرتی زبانوں کی وسعت

قدرتی زبانیں محض انسانی جماعتوں ہی سے مختص نہیں ہیں وہ دوسری
مخلوق یا کائنات سے بھی کسی نہ کسی حد تک اُن کی وابستگی ہوتی ہے حیوانات
بھی اپنے اپنے طبعی رنگ میں طبعی السنہ سے کام لیتے ہیں علاوہ اُن اعتباری بولیوں
کے جو اُن کے روزمرہ استعمال میں آتی رہتی ہیں اسی طرح اور کائنات کی بولیاں
اور صدائیں بھی جو طبعی رنگ میں اُن سے سرزد ہوتی رہتی ہیں طبعی زبانیں
ہیں جب ایک لکڑی دوسری لکڑی سے یا جب ایک جسم دوسرے جسم سے
ٹکراتا ہے تو اُس ٹکراؤ سے جو آواز خارج ہوتی ہے وہ ایک طبعی زبان ہی
ہوتی ہے اور اُس کا کچھ نہ کچھ اثر اور تلفظ بھی ہوتا ہے اگرچہ ایسی صداؤں
میں سے بہت سی صدائیں بظاہر بے مطلب بھی ہوتی ہیں مگر بعض صدائیں
ویسا ہی مطلب رکھتی ہیں جیسے بعض معنی دار صدائیں رکھتی ہیں یا یہ کہ وہ بھی
بامعنی صداؤں کے ہم قالب یا اُن کی قائم مقام ہوتی ہیں دیکھو آواز جرس

اور صدائے گھنٹہ اور گھڑی کی ٹک ٹک کیسا واضح مفہوم رکھتی ہے کوئی انسان بولے نہ بولے کچھ کہے نہ کہے ان کی صدا سے سننے والے چوکنے ہو جاتے اور مطلب نکال لیتے ہیں۔ جب کوئی شخص تالی بجاتا۔ دروازہ کھٹکھٹاتا نقارہ پر چوٹ مارتا ہے جب بندوق چھوٹتی اور بانسلی بجتی ہے تو سننے والے فوراً ہی سمجھ جاتے ہیں یہ ضرورت نہیں کہ انہیں مقررہ یا اعتباری الفاظ میں کوئی سمجھائے جیسے جانداروں اور انسانوں کی بولیاں ہوتی ہیں ایسے ہی یہ بھی ایک قسم کی زبانیں ہیں قدرتی زبانوں کی وسعت نہ صرف صداؤں ہی تک محدود رہتی ہے اشارات اور کنایات کو بھی شامل ہے گو اشاروں اور کنایوں میں کوئی آواز نہیں ہوتی لیکن اُن سے ویسا ہی مطلب سمجھا جا سکتا ہے جیسے بعض الفاظ اور بعض صداؤں سے یہ تمام صورتیں جو دیگر مخلوق میں پائی جاتی ہیں ان سب کا مجموعہ انسان ہے۔ صدائیں اور آوازیں حیوانات نباتات جمادات۔ ارضیات فلکیات غرض کل دیگر کائنات سے صادر ہوتی ہیں انسان اپنی ذہانت سے اُن کی تاویل کرنے کا عادی ہے گو انسان اُن سب کا موجد اور موجب نہیں ہے لیکن کسی نہ کسی رنگ میں اُن کا جامع اور مؤوّل ضرور ہے یا یہ کہ انسان اپنی ذہانت۔ قوت ادراک کے زور سے اُن کی تعبیر اور تاویل کر سکتا ہے اور ایسی تعبیر و تاویل بسا اوقات صحیح اور درست ہوتی ہے ؛

قدرتی زبانوں کی ابجد

قدرتی زبان یا قدرتی زبانوں کی ابجد بھی وہی ہے جو مرتبہ اور اعتباری زبانوں کی ہے یا یہ کہ اعتباری اور مرتبہ زبانوں کی ابجد دراصل قدرتی زبانوں

کی ابجد کا ہی ظل اور نمونہ ہے صرف فرق یہ ہے کہ اعتباری زبان یا زبانوں کی ابجد
ایک ترکیبی اور تالیفی شکل میں لائی گئی ہے اور قدرتی زبان کی ابجد بلا کسی
ترکیب کے اپنے طبعی رنگ میں عمل پذیر ہے جس طرح دنیا کی اعتباری
یا ظلی ابجدوں کے حروف تعداد اور اشکال میں مختلف نمبر رکھتے ہیں۔
اسی طرح قدرتی زبان کے حروف بھی مختلف کیفیت رکھتے ہیں کوئی ایسی اعتباری
یا ظلی ابجد نہیں ہے۔ جس کے حروف قدرتی ابجد میں نہ پائے جاتے ہوں
قدرتی زبان یا قدرتی زبانوں کی ابجد یا ابجدی حروف کی وابستگی منہ۔
حلق اور زبان سے مربوط ہے۔ اور اعتباری یا ظلی ابجدوں کے حروف
اور آوازیں بھی ان ہی ہرسہ مخارج سے وابستہ اور مربوط ہیں بیشک
بعض وقت یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ :۔
بعض ملکوں اور قوموں کے لوگ فلاں حرف مثلاً (گ) کو (ج) اور
(ٹی) کو (ٹھی) بولتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ایسے
حروف قدرتی حروف کی لسٹ میں داخل نہیں ہیں یا قدرتی زبانوں کی
ابجد میں ان کا نشان نہیں ملتا یا یہ کہ ایسے حروف کا انداز صوت حدود قدرتی
یا صوت قدرتی زبان سے خارج ہے۔ جو لوگ بعض حروف کا تلفظ کسی قدر
مشکل سے کرتے ہیں۔ اُن کے واسطے ایسی مشکل ایک عارضی مشکل ہوتی ہے بولتے
بولتے ایسی مشکل رفع ہو جاتی ہے دیکھو جو عربی اور انگلستانی۔ ہندوستان
میں آ رہتے ہیں وہ ہندوستانیوں کے مطابق اور لہجہ میں ہی رفتہ رفتہ بولنے
لگ جاتے ہیں۔ قدرت کی جانب سے ہر نسل انسان کو تقریباً ایک ہی قسم کی
ابجد دی گئی ہے۔ اور ہر متنفس اُس سے ایک ہی طرح پر بادنیٰ تغیر کام لیتا ہے
بے شک بعض اوقات آب و ہوا۔ اور بعض دیگر ضروریات یا موانعات کی
وجہ سے ہیں رنگ میں کچھ تغیر تبدل بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر حالت میں

ایسا تغیر اور تبدل عارضی ہی ہوتا ہے ؟

قدرتی زبان کی ابجد اور اعتباری یا ظلّی زبانوں کی ابجدوں میں ایک یہ بھی فرق ہے۔ کہ قدرتی زبان یا قدرتی زبانوں کی ابجد ہمیشہ مرکّب شکل میں متکیّف اور متلفّظ ہوتی ہے۔ اور اعتباری یا ظلّی زبانوں کی ابجدیں بسلسلہ تحریر میں مفردانہ اشکال رکھتی ہیں۔ اور تلفّظ میں مرکبہ مثلاً قدرتی زبان میں (آ) ایک مرکّب شکل ہے۔ اور اعتباری یا ظلّی زبانوں میں (A) بہ سلسلہ ترمیم یا بصورت تحریر مفرد اور بہ صورت تلفّظ (الف اور ب) کے استعمال سے ایک مرکبہ شکل گویا ایک شکل میں دو تو ابجدیں ملتی ہیں اور دوسری صورت میں جداگانہ اور متفرد ہیں ؟

ابجدیں کس طرح بنیں

زبان یا زبانوں کی بحث میں یہ ایک دلچسپ بحث ہے کہ ابجد کس طرح بنی یا بنتی ہے۔ میری رائے میں تمام اعتباری یا ظلّی زبانوں کی ابجدیں قدرتی زبان کی ابجد سے ترتیب دادہ ہیں اگرچہ اس کی بابت کسی تاریخی ثبوت کا پیش کرنا خیلے مشکل ہے۔ لیکن اس کے متعلق جو قیاس کیا جا سکتا ہے وہ اپنے رنگ میں مورخانہ ثبوت سے کہیں زیادہ مدلّل اور اہم ہے ایک طرف اعتباری اور ظلّی زبانوں کی ابجدیں رکھ لو۔ اور دوسری جانب قدرتی زبان کی ابجد دونو کے مقابلہ سے پتہ لگ جائے گا کہ

"قدرتی ابجد ہی ہماری تمام زبانوں کی اصل ہے"

ایک ایسا لڑکا لڑکی یا کوئی آدمی چن لو جو محض الٹریا ناخواندہ ہو یا بالکل نوخیز اور ناواقف وہ جو کچھ بولتا جائے اُسے لکھتے جاؤ اور بعد میں اندازہ

کرو کہ جو کچھ وہ بولا یا جو کچھ اُس نے کہا اُس میں کون کون سے اور کس قدر حروف آ چکے ہیں اور ہماری معترفہ ابجدوں سے وہ کیا کچھ نسبت رکھتے ہیں۔
دیکھو جب دو چار ہی دن کا بچّہ اُوں-آں-ہُوں ہاں-ٹُوں ٹاں-اَین ٹَین فاں-فُوں اور شاں شوں کرنے لگتا ہے تو اُس کی ایسی آواز میں کن کن حروف سے مرکّب ہوتی ہیں؟-

حروف ا-ن-ہ-ٹ-و-ی-ف-م-ش-ان طبعی آوازوں میں پائے جاتے ہیں-ان آوازوں پر کیا موقوف ہے جو آواز اور جو لفظ انسان کے مُنہ سے نکلے گا نہ صرف انسان ہی کے مُنہ سے بلکہ جو کوئی آواز آئے گی وہی بعض ایسے حروف سے مرکّب ہوگی جو ہماری اعتباری یا ظلی السنہ کی ابجدوں میں پائے جاتے ہیں اس سے آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ایک ننھا سا لڑکا یا لڑکی تمہاری اعتباری یا ظلی ابجدوں سے تو محض ناواقف تھی۔ اُس کے ننھے مُنہ سے ا-ن-ہ-ٹ وغیرہ حرفوں کا نکلنا کیسا تعجب ناک ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ لڑکی یا لڑکا اگرچہ ایسے مرکبہ حروف بآسانی بولتا جاتا ہے لیکن جب اُسے بعد میں یہی حروف کسی اسکول اور مکتب میں پڑھائے لکھائے جاتے ہیں تو وہ انہیں اجنبی سمجھتا ہے اور اُن کے بولنے اور لکھنے میں اُسے دِقّت معلوم ہوتی ہے۔ بعض وقت مُنہ سے ایک حرف کا نکالنا ہی دوبھر گذرتا ہے اس دو عملی سے تمہیں پتہ لگ سکتا ہے کہ طبعی رنگ میں ابجد کیا کچھ سہل ہوتی ہے اور کیفیت کیسی ہے اور اعتباری شکل میں لا کر اس میں کس قدر مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی اس کے یہ بات بھی بآسانی تمہاری سمجھ میں آجائے گی کہ جب قدرتی نظام سے اعتباری رنگ میں کام لیا جاتا ہے تو اُس کی شکل کچھ اور ہی ہو جاتی ہے اس تجربہ کے بعد ہم اس بات کے سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں کہ تمام اعتباری زبانوں کی ابجدیں قدرتی

ابجد ہی کا عکس یا ظل ہیں۔ حضرت انسان کے مُنہ سے جس قدر اور جس رنگ کی آوازیں نکلیں اُن سے ہماری اعتباری ابجدوں کی بنیاد پڑتی گئی۔ آ سے الف ہا سے ہ۔ نا سے نون۔ ما یا ماں سے میم شا یا شاں سے شین دا سے د۔ وا سے۔ و۔ ٹا یا ٹاں سے ٹے وغیرہ وغیرہ حروف کی بنیاد پڑتی گئی بعض لوگوں نے ان قدرتی آوازوں سے چھبیس[۲۶] حروف بنائے بعض نے تیس[۳۰] بعض نے پینتیس[۳۵] بعض نے پاون اور بعض نے اس سے بھی زیادہ ہر زبان کی ابجد سے تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ کسی ابجد کا کوئی حرف یا کوئی آواز بھی قدرتی ابجد یا قدرتی آوازوں سے باہر نہیں جاتی اعتباری ابجدوں کی کمی و بیشی کا موجب سوائے اسکے اور کچھ نہیں ہے کہ

بعض قوموں نے مخارج و منافذ حلقی سے بوسعت کام لیا اور بعض نے چند مخارج و چند منافذ ہی پر کفایت کی۔ حلقی مخارج و منافذ ہر ایک انسان کے حصّہ میں با دنی تغیر قدرت نے ایک ہی غرض کے ماتحت باعتبار ہر ایک ہستی۔ وجود۔ ذات اور ضرورت کے دیئے رکھے ہیں لیکن باعتبار نوعیت۔ جذب۔ اثر اور تصرف کے ان میں ایک حد تک امتیاز اور فرق بھی ہوتا ہے اسی امتیاز اور فرق کی وجہ سے حلقی جذبات تاثیرات اور تصرفات میں بہت کچھ فرق ہو جاتا ہے دیکھو بعض آدمیوں کی آواز کیسی سریلی اور شیریں ہوتی ہے بعض کی آواز میں اس قسم کی کرختگی پائی جاتی ہے کہ انسان اُس کے سُننے سے دل گھبراتا ہے۔ مختلف انسانوں۔ اور قوموں کی بولیوں اور لحون میں جو فرق باعتبار نرمی سختی۔ ملائمت کرختگی۔ اثر۔ اور کراہت پایا جاتا ہے اُس کا موجب بھی یہی امتیاز نوعیت۔ جذب اثر اور تصرّف ہے۔

ہم ابجد ساتھ ہی لاتے ہیں

اوپر کی بحث سے ثابت ہے کہ ہم ابجد پیدائش کے ساتھ ہی لاتے ہیں
اور یہیں مادرِ قدرت اور مادرِ فطرت کی جانب سے وہ بطور ایک علمی اثاثہ یا علمی سرمایہ
کے ملتی ہے۔ اگرچہ ہم شروع شروع میں اُس سرمایہ سے بہت ہی کم کام لینے
پاسکتے ہیں۔ لیکن جُوں جُوں ہماری قوتیں نشو و نما پاتی جاتی ہیں ویوں وُوں
ہم اُس فطرتی سرمایۂ سے مختلف رنگوں میں کام لینے لگتے ہیں۔ اگرچہ بعد
میں ہم کیسے ہی برتر مدارج پر فائز ہوں ہمارے ہر ایک قسم کے علمی عروج کا
اصلی موجب وہی فطرتی ابجد یا فطرتی سرمایۂ ہوتا ہے یہ کتنی بڑی قدرت کی
فیاضی ہے کہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی ہر بچہ اُس ابجد سے واقف ہوتا
ہے جو من بعد اُس کے لسانی اور علمی عروج اور امتیاز و ترقی کا باعث ہوگی
وہ پیدا ہوتے ہی طبعی ابجد سے کام لینے لگتا ہے اور پیدائش کے ساتھ
ہی قدرت اُسے اُس فطرتی ابجد سے کام لینے پر مجبور کرتی ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ

ہم خود ابجد کے بانی ہیں۔ میری رائے میں وہ غلطی کھاتے ہیں وہ ابجد
کے بانی نہیں ہیں ابجد کی بانی قدرت یا اُن کی فطرت ہے البتہ یہ کہا
جاسکتا ہے کہ فطرتی قوتوں نے ترقی کرتے کرتے قدرتی ابجد کی امداد سے
مختلف صورتوں اور شکلوں میں ابجد کی تاویل اور تعبیر کی عزت حاصل کی
قدرتی رنگ میں ابجد محض ایک ہوا تھی اُس کی کوئی صورت اور کوئی شکل
نہ تھی انسان نے غور اور خوض کرنے کے بعد اُس ہوا کو باندھا اور قابو
کرکے اُسے مختلف اشکال میں تحویل کرکے دکھایا اگر انسان یہ نہ کرتا تو قدرتی
ابجد کا وجود سوائے اس کے کچھ اور نہ ہوتا کہ انسان کے مُنہ سے ایک ہوا

نکلتی اور نکلکر باہر کی ہوا سے مل جاتی ۔

ایں - آں - ہوں - ہاں - ہیں - او - ہے - ہا - مہ - ما - ہاں - ہاں ہوں - ہوں - ایں - ایں - آں آں ایسی آوازیں ہیں جو ہر قوم اور ہر ملک والوں کے منہ اور زبان سے نکلتی ہیں اگرچہ اُن کی نسبت اعتباری اور ظلی زبانوں میں کیسا ہی تضاد اور اختلاف ہو۔ لیکن طبعی نوعیت کے اعتبار سے اُن میں کوئی فرق نہیں۔ سرزمین ہند میں بھی یہی الفاظ یا یہی آوازیں پائی جاتی ہیں یورپ عرب و شام اور اقصائے چین و جاپان میں بھی۔ یہی ایک ہندوستانی بھی ان کا عادی ہے اور ایک عربی اور یوروپین بھی۔ یہ کیا ہے مختلف اشکال کی ہواؤں کا مجموعہ یا مختلف ہواؤں کے مختلف مرکبات۔ کیا ہم ایسے مرکبات کسی اُستاد سے سیکھتے ہیں یا کسی اسکول میں ان کی تعلیم ہوتی ہے نہیں نہیں ان کا ذخیرہ ہماری سرشت ہی میں رکھ دیا گیا ہے۔ اگر کوئی آدم زاد یوم ولادت ہی سے اٹھایا جاکر جنگل یا حیوانات میں رکھ دیا جائے تو وہ بھی ان ہی آوازوں سے کام لے گا۔ اُس کی زبان بھی ایک بڑی حد تک ان ہی کلمات سے آشنا ہوگی گو بوجہ صحبت حیوانات حیوانی رنگ میں بھی وہ رنگا جائیگا لیکن اصلی رنگ وہی ہوگا جو قدرت کی جانب سے اُس کے حصہ بخرہ میں آچکا ہے عارضی رنگ میں تو انسان کی صحبت اور انسان کی تعلیم سے میاں مٹھو بھی بولنے لگتا ہے اُس کی حیوانی زبان سے بھی میاں مٹھو میاں مٹھو کا جملہ رٹا جاتا ہے لیکن جو مادہ طاقت اور قوت نطق حضرت انسان کے حصہ میں آچکی ہے وہ میاں مٹھو میں کس طرح پیدا ہوسکتی ہے میاں مٹھو جو قوت اپنے رنگ میں بولنے کی رکھتا ہے وہ انسانی قوت ناطقہ سے بہت ہی مختلف فیہ ہے گو اُس میں ایک حد تک

یہ ملکہ بھی ہے کہ انسانی تعلیم سے کسی حد تک انسانی نطق کی نقل اُتار سکے لیکن وہ ہمیشہ ایک نقل ہی کہی جائے گی نہ کہ وہ قوّت یا وہ ملکہ جو حضرت انسان کی ذات میں قدرت نے بخش رکھا ہے میاں مٹھو جتنے کلمات یا الفاظ انسان سے سیکھتا ہے وُہی اخیر تک رٹتا رہتا ہے اُن میں کوئی ترقی نہیں کرتا۔ خلاف اس کے انسان اپنے ملکات کے زور سے ہمیشہ ترقی کرتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اُن مدارج تک پُہنچ جاتا ہے جو شروع شروع میں اُس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھے جب ایک طالب علم پڑھ کر فارغ ہوتا ہے یا پڑھ چکتا ہے تو اس عرصہ میں وہ جو کچھ سیکھ چکا ہے اگر اُس میں وہ ترقی کرنا چاہے تو بہت کچھ کر سکتا ہے جو لوگ علمی دَوڑ میں بہت دُور نکل گئے ہیں اُنہیں شروع میں خود بھی یہ علم نہ تھا کہ اُن کی علمی رفتار اس درجہ تک ترقی کر جائے گی اس کا باعث شروع کی تعلیم و تدریس ہی نہیں ہوتی بلکہ وہ ملکات وہ قوّتیں وہ ذہانت وہ درک جو قدرت کی جانب سے بعض انسانوں کی طبیعت میں ودیعت شدہ ہے میاں مٹھو کو یہ بات حاصل نہیں اس واسطے اُس کا مایۂ علم اُن ہی دو چار الفاظ تک محدود رہتا ہے جنہیں وہ آہستہ آہستہ دنوں میں سیکھتا ہے اگر میاں مٹھو بھی انسان ایسے ملکات اور قوّتیں رکھتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ بھی انسان کی طرح ترقی نہ کر سکتا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ

ابجدوں کا استدلال

(جہلم ۹-۲ مئی سنہ ۱۹۱۲ء)

السنہ دنیا کی جسقدر ابجدیں دیکھی جاتی ہیں اُن سب کے حروف میں

الفاظ میں ایک نسبت اور ایک وحدت پائی جاتی ہے یہ وحدت اور نسبت
اس واسطے سب ابجدوں میں پائی جاتی ہے کہ کُل زبانوں کی ابجدیں اُن
آوازوں سے وابستہ ہیں یا اُن آوازوں سے نکلی یا بنائی گئی ہیں جو
انسان کے مُنہ اور حلقوم سے خارج ہوتی یا نکلتی ہیں۔ انسان کے مُنہ سے
جس قدر آوازیں نکلتی ہیں اُن سب کا مفہوم اور شکل ایک ہی قسم کی ہوتی ہے
اوّل تو اُن میں فرق ہوتا نہیں اور اگر ہوتا ہے تو بہت ہی کم۔ اب مقابلہ
کر کے دیکھو:۔

(۱) ابجد فارسی۔ عربی۔ اُردو:۔

ا۔ب۔ت۔ٹ۔ث۔ج۔چ۔ح۔خ۔ د۔ ڈ۔ذ۔ر۔ز۔ژ۔س۔ش
ص۔ض۔ ط۔ظ۔ع۔غ۔ف۔ ق۔ک۔ ل۔م۔ن۔و۔ہ۔ی۔

(۲) انگریزی ابجد:۔

اے۔بی۔سی۔ڈی۔ای۔ایف۔جی۔ایچ۔آئی۔جے۔کے۔ایل
ایم۔این۔اَو۔پی۔کیو۔آر۔ایس۔ٹی۔یُو۔وی۔ڈبلیو۔ایکس
وائی۔زیڈ۔

(۳) سنسکرت ابجد:۔

اَ۔آ۔اِی۔اِیٓ۔اُ۔اُوٓ۔رِ۔رے۔لِر۔لری۔اے۔اَئی۔او۔اَوٗ
اَ۔آ۔کا۔کھا۔گا۔گھا۔ننٔا۔چا۔چھا۔جا۔جھا۔یاں۔ٹا
ٹھا۔ڈا۔ڈھا۔نا۔تا۔تھا۔دا۔دھا۔ناں۔پا۔پھا۔با۔بھا
ما۔یا۔را۔لا۔وا۔شا۔کھا۔سا۔ہا۔ کھیا۔ترا۔گیا۔گونگ

اگرچہ حروف ابجد کی تعداد میں کچھ کچھ فرق ہوتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا
کہ ماخذ ابجدوں کا کوئی اختلاف رکھتا ہے ماخذ سب ابجدوں کا
ایک ہی ہے صرف فرق یہ ہوتا ہے کہ بعض قوموں نے آوازوں

کی تاویل ذرا باریک کردی ہے اور بعض نے موٹے طور پر آوازوں کا خاکہ اُتارا ہے۔ جو قومیں باریک پہلو رکھتی ہیں اُن کی ابجد نسبتاً زیادہ حروف رکھتی ہے۔ اور جن قوموں نے آوازوں کا موٹا حساب لگایا ہے اُن کی ابجدیں کم حروف رکھتی ہیں۔ چونکہ بعض آوازیں حلقی ہیں اور بعض شفتی بعض سنی وغیرہ وغیرہ۔ اس واسطے کسی قوم نے حلق کی موٹی صورتیں مقدم رکھی ہیں اور کسی نے باریک پہلو لیا ہے مثلاً (ن) کا تلفّظ ایک تو موٹے طور پر ہوتا ہے اور ایک نہایت باریک طور پر حرف (ن) صرف زبان کی معمولی حرکت سے بولا جاتا ہے جیسے (نوں۔ نوون۔ نیا) مگر اگر ہم (انگا) دونون سے بولنا چاہیں تو یہ تلفّظ حلقوم سے ہو سکے گا اسی طرح لفظ (آں۔ باں۔ شاں) کا قریباً حلق سے تلفظ ہوگا۔ ایسی باریک آوازیں سنسکرت زبان میں بڑی خوبصورتی سے اخذ کی گئی ہیں۔ اور اسی طرح چینی زبان میں بھی باریک آوازوں سے کام لیا گیا ہے۔

ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ابجدی سلسلے تمام زبانوں کے ایک ہی مرکز طبعی سے جا ملتے ہیں ان میں اگر کوئی اختلاف بھی ہے تو وہ صرف ایک تعبیری اختلاف ہے۔ ایسا تعبیری فرق جو تھوڑی سی ترمیم یا اضافہ کے بعد ایک ہی رنگ پر آجاتا ہے جب حرفی یا ابجدی سلسلہ ایک ہی ہے۔ جو سلسلہ الفاظ کا ایک شروع یا پہلی اور بنیادی کڑی ہے تو ماننا پڑے گا کہ کُل زبانوں کا شروع بھی ایک ہی تھا اور ایک ہی زبان یا ایک ہی سلسلہ سے یہ سب زبانیں نکلیں یا ایک ہی زبان کی فرعین ہیں سماطبقی یا ارین زبانوں کی تفریق بعد میں رفتہ رفتہ ہوئی ہے ورنہ ان سب کا شروع ایک ہی تھا اور اس سے یہ بھی ثابت ہے کہ کل ذریات انسانی کا مورثِ اعلیٰ بھی ایک ہی تھا وہ انسانی ذریات جو اس وقت اس کائنات اور اس دنیا میں پائی جاتی ہے نہ وہ سلسلہ کائنات

جو اس موجودہ کائنات سے پہلے گذر چکا ہے۔ یہ سوال کہ انسانی مورث جدا جدا ہیں یا اُن کی نسلیں جدا گانہ مورثوں سے تعلق رکھتی ہیں ایک بحث طلب سوال ہے یہ تفریق اور یہ تفرد جو اس وقت انسانی ذریات میں پایا جاتا ہے گو یہ بعض وجوہ اسے ایک مستقل تفریق قرار دیا جا سکے۔ مگر جب ہم اس کے خلاف دوسری طبعی صورتوں اور نسلی خصوصیات پر غور کرتے ہیں تو اُن سب کا سلسلہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے اشکال اور نقوش میں گونہ اختلاف پایا جانا مضبوط دلیل نہیں ہے وہ تو ایسا ہی اختلاف ہے جیسے زبانوں اور زبانوں کے مخرجات اور الفاظ میں پایا جاتا ہے اور باوجود اسکے بھی زبانیں آپس میں ملتی ہیں فافہم

دیگر آوازیں

گر زنی دو چیز را در یکدگر ۔۔۔ آید از وے حرفے و صوتے بدر

انسانی آوازوں کا اصلی یا نیچرل مخرج اور دہانہ مُنہ ہے۔ جبتک انسان مُنہ سے نہ بولے تب تک یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بولا یا اس نے کوئی آواز دی ہے۔ بعض دفعہ تالی بجانے سے جو آواز نکلتی یا سُنائی دیتی ہے وہ اگرچہ ایک آواز تو ہوتی ہے۔ لیکن اس پر انسان کے مُنہ کی آواز کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ انسانی آواز وہی ہوگی جو انسان کے مُنہ سے نکلے گی۔ انسانی مُنہ سے جس قدر آوازیں نکلتی اور خارج ہوتی ہیں وہ سب کی سب بامعنی ہی نہیں ہوتیں۔ اُن میں سے بعض ایسی آوازیں بھی ہوتی ہیں جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ لیکن بے معنی ہونے کی وجہ سے اُنہیں سلسلہ آوازوں سے باہر نہیں رکھا جا سکتا اس سے یہ ثابت ہے کہ جو آوازیں کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں وہ بھی آوازیں ہی ہوتی

ہیں۔ اور چونکہ وہ بھی باوجود بے معنی ہونے کے چند حروف اور چند الفاظ
سے مرکّب ہوتی ہیں اس واسطے وہ بھی صحیح رنگ میں آوازیں ہی ہیں۔
صرف انسان ہی کے مُنہ سے آوازیں نہیں نکلتی ہیں۔ اور اجسام اور اشیاء
کے تصادم یا تضارب سے بھی مختلف قسم کی آوازیں نکلتی اور سُنی
جاتی ہیں مثلاً ہوا۔ پانی۔ مٹی۔ آگ۔ بجلی۔ بارش۔ لکڑی۔ لوہا۔
تانبہ۔ سونا۔ چاندی۔ ٹرین۔ تار وغیرہ وغیرہ اشیاء سے بھی مختلف
قسم کی آوازیں خارج ہوتی اور سُنائی دیتی ہیں جب ایک لکڑی دوسری
پر یا ایک لوہے کی سلاخ پر دوسری سلاخ یا کوئی دوسری شے لگتی یا
ماری جاتی ہے تو اس ضرب یا اس صدمہ سے ایک خاص قسم کی آواز
نکلتی یا سُنائی دیتی ہے۔ ایسی آوازیں ہمیشہ مرکّب ہوتی ہیں یعنی سُننے
والا سمجھتا ہے کہ وہ چند حروف سے ترکیب یافتہ ہیں اور اُن کا کسی نہ کسی
رنگ میں تلفّظ بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھو جب بجلی گرتی یا جب بادل گرجتے ہیں یا
ٹرین چلتی یا جب ایک لکڑی دوسری لکڑی پر ماری جاتی ہے تو ہمیں
ایک قسم کی آواز سُنائی دیتی ہے جس کا ہم بآسانی اپنی سمجھ یا اپنے
قاعدہ کے مطابق تلفّظ بھی کر سکتے ہیں مثلاً انجن کی بھپ بھپ
لکڑی کی کھٹ کھٹ گھڑی کی ٹِک ٹِک کی آوازیں حروف سے
ترکیب پاتے ہوئے ایک تلفّظ رکھتی ہیں یہ آوازیں عموماً دو قسم
کی ہوتی ہیں:۔

(الف) استدلالی آوازیں بہ معانی مفروضہ۔

(ب) خارج یا بیرون از احاطہ استدلال۔

پہلی قسم کی وہ آوازیں ہیں۔ جن کے سُننے پر ہم ایک قسم کا فرضی یا قیاسی
استدلال کر سکتے ہیں مثلاً جب ہم انجن کی بھپ بھپ گھڑی کی ٹِک

ٹک سُنتے ہیں تو یہ قیاس کرتے ہیں کہ انجن چل رہا ہے اور گھڑی آواز دے رہی ہے یا جب ہم بجلی کوندتی سُنتے ہیں تو جان جاتے ہیں کہ بجلی کوند رہی ہے۔ بعض ایسی آوازوں سے ہم ایک خاص چیز کی تخصیص بھی کر لیتے ہیں۔ مثلاً بکری۔ بھیڑ۔ تیتر۔ چڑیا۔ اور کُتّے کی آوازوں ہی سے ہم اُنہیں بلا دیکھنے کے معلوم کر لیتے ہیں۔ جب کوئی شخص دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے تو ہم اندر ہی بیٹھے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی شخص باہر کھڑا ہے یا ہمیں بُلا رہا ہے۔ دیکھو گھڑی کی آواز کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن اُس کی ٹک ٹک اکثر وقت بتانے میں ہمیں ایک صحیح پہلو پہ لے جاتی ہے اور ہم اُس کی ٹک ٹک سے مطلب نکال لیتے ہیں۔ ایسی آوازوں کا تلفّظ ہمیشہ جُداگانہ ہوتا ہے۔ مثلاً گھڑی کی آواز اور انجن کی آواز میں ایک بیّن فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح گھنٹہ کی آواز اور گھڑی کی آواز میں بھی ایک گونہ فرق ہے جب ایک ہی آن میں ہمیں ایسی دو آوازیں سُنائی دیتی ہیں تو ہم اُن دونوں کے درمیان اچھی طرح پر امتیاز کر سکتے ہیں۔ اس فرق کی بڑی بھاری وجہ صرف ہماری ذہنی طاقت ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی کہ ہر آواز کی شان اور ہر آواز کے حروف میں قیاس اور تلفّظ میں گونہ فرق ہوتا ہے۔ مثلاً بارش کی آواز اور ہوا کی آواز میں ایک بیّن فرق ہوگا اور جب ہوا اور بارش دونو ایک ہی سلسلہ میں چلیں گی تو وہ آواز اور ہی کچھ رنگ رکھے گی۔ اس حساب سے اس کائنات میں دو قسم کی آوازیں پائی جاتی ہیں:-

(الف) جانداروں کی آوازیں۔

(ب) بے جان اشیاء اور بے جان اجسام کی آوازیں۔

جانداروں کی آوازیں بھی دو قسم کی ہیں انسانی آوازیں اور حیوانی

آوازیں۔ دیگر جانداروں کی آوازیں بھی انسان کی طرح مُنہ ہی سے عموماً
نکلتی ہیں اور اسی طرح کم و بیش سُنائی دیتی ہیں جس طرح انسانی آوازیں
سُنائی دیتی ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دیگر حیوانی جانداروں کی آوازیں
کوئی مفہوم یا کوئی مطلب نہیں رکھتی ہیں اُن کا بھی کچھ نہ کچھ مفہوم اور مطلب
ہوتا ہے۔ لیکن ہم اُسے بآسانی سمجھ نہیں سکتے۔ جس طرح وہ بھی ہماری
گفتگو اور کلام کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں ہم بھی اُن کی بولیاں
سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن حیوانات اپنے اپنے گروہوں میں اپنی اپنی
بولیاں ہماری طرح ہی سمجھتے ہیں۔ دیکھو جب کسی ناگہانی خوف کے وقت
کونج یا کوّا بولتا اور کوں کوں کرتا ہے تو تمام دیگر کونجیں یا کوّے فوراً ہوشیار
اور خبردار ہو جاتے ہیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ وہ بھی ایک دوسرے
کی آوازیں اور بولیاں سمجھتے ہیں۔ اگر آوازیں کوئی مطلب اور معنی نہ رکھتیں
تو اُن کے سُننے سے دوسرے جانور خبردار نہ ہو جاتے۔ مُرغی اپنے بچّوں کو
بلانے کے وقت ایک خاص قسم کی آواز نکالتی ہے۔ گائے کا بچھڑا
بچھڑی ماں سے جب بچھڑ جاتی ہے تو اُس کے مُنہ سے جُدائی میں جو آواز
نکلتی ہے وہ کچھ اور ہی سماں رکھتی ہے جنگل میں اکیلی گائے جب بولتی
ہے تو اُس کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ چرواہے اس قسم کی آواز سے
فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی گائے آوارہ پھر رہی ہے۔ فاختہ کوئل کبھی کبھی
ایسی بولیاں بولتی ہے کہ سُننے والے بادنیٰ غور سمجھ جاتے ہیں کہ وہ خوشی
سے بول رہی ہے یا عالم اُداسی میں اکثر جانوروں کی خوشی کی آواز کچھ اور
سماں رکھتی ہے۔ اور ہراس و خوف کی کچھ اور۔ کونج جب اپنی ڈار سے
بچھڑ جاتی ہے تو مُدر بلندی پر جا کر اُس کا بولنا کچھ اور ہی سماں رکھتا ہے
اُس کی اُداس آواز سے لوگ فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ اپنی ڈار سے بچھڑ کر بول

رہی ہے۔ بلبل خزاں کے دنوں میں جس رنگ اور جس لے میں بولتی چہچہے کرتی ہے وہ کچھ اور ہی ڈھن ہوتی ہے۔ اس قسم کی تمام حالتوں اور کیفیات سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جانوروں کی آوازیں کوئی نہ کوئی مفہوم اور مطلب رکھتی ہیں اور جس طرح انسان اپنی آوازوں سے کوئی نہ کوئی مدّعا مُراد لیتے ہیں اس طرح ان کی آوازوں کا بھی کوئی نہ کوئی مدّعا اور مفہوم ہوتا ہے ؛

جانوروں کی آوازیں بھی حروف اور الفاظ سے مرکّب ہوتی ہیں کوئی سے جانور لے لو اس کی آواز حروف اور الفاظ کا مجموعہ ہوگی۔ بکری کی آواز (میں میں) گویا مَ - یَ - نَ سے مرکّب ہے۔ کوّے کی آواز۔ کوں۔ کوں۔ یا کاں کاں۔ حروف (کَ - وَ - نَ یا کَ - ا - نَ) سے مرکّب ہے۔ جس وقت کوئی جانور بول رہا ہو ذرا غور سے اُسکی آواز سنو تو تمہیں معلوم ہو جاسے گا کہ وہ کن کن حروف سے مرکّب ہے۔ سفید تیتر کی آواز سے لوگ مختلف فقرے نکالتے ہیں مثلاً۔ سُبحان تیری قدرت۔ اور یہ استدلال اور قیاس تیتر کی بولی سے بہت کچھ مناسبت اور مشابہت بھی رکھتا ہے۔ نہ صرف جانوروں کی آوازیں ہی بلکہ اُن اشیاء اور اجسام کی آوازیں بھی جو تصادم اور تضارب سے نکلتی اور خارج ہوتی ہیں حروف اور الفاظ سے ترکیب یافتہ ہیں مثلاً جب ایک لکڑی دوسری لکڑی پر ماری جاتی ہے تو اُس وقت جو آواز نکلتی ہے وہ کسی نہ کسی حرفی اور لفظی ترکیب کے تابع ہوتی ہے مثلاً لکڑی کی کھٹ کھٹ تین حروف کَ - ھ - ٹ سے مرکّب ہے انجن کی آواز بھپ بھپ بھی بَ - ھ - پ سے مؤلف ہے۔ ہر ایسی آواز جو بے جان شئے سے نکلتی ہے حروف اور

الفاظ سے مرکّب ہوگی۔ جو آوازیں مُنہ سے یا کسی دوسری طرح کے تصادم
یا تضارب سے نکلتی ہیں اُن میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہوتی جو
حروف اور الفاظ نہ رکھتی ہو۔ شاید یہ کہا جائے کہ چونکہ انسان خود
حروف اور الفاظ سے آشنا ہے اور خود اُسی کی یہ ایجاد ہیں اس
واسطے وہ سب آوازوں کو حروف اور الفاظ سے مرکّب قرار دینے
اور اپنے رنگ میں تاویل کرنے کا عادی ہے۔ یہ بالکل درست اور
صحیح ہے۔ لیکن جبکہ انسانی پیمانہ ہی کے مطابق دوسری آوازیں بھی نکلتی ہیں
تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اُنہیں انسانی آوازوں کی طرح حروف اور الفاظ سے
مرکّب نہ تسلیم کیا جائے ایسا سمجھنے میں انسان کی غلطی نہیں ہے اگر خود
حیوانات اور دوسری بے جان اشیاء بھی قاعدہ ابجدی اور حروف و
الفاظ سے واقف ہوتے تو وہ خود بھی ایسا ہی قرار دیتے حروف اور
الفاظ چاہے بامعنی ہوں اور چاہے بے معنی ہر آواز کے ساتھ ایک غیر
منفک نسبت رکھتے ہیں اگر انسان اپنے تجربہ اور مذاق کے مطابق
اُن کی تفسیر اور تاویل نہ بھی کرے تب بھی وہی نتیجہ نکلے گا وجہ یہ کہ
ابجد اور حروف و الفاظ و اسماء طبعی ایجادات یا طبعی ذخیرہ ہیں۔ بچّہ
کی آوازوں سے ہمیں یہ استدلال کرنا چاہیئے اور اسی طرح جانوروں
اور دیگر بے جان اشیاء کی آوازوں سے بھی ابجد کا انسان موجد
نہیں ہے۔ بلکہ خود قدرت۔ البتہ انسانوں نے مختلف صورتوں
میں اُن کی تاویل اور تعبیر کی ہے اگر ایسی تاویل اور تعبیر نہ بھی
کی جاتی پھر بھی نتیجہ یہی نکلتا ؎

ایجاد حروف اور مفہوم صوت

اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ حروف کا مخزن اور مصدر قدرتی ہے قدرت ہی ان کی موجد اور خالق ہے اور قدرت ہی نے ہر شئے کی آوازوں میں انہیں ودیعت کر رکھا ہے چاہے انسان ہو اور چاہے حیوان۔ چاہے درندہ ہو اور چاہے پرندہ۔ چاہے نباتات اور چاہے جمادات سب کی آوازیں حروف کی تابع اور الفاظ کے ماتحت ہی سرزد ہوتی ہیں۔ جب انسان نے خود اپنے منہ سے اور نیز دوسروں سے مختلف قسم کی آوازیں سنیں تو اُس کو ان کی تخصیص کی ضرورت پڑی مثلاً جب اُس نے آں۔ اُوں۔ اوہ۔ ہا۔ ہیں۔ شاں۔ شُوں الفاظ وغیرہ وغیرہ منہ سے نکلے اور اپنے اردگرد سے کھٹ کھٹ ٹک ٹک بھپ بھپ ففٖ ففٖ کی مختلف آوازیں سنیں تو۔ اپنی ضرورت اور احساس کے مطابق اُن کی تعبیر اور تاویل کی مثلاً آں۔ اُوں۔ ہا۔ ہیں اور ہہ پھر اُس نے نظر کی تو ان میں مختلف سُریں پائیں اُن مختلف سُروں کے مطابق اُن کی جب تاویل کی گئی تو حروف ا۔ ن۔ و۔ ہ۔ اور ی تلفّظ میں آئے رفتہ رفتہ عملی رنگ میں ان باتوں سے انسان اور بھی وضاحت سے آشنا ہوتا گیا کوئی حروف ان میں سے شفتی نکلا اور کوئی حلقی کوئی سنی۔ کوئی لسانی کوئی کامی۔ اور کوئی وسطی کے نام سے موسوم ہوا جب مدّتوں تک یہ بولے جاتے رہے تو پھر رفتہ رفتہ ان کی مزید تکمیل کی بہ رنگ ارتقا کی نوبت آتی گئی اپنے اپنے مذاق اور خیال کے مطابق مختلف قوموں اور مختلف ملکوں میں ان کے دائرے اور حدود چھوٹائی

بڑائی۔ باریکی اور موٹائی تحریری اشکال میں منتقل ہوتے ہوتے ابجد کی بنیاد
پڑتی گئی۔ اصل ان کی ہر ایک صورت میں وہی طبعی انساد تھی انہی کے نقش
صراحت پران کا تلفظ اور ان کی اشکال تسلیم کی گئیں۔ غور کرنے سے یہ
بھی معلوم ہوجائے گا کہ اشکال حروف ایک باریک نسبت "تلفظ
حروف سے رکھتے ہیں دیکھو شین۔ عین۔ دال۔ صاد اور ے
کا تلفظ باعتبار کششوں اور دایروں کے ایک بڑی حد تک ملتا جلتا ہے

مفہوم صوت اور اقسام صوت

صوت یا آوازیں دو قسم کے مفہوم رکھتی ہیں:۔

(۱) مفہوم طبعی۔

(۲) مفہوم وضعی۔

انسانوں نے باہمی سمجھوتہ یا باہمی معاملات کے ذریعہ سے آوازوں
کے جو مفہوم مقرر اور وضع کر رکھے ہیں۔ وہ الفاظ ہی کے بولنے سے
سمجھے جا سکتے ہیں۔ لیکن آواز یا صوت کی طبعی شدت نسبت اور طرز
وغیرہ سے بھی سننے والے کسی نہ کسی مفہوم پر پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً
سخت آواز یا بار بار آواز سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ کوئی ضروری کام یا کوئی
ضروری بات ہے۔ نرم آواز سے ویسا خیال نہیں کیا جاتا ؛

جسقدر آوازیں ہمارے کانوں میں پہنچتی ہیں ان کی تین اقسام ہیں:

(۱) مختلف التاثیرات۔

جیسے آواز خوش آیند۔ سمع خراش۔ کرخت۔ بلند آواز وغیرہ
وغیرہ ؛

(۲) متوحد التاثیرات۔

جیسے راگ اور نغمہ وغیرہ وغیرہ۔

(۳) اصوات عامہ

عام طور پر جو انسان یا کسی دوسری ہستی سے اپنے رنگ میں سُنی جاتی ہیں۔

آوازوں کی دو اور قسمیں بھی ہیں۔

بسیطہ

مرکّبہ

بسیطہ آوازوں کی تعداد بعض لوگوں یا محققوں نے بیس ہزار تک کہی ہے لیکن یہ ایک مبالغہ ہے اور اس کا ثبوت کوئی نہیں ہے۔ بسیطہ آوازیں وہ ہیں جو مرکّب نہ ہوں لیکن انہیں صرف اس جہت سے بسیط کہا جاتا ہے کہ اُن میں بظاہر کوئی ترکیب نہیں پائی جاتی ورنہ دراصل وہ بھی مرکّب من الحروف ہیں دنیا میں کوئی ایسی آواز نہیں جو مرکّب نہ ہو انسانی آواز ہو خواہ حیوانی اور خواہ کسی تصادم تضارب اور تقارب سے نکلی ہو مرکّب ہی ہوگی۔

جدید حروف

جدید الفاظ تو ہمیشہ بنتے رہتے ہیں۔ اور ہر زبان والے ضروریات تمدّن۔ تجارت اقتصادیات وغیرہ کے پیش آنے پر اس میں ترقی کرتے رہتے ہیں اور اسی طرح لگاتار رفتہ رفتہ یہ ترقی اور یہ اضافہ ہوتا رہے گا لیکن جدید حروف اب نہیں بنائے جاتے اور نہ بنا سکتے ہیں کیونکہ

حروف کا مدار انسان اور دیگر حیوانات اور اشیاء کی آوازوں اور تصرّفات کامی اور تصادم و تضارب پر ہے یہ سب صورتیں اپنی اپنی حدود میں محدود ہیں اور ان پر مختلف رنگوں میں تصرّف ہو چکا ہے ان آوازوں اور ان تصرفات کی با دنیٰ تغیر ساری دنیا میں ایک ہی صورت اور ایک ہی طرز پا یا جاتا ہے کہیں کہیں جو معمولی فرق طرز طلاقت کشش خفت اور ٹون میں پا یا جاتا ہے تو وہ ایک طلاقتی فرق ہے جیسے چینی اور سنسکرت زبان میں برخلاف بعض دیگر زبانوں کے حروف کے طلاقت میں حلق. زبان اور کام سے ایک باریک بینی سے کام لیا جاتا ہے اور اسی فرق کی وجہ سے ان زبانوں کی ابجدیں کثیر الحروف ہیں مثلاً کوئی قوم حرف (گ) بول سکتی ہے اور کوئی نہیں بول سکتی۔ کوئی (ٹ) کا تلفظ ایک صحت کے ساتھ کرتی ہے اور کسی پر (ٹ) کا بولنا متعذر رہوتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ قدرت نے جو ابجد بتادی ہے اور جو ساری دنیا کی زبانوں ہیں قریباً ایک ہی رنگ اور ایک ہی کیفیت رکھتی ہے وہی ابجد ہیر پھیر سے مختلف زبانوں میں مقدّم رکھی گئی ہے نہ اُس میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ بیشی۔ اور نہ کمی ؞

شروع میں کیا تھا؟

(۳۔ جون سنہ ۱۹۱۶ء)

شروع میں کیا یا کون سی زبان تھی؟

اور شروع میں انسان اپنے کام کاج کیسے سر انجام دیتا تھا؟

یہ دو امر ہیں جو زبان کی بحث میں ایک دلچسپی رکھتے ہیں۔ انسان کے

ہاتھ میں کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے جس سے ان دونوں سوالوں کی نسبت قطعی رائے دی جا سکے۔

اس بارہ میں بعض
روایات مذہبی
بعض روایات اجتہادی
بعض روایات قیاسی
بیان کی جاتی ہیں۔

ان روایات میں کُلّی اتفاق نہیں پایا جاتا مذہبی روایات قابل تعظیم ہیں۔ لیکن ہم اس موقعہ پر صرف روایات قیاسی ہی سے استدلال کرتے ہیں۔ اور اس قیاس کی بنیاد اُس قیاس پر ہوگی جو اس وقت بھی انسانی طرزِ عمل کے متعلق کیا جانا یا کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ قدرت کی جانب ہی سے انسان کی فطرت میں اسماء اور الفاظ کا ذخیرہ ودیعت کیا جا چکا ہے اور انسان پیدا ہوتے ہی اپنے مُنہ اور اپنی زبان سے مختلف اسماء اور مختلف الفاظ نکالنے لگ جاتا ہے۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اس سے کام لیتا اور مشق کرتا ہے گو کہ ہم ایسے الفاظ ابتدائی کو جو بچہ کے مُنہ سے نکلتے ہیں مبہم ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن با ایں ہمہ ایسے کلمات اور الفاظ۔ کلمات اور الفاظ ہی ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ جب ایک بچہ اپنے مُنہ اور اپنی زبان سے بعض الفاظ نکال کر بھی (گو کہ وہ ثرولیدہ اور ٹوٹے پھوٹے ہی ہوتے ہیں) اپنے مطلب کی وضاحت میں کامیاب نہیں ہوتا اور اخیر پر اشاروں اور کنایوں سے کام لیتا ہے پھر بھی ایسے الفاظ سلک الفاظ میں سے خارج نہیں سمجھے جاتے۔ صرف اشاروں کنایوں ہی سے کام نہیں لینا

اُن کے ساتھ ایک قسم کی غوں غاں بھی ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ شروع میں حرف اشاروں اور کنایوں ہی سے کام لیا جاتا ہے صحیح نہیں اُن کے ساتھ الفاظ بھی ایک حد تک بعض اوقات رٹے جاتے ہیں شروع شروع میں انسان کی بھی بچّہ کی سی حالت ہی تھی گو کہ اسپر کوئی انسانی تاریخ روشنی نہیں ڈالتی مگر کوئی تاریخ یہ بھی نہیں کہتی کہ ایسا نہیں تھا ہمارے سامنے موجودہ نوخیز بچّوں کی زندگیاں اس قیاس کا بوجھ احسن ثبوت دے رہی ہیں کوئی قیاس اس کے مخالف نہیں جاتا اور نہ کوئی تاریخ اس کے خلاف سوال اُٹھاتی ہے اور نہ کوئی مزید مصالحہ پیش کرتی ہے اس مرحلہ پر پہنچ کر مختلف صورتیں پیش آجاتی ہیں۔

(الف) شروع میں انسان بچّہ کی سی حالت رکھتا تھا یا کچھ اور؟

(ب) اُس کی فطرت میں کیا کچھ ودیعت تھا؟

پہلے امر کے جواب میں باعتبار موجودہ خیالات یا کیفیات مختلف صورتیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ اور ایسی صورتیں تین پہلو رکھتی ہیں:۔

(۱) مذہبی۔

(۲) فلسفی

(۳) روایتی

مذہبی پہلو میں بھی گونہ اختلاف ہے اکثر مذاہب کا (یہود، نصاریٰ اسلام) یہ اعتقاد ہے کہ شروع انسان کا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا یا یہ کہ موجودہ انسانوں کا شروع حضرت آدم صفی اللہ سے ہوا ہے۔ اور ہنود کا یہ عقیدہ ہے کہ جیسے خدا اَنادی ہے ایسے ہی انسان بھی اَنادی اور قدیم ہے اس عقیدہ کے رو سے یہ بحث ضروری نہیں کہ انسان نے کس طرح بولنا شروع کیا یا زبانوں کا شروع کیسے ہوا گو یا یہ کہنا پڑے گا کہ وہ شروع

ہی سے اسی طرح بولتا آیا ہے اور کوئی ایسی تاریخ نہیں ہے جس سے کوئی فیصلہ کُن بات نکل سکے جس طرح خدا قدیم سے ہے اسی طرح انسانی زبانیں بھی قدیم سے ہیں۔

دوسرے مذاہب کے اعتبار سے اگر موجودہ دَور انسانی کسی خاص بشر سے شروع ہوا ہے تو یہ دُو حال سے خالی نہ ہوگا۔

(الف) بہ سلسلہ تولید و تناسل۔

(ب) بذریعہ کسی دیگر صورت کے۔

ان دونو صورتوں میں انسان کا ایک ایسا ابتدائی زمانہ بھی ہوگا جس میں وہ کسی زبان پر بھی حاوی نہ ہوگا اُس حالت میں اُس کا شروع سِلسلہ گفتگو اشارات کنایات اور اضطرابی تلفظ ہی ہونا چاہیئے کیونکہ بچپن میں آواز کا نکالنا بھی کبھی کبھی ہوتا ہے اور آواز کوئی نہ کوئی تلفظ بھی رکھتی ہے فلسفہ کے پہلو سے بھی انسان کا جو زمانہ ابتدائی ہوگا اُس میں بھی دُو ہی طرح کی حالت ہوگی یا تو وہ بالکل بچّہ کی مانند شروع رکھتا ہوگا اور یا ایک منضبط اور مکمّل بول چال۔

یہ دوسری حالت نہیں ہو سکتی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسی شئے دکھائی نہیں دیتی۔ جہاں تک کہ ہمارے حیطۂ ادراک میں آیا ہے اور خصوص جو کیفیت انسانی کائنات سے تعلق رکھتی ہے کوئی ایسی شئے نہیں جو شروع نہ رکھتی ہو ہر شئے کا سوائے خدا کے کوئی نہ کوئی شروع اور ابتدا بھی ہوتی ہے یا یہ کہ ہر مادی عنصر کوئی نہ کوئی شروع رکھتا ہے اس حالت میں بھی وہی حالت ہوگی جو ایک بچّہ کی ہوتی ہے اور اگر دوسری حالت ہوگی تو اُس کے واسطے بھی وہی مراحل ہیں جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

تیسری صورت روایتی ہے وہ بھی دونو پہلو لئے ہوئے ہے بعض اجزا میں مذاہب سے ٹکر کھاتی ہے اور بعض میں فلسفہ اور روایات سے ان تینوں حالتوں میں کسی نہ کسی شروع کا ہونا ضروری اور لازمی ہے اور شروع میں زبان کی کیفیت یا زبان کے عناصر اشارات کنایات اور اضطراری الفاظ ہی ہو سکتے ہیں ۔

یہ کہنا کہ کب تک ایسی ابتدائی حالت رہی اور کس زمانہ میں ترقی زبان کی بنیاد پڑی اس کے متعلق کسی تاریخ کے ماتحت بحث نہیں کی جا سکتی کیونکہ کوئی تاریخ اس کی ذمہ دار نہیں ہو سکتی البتہ قیاساً و اجتہاداً یہ کہا جائے گا کہ انسان کچھ زمانہ طے کرنے کے بعد اُن مراحل تک پہنچ گیا تھا جو ایک بڑی محدود حد و د میں مطلب براری کے واسطے کافی تھے ۔ اس بحث کی مزید وضاحت کے واسطے ہمیں بچوں کی حالت اور حرکات پر بالخصوص غور کرنے کی ضرورت ہے اگر اس وقت بھی ایک بچہ تنہائی کی حالت میں رکھ کر آزمایا جائے تو پتہ لگ جائے گا کہ

وہ جسمانی ترقی کے ساتھ ہی زبان کے عناصر میں بھی ترقی کرتا جاتا ہے اور دن بدن ایسے اشارات ۔ کنایات اور الفاظ کے نکالنے پر کامیاب ہوتا جاتا ہے جو اُس کی ننھی سی زندگی کے واسطے ضروری ہیں وہ رفتہ رفتہ اپنی طبیعت کے زور کے مطابق ایسے نشانات قائم کرتا جاتا ہے جو اُسے شناخت کا کام دے سکیں ۔

انسان کی یہ ایک طبعی عادت ہے کہ جو شئے یا جو سماں وہ دیکھتا ہے چاہتا ہے کہ اُسے کسی نہ کسی نام سے موسوم کرے یا کسی نہ کسی رنگ میں اُس کی تعبیر کی جائے ہر ایک زبان میں چند بعض اشیاء کے ایسے نام

بھی مل سکیں گے جو ایسے حالات میں رکھے جا چکے ہیں جبکہ انسان اُن کی کیفیت سے بالکل ناآشنا تھا۔ جب انسان نے اُنہیں پہلے پہل دیکھا اور اُن کی کوئی تعبیر نہ کر سکا تو اپنے اجتہاد کے مطابق اُن کا کچھ نہ کچھ نام رکھ دیا کسی کم عمر بچّہ کے سامنے چند اشیاء رکھ کر اُس سے پُوچھو کہ ان کا نام کیا ہے پہلے تو وہ گھبرائے گا لیکن رفتہ رفتہ وہ اپنی رسائی طبع کے موافق اُن کا کوئی نہ کوئی نام رکھ دے گا آسمان کا نام آسمان چرخ کا نام چرخ دور کا نام دور وغیرہ وغیرہ سب نام یا تو اضطراری ہیں اور یا نسبتی انسان نے خود اپنا نام جو مختلف زبانوں میں آدمی۔ انسان۔ منُش۔ رجل۔ اور مین وغیرہ رکھا ہے تحت علّم آدم الاسماء کلھا۔ یہ بھی سب اُسی کا اختراع ہے اور اگر ان باتوں پر غور کیا جائے تو پتہ لگ جائے گا کہ یہ سب نام نسبتی ہیں اسی طرح۔ محبّت۔ اُلفت۔ عشق وغیرہ نام بھی نسبتی اور تعبیری ہیں خوشی مسرت۔ غم و رنج بھی نسبتی نام ہیں ورنہ غم۔ رنج مسرت اور خوشی کے لفظوں سے اُس اندرونی حالت کا انکشاف نہیں ہو سکتا جو بعض وقت انسان کے دل و دماغ پر محیط ہوتی ہے ایک خاص زمانہ تک اضطراری الفاظ کی غیر مکمّل صورت رہی رفتہ رفتہ جب کثرت استعمال سے ایسے الفاظ رواج پاتے گئے اور اُن سے کام لیا جاتا رہا تو اُنہیں کا ایک مستقل ذخیرہ بنتا گیا اور آنے والی نسلوں نے بھی اُنہیں کام میں لانا اور اُن کا یاد رکھنا لازمی سمجھ لیا نہ صرف اُنہیں محفوظ ہی رکھا گیا بلکہ مابعد کی نسلوں نے اُن میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا اور رفتہ رفتہ اسماء سے افعال کی نوبت آئی اور افعال سے مشتقات اور صرف و نحو کے قواعد پر بھی غور ہونے لگا

جب مختلف نسلیں دیگر دور دراز اقطاع میں مارے روزی کے چلی گئیں تو نئے نئے اشیاء اور نئے نئے مناظر مشاہدہ میں آتے آتے اور بھی جدید الفاظ وضع یا داخل ہوتے گئے۔ مختلف اشیاء کے جو مختلف نام مختلف زبانوں میں رکھے گئے ہیں اُس کی یہ وجہ ہے کہ ایک تو مختلف زبانوں میں مختلف لوگوں نے اُن کی دریافت کی اور دوسرے یہ کہ مختلف مواقعہ کے ماتحت اُن کی تعبیر کی گئی۔ چونکہ تمام اشیاء اور تمام مناظر ایک ہی ملک اور ایک ہی خطہ میں نہیں پائے جاتے تھے اس واسطے اُنکی تعبیری صورت اور تعبیری زمانہ ایک ہی نہیں ہوسکتا جیسے جیسے لوگوں کو موقعہ ملتا گیا دریافت اور تعبیر عمل میں آتی رہی۔

جتنے ماکولات اور مشروبات اس وقت انسانی کائنات میں پائے جاتے ہیں اُن کی تعبیر اور دریافت کا زمانہ ایک ہی نہیں ہے اور نہ دریافت کنندگان ایک ہیں جیسے جیسے لوگوں کو اپنی ضروریات زندگی کے اعتبار سے ضرورت پڑتی گئی ویسے ویسے اُن کی دریافت اور اُن کی تعبیر بھی ہوتی گئی معلوم نہیں جو چیزیں اس وقت ہمارے استعمال میں آرہی ہیں یا جن جن واقعات اور مناظر سے ہمیں سابقہ پڑتا ہے اُن کی تعبیری یا اسمائی حالتیں کہاں تک ادل بدل ہو چکی ہیں اور انہوں نے کس قدر زمانوں کے بعد یہ شکل اختیار کی ہے جس پھل کا نام اس وقت آم اور انگور ہے معلوم نہیں انسان نے شروع شروع میں اُس کی دریافت کے بعد کن کن الفاظ میں اسکی تعبیر کی اور کیا کچھ اُن کے نام رکھے اور یہ کہ کیا دیکھنے کے ساتھ ہی ان ناموں سے انہیں موسوم اور تعبیر کیا گیا یا چکھنے اور کھانے کے بعد۔

انسانی نسلوں کے کنبے در کنبے اپنے پہلے وطنوں سے ضروریات زندگی

کی وجہ سے نکل نکل دوسرے اقطاع عالم میں منتقل ہوتے گئے ساتھ ہی معلومات زبان کا بھی ذخیرہ لے گئے جو اُس وقت اُن کنبوں میں معمول تھا اور جب اُنہیں جدید اقطاع جدید کائنات اور جدید کیفیات سے سابقہ پڑا تو اُنہوں نے بھی جدید تعبیرات کے نیچے اُس ذخیرہ سابقہ میں کچھ نہ کچھ اضافہ کیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ ایسے سرمایہ یا ایسے ذخیرہ کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی اور بجائے ایک زبان کے مختلف زبانیں بولی جانے لگیں دنیا میں پھر کر دیکھو کہ مختلف زبانیں اقطاع دنیا میں کس نمط سے بولی جاتی ہیں اور ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان کے الفاظ سے کیا کچھ نسبت اور تعلق ہے جیسے انسانی اشکال ایک بڑی حد تک آپس میں ملتی جلتی ہیں ایسے ہی باوجود اختلافات کے زبانیں بھی ملتی جلتی ہیں۔ ایشیا اور یورپ کے مختلف حصّوں میں پھر کر معلوم کر سکتے ہو کہ اگر ایک طرف زبانوں میں اختلاف ہے تو دوسری طرف کچھ کچھ الحاق بھی پایا جاتا ہے۔ اگر دنیا کی ساری زبانوں یا ایک براعظم کی السنہ پر ایک ریویو کیا جائے تو کھل جائے گا کہ اگر ایک طرف زبانوں کے الفاظ اور معانی میں ایک معتدبہ فرق ہے تو دوسری طرف مشتقات اور دیگر خصوصیتوں کی وجہ سے بعض الفاظ میں ایک نسبت بھی پائی جاتی ہے ٭

زبان اور لباس کی بحث بعض رموز اور بعض خصوصیات اور امتیازات کی جہت سے ایک ہی نقطہ خیال کے ماتحت آ سکتی ہے جیسے دنیا بھر کے لباسوں میں ایک قسم کی نسبت اور اختلاف پایا جاتا ہے اور سب لباسوں کا شروع بھی غالباً ایک ہی طرز پر ہو کر پھر اُن میں بلحاظ ضروریات اور جداگانہ مذاقوں کے فرق ہوتا گیا ایسے ہی زبانوں کی

بھی کیفیت ہے جس طرح لباس شروع شروع میں لنگوٹی سے شروع ہوا ہے۔ اسی طرح زبان یا زبانیں بھی ایک اضطراری صورت میں شروع ہوئی ہیں اُن کی ابتداء بھی چند الفاظ ہی سے وجود پذیر ہوئی۔ ہے جس طرح لباس میں مختلف اختراعات اور کتربیونت ہو کر رفتہ رفتہ تفریق اور ترقی ہوتی گئی اسی طرح زبانوں میں بھی ترقی اور اختلاف ہوتا گیا یہاں تک کہ بظاہر اُن میں کوئی نسبت ہی نہیں پائی جاتی دو مختلف زبانیں بولنے والے جو ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھتے ہوں گویا بالمقابل دو گونگے اور بہرے ہیں ۔

شروع کے بعد کیا تھا

اگر ہم یہ مان لیں کہ شروع شروع میں انسان اشارات یا مختص الفاظ سے ہی کام چلاتا تھا تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ اُس کے بعد زبانیں یکدفعہ ہی بنی شروع ہوگئیں یا اوّل اوّل صرف ایک ہی زبان تھی ہماری ناقص رائے میں شروع میں صرف ایک ہی زبان تھی جو یا تو اب دنیا سے مفقود ہے اور یا کسی رنگ میں موجود ہے اگرچہ اُس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہو گیا ہو اب یہ قرار دینا کہ وہ کونسی زبان تھی یا کونسی ہے ایک مشکل امر ہے ۔

آپس میں زبانوں کا مقابلہ کر کے دیکھ سکتے ہو کہ اس وقت دنیا میں وہ کونسی زبان ہے جس میں تمام انسانی تعلقات احتیاجات تکلمات مفردات اور مرکبات کی صورتیں پائی جاتی ہیں منجملہ پرانی زبانوں کے سنسکرت عربی یونانی لاطینی وغیرہ میں سے کوئی ایک زبان ہی فخر پا سکتی

ہے نسلی تفریقات کی وجہ سے اس سوال پر چنداں روشنی نہیں پڑتی کیونکہ جب ایک نسل اپنی قدامت اپنی تہذیب کی بحث میں جا پڑتی ہے تو دوسری نسل کی زبان اُس کے نقطۂ نگاہ سے اُتر جاتی ہے۔ لیکن یہ خیال نقطۂ قدامت اور نقطۂ تہذیب کے رہین نہیں ہے اگر کسی زبان میں بھی یہ باتیں پائی جاتی ہیں جو مورخانہ پہلو سے ایک قدیم قوم کی زبان ہی ہے، اور اب تک زندہ ہے تو دوسری صورت میں بھی اُسکی وسعت اور اُس کا لوہا ماننا پڑیگا اگر ایک دوکان اور ایک کارخانہ باوجود ایک بیابان اور جنگل میں ہونے کے بھی ہمارے مایحتاج کا کفیل ہوسکتا ہے اور ہمیں باہر کی دست بُرد سے فارغ کر دیتا ہے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہی کارخانہ ہمارے واسطے ایک جامعیت اور ایک وسعت رکھتا ہے اور وہی ایک صادق کفیل ہوسکتا ہے اور اُسی کے حصّہ بخرہ میں قدرت کے فیضان اور ملکہ تکوین میں سے ایک بڑی مقدار آئی ہے اور وہی کارخانہ یا وہی زبان ایک ابتدائی زبان اور مخرج کل دیگر زبانوں کا ہے چونکہ اس بحث اور اس تنقید اور تخصیص کے واسطے ایک بڑے مصالحہ کی ضرورت ہے اس واسطے ہم بخوف طوالت اسے یہیں چھوڑتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ کوئی اور کامل مبصر اس پر روشنی ڈالے لیکن بہرحال یہ پہلو مدِّ نظر رہنا لازمی ہے کہ جب بموجب ہمارے خیال کے کُل انسانی نسلوں کا ایک مشترک مورث ہے تو زبان بھی مشترک ہوگئی گو وہ بعد چندے یا تو دوسری زبانوں میں حسب حصّہ رسد تقسیم ہوگئی ہو اور یا باقی نہ رہی ہو اور کسی رنگ میں یا اب تک زندہ ہے جس طرح اسلاف اور بانیان زبان گذر گئے اسی طرح شائد وہ پہلی اور موروثی زبان بھی باقی نہ رہی ہو اور جس کے خال خال نشانات دوسری زبانوں میں اب تک اپنے اپنے رنگ میں پائے جاتے

اور نمایاں ہیں اور جس کی ابتدائی یا مقدس ہستی سے ہم انکار نہیں کر سکتے یہ چند اشارات ہیں جن پر وسیع النظر لوگ اور بھی زیادہ تر خوبی سے سوچ سکتے ہیں ؏

شروع کے الفاظ اور ترکیب الفاظ

ہمیں بچّوں کی ابتدائی گفتگو یہ یقین دلاتی ہے کہ شروع میں پہلے انسان یا پہلے انسانوں کی زبان اور تراکیب لفظی بہت ہی سادہ ہونگی۔ اُن کی زبان سے جو لفظ رہ رہ کر نکلتا ہو گا وہ بالکل سادہ اور کم حروف کا ہو گا وہ مشکلات اور وہ پیچدار تراکیب جو بعد میں زبانوں کے اندر رفتہ رفتہ پیدا ہوتی گئی ہیں اُن کا اُس وقت نام و نشان بھی نہ ہوگا دیکھو شروع شروع میں ہمارے بچّے کس خوبصورتی اور کس سادگی اور کس اختصار سے باتیں کرتے ہیں چھوٹے چھوٹے لفظ چھوٹے چھوٹے جملے آسان ترکیبیں سہل تاویلات فرحت انگیز تعبیرات اور دلاویز سوالات سننے والوں کے دل و دماغ پر فوراً اثر پذیر ہوتے ہیں۔ یہی موروثی اثر ہے جو اب تک ہر ایک بشر سادگی اور اختصار و سہل ترکیب پسند کرتا ہے سب سے ابتدائی زبان کی بڑی بھاری نشانی یہ بھی ہے کہ اُس کی ترکیبیں آسان ہوں دو حرفی۔ سہ حرفی و چہار حرفی پنج حرفی اور شش حرفی الفاظ تک مطلب آجائے اور لفظ ختم ہو جائے چونکہ انسان اسی روش کو فطرتاً بھی پسند کرتا ہے اسواسطے وہی زبان ایک موروثی اور جدی زبان ہو سکتی ہے جو ایسی تراکیب رکھتی ہو اور ضروری ہے کہ ایسی زبان کے الفاظ کا کثیر حصّہ لفظی مفردات رکھتا ہو جو ڑ میل کرکے کوئی لفظ نہ بنایا گیا ہو جیسے کہ

عربی اور سنسکرت زبان میں یہ ایک خصوصیت ہے کہ ان میں مقابلتاً مفردات
بہت ہیں اگرچہ عربوں کی تہذیب اور تمدن ہمیشہ محدود رہا اور اسلام کے
بعد ان کی آمد و رفت دوسری قوموں اور دوسرے ملکوں میں شروع
ہوئی مگر اس کی ڈکشنری میں ہر ایک چیز اور ہر ایک چیز کے مختلف حصوں
اور مختلف صور اور کیفیات کے واسطے اسقدر الفاظ جداگانہ پائے
جاتے ہیں کہ جنہیں سنکر طبیعت متاثر ہوتی ہے بالخصوص مظاہر
قدرت اور انسانی رگ و ریشہ اور کیفیات اندرونی اور بیرونی کے
واسطے اسقدر جداگانہ الفاظ ہیں کہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سچ مچ اس زبان
والوں کو الہامی رنگ میں الفاظ کی ڈکشنری حفظ کرائی گئی ہے میری
رائے میں ہم اس جامع اور ذخیرہ الفاظ سے یہ استدلال کرسکتے ہیں
کہ عربوں کا ملکہ تکوینی ایک خصوصیت رکھتا ہے اور اس کی مدد سے عربوں
نے وسعت زبان میں بہت کچھ کرکے دکھایا ہے۔ مثلاً صرف
ایک لفظ ید کے عربی میں ۰ ۱۵ معنی ہیں اور اس پر ہی بس نہیں ہاتھ
کے ہر ایک حصہ کے واسطے جداگانہ الفاظ ہیں مثلاً انگوٹھا۔ ابہام۔ انگوٹھہ
کے بعد کی انگلی سبابہ تیسری انگلی وسطی۔ چوتھی انگلی بنصر اور پانچویں
خنصر۔

اسی طرح ہر چیز کے مختلف معانی اور مختلف صورتوں اور حالتوں کے
معانی مقرر کرنے میں عربوں نے اپنے ملکہ وہبی اور قوت تکوینی کے
تحت ایک اعجاز دکھایا ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ اور زبانوں میں ایسی
جداگانہ تفصیلات نہیں پائی جاتیں مگر ہمارا مبلغ علم یہ ہے کہ عربی میں ایسی
تفصیلات ایک خصوصیت سے پائی جاتی ہیں اور زبان عرب کو اپنی اس
وسعت اور جامعیت پر بجا فخر ہے۔

اشارات و کنایات سے ترتیب الفاظ

شروع شروع میں انسان بااثنائے کلام اور تلفظات جسقدر اشارات اور کنایات سے کام لیتا رہا ہے اُن کا کوئی نہ کوئی مفہوم ہوتا تھا کسی نہ کسی مفہوم کے ماتحت اُن کا اطلاق کیا جاتا تھا اور اب بھی بعض اشاروں اور کنایوں سے ضرورت پر کام لیا جاتا ہے بلکہ اشارات اور کنایات کے ماتحت ہی بعض ایسے عملیات کی بھی بنیاد پڑ گئی ہے جنہیں اب علمی رنگ میں ایک حکمت اور سائنس سمجھا جاتا ہے ایسے اشارات شروع شروع میں مندرجہ ذیل صورتیں رکھتے ہونگے :-

(الف) اثباتیہ۔

(ب) نافیہ۔

(ج) رضاعیہ۔

(د) مکروہیہ۔

(ہ) استہزاجیہ۔

(و) تنبیہیہ۔

(ز) استرضائیہ۔

(ح) نفرتیہ۔

ان استقرائی صورتوں کی تفصیل یا تعبیر علمی رنگ میں حسب ذیل ہو سکتی ہے :-

(ا) جب سر سامنے سے بار بار ہلایا جائے تو اُس سے مطلب تسلیم یا اثبات ہوتا ہے ؛

(۲) جب سر کو دَوری حرکت دی جائے تو اُس سے نفی اور انکار
مراد ہوتا ہے ؞

(۳) جب سر اوپر کیا جائے تو اُس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ ایسا کرنیوالا
کچھ سوچ رہا ہے ؞

(۴) جب سر جھکایا جائے تو اُس سے تسلیم یا تفکّر مراد ہوتا ہے ؞

(۵) جب ہاتھ کو دَوری حرکت دی جائے تو اُس سے بھی نفی مراد ہوتی ہے ؞

(۶) جب ہاتھ کو تحتی حرکت دی جائے تو اُس سے بھی اثبات مراد ہوتا ہے ؞

(۷) جب چھاتی پر ہاتھ رکھا جائے تو اُس سے تسلیم یا ایک قسم کا وعدہ
مراد ہوتا ہے ؞

(۸) جب آنکھ کو مخروطی حرکت دی جائے تو اُس سے مراد ایک قسم کی
تحریک ہوتی ہے ؞

(۹) جب آسمان کی طرف نگاہ کی جائے تو اُس سے مراد حیرت - دادخواہی
اور فریاد ہوتی ہے ؞

(۱۰) جب ہتھیلی پر پھونک ماری جائے تو اُس سے مراد اکراہ - ازالہ -
اور نفرت ہوتی ہے ؞

(۱۱) جب مُکّا دکھایا جائے تو اُس مراد تنبیہ ہوتی ہے یا مقابلہ ؞

(۱۲) آنکھوں اور سر پر ہاتھ رکھنے سے تسلیم مراد ہوتی ہے ؞

(۱۳) جب ایک ہاتھ ہلا ہلا اشارہ کیا جائے تو کوئی بات پوچھی جاتی ہے
یا کسی کا خیر مقدم کیا جاتا ہے ؞

(۱۴) ہاتھ میں ہاتھ دینے سے رفاقت مراد ہے ؞

(۱۵) سلام کرنے سے مراد تعظیم ہے ؞

(۱۶) ہاتھ اُٹھانے سے بعض وقت تائید مراد ہوتی ہے ؞

(۱۷) کانوں پر ہاتھ رکھنے سے مراد انکار ہوتا ہے ۔

اشارات کے متعلق بہت سے قواعد بھی بن چکے ہیں۔ جیسے کہ ووٹ دینے کے وقت کیا جاتا ہے۔ ہاتھ اُٹھاؤ کس کے حق میں ووٹ دیتے ہو اُس طرف، ووٹ کتنے اور اُس طرف ؟

انگلی سے اُٹھا دینے سے کبھی ایک اور کبھی کبھی انکار مراد ہوتا ہے

کانوں پر ہاتھ رکھنے سے انکار مراد ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔

"وہ تو کانوں پہ ہاتھ رکھتا ہے۔

"زبان دانتوں میں دبانے سے غصّہ۔ نفرت انکار اور حیرت کا احساس ہوتا ہے چنانچہ کہا جاتا ہے۔ اُس نے زبان کاٹ کر کہا ہے

دانت پیسنے سے بھی غصہ اور نفرت مراد ہوتی ہے چنانچہ کہا جاتا

کیوں دانت پیستے ہو۔

سر ماتھے اور آنکھوں پر ہاتھ رکھنے سے تسلیم اور اقرار مراد ہوتا ہے

جیسے کہ :- سر آنکھوں پر - سر ماتھے پر۔

سر کے جھکانے سے اتباع اور تسلیم مراد ہوتی ہے۔

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے ۔

سر پھیرنے سے انکار مراد ہے ۔ وہ تو سر پھیرتا ہے ۔

سر پہ ہاتھ رکھنا ذمہ واری - اور مروت اور انکار مفہوم رکھتا ہے،

کسی کا سر پر ہاتھ نہیں ۔

وہ تو سر پر ہاتھ رکھتا ہے ۔

ہاتھ اور بانہہ پکڑنے سے مراد اقرار اور وفا ہے۔

ہاتھ پکڑنے کی لاج ۔

بانہہ پکڑی کی لاج ۔

ہاتھ پر ہاتھ رکھنے سے مراد بیکاری ہوتی ہے۔
وہ تو آجکل ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہے۔
ہاتھ دبانے سے مراد تنبیہ اور زور دینا ہے۔
اُس نے میرا ہاتھ دبایا۔
ہاتھ کا انگوٹھا دکھانے سے مراد سخت انکار ہے۔
وہ تو ٹیٹ دکھاتا ہے۔
ہاتھ میں ہاتھ دینے سے مراد یارانہ اور دوستی ہے۔
چنانچہ کہا جاتا ہے:۔
اب تو ہاتھ میں ہاتھ دیئے پھرتے ہیں۔
پاؤں پر ہاتھ رکھنا خوشامد اور لجاجت کرنا ہے۔ وہ پاؤں پر ہاتھ رکھتا ہے۔
ہاتھ پر ہاتھ مارنے سے مراد تنبیہ یا اقرار اور وعدہ مراد ہوتا ہے۔
جیسے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔
ہاتھ دے کر ملوں گا سے مراد انتقام ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے:۔
تمہیں میں ہاتھ دیکر ملوں گا۔
ہاتھ کا بڑا سُچا ہے۔ یعنی ہاتھ کے کام میں کامل اور عمدہ ہے۔
ہاتھ پر ہاتھ مارنے سے مراد فریب کے ہیں۔
ہاتھ پر ہاتھ مار کر لے گیا۔ ہاتھ پکڑنا ذمہ داری لینا۔
ہاتھ چومنا محبت و خوشامد و عزت۔ یعنی وہ تو اب ہاتھ چومتا ہے۔
ہاتھ جوڑنا ہاتھ چھاتی پر رکھنا۔ تعظیم اور منت سے مراد ہے۔ ایسی ہی پاؤں پڑنا۔
دانت دکھانے سے مراد نفرت ہے۔ وہ تو دانت دکھاتا ہے۔
دانت دکھانے کے اور کھانے کے اور۔

دانت چڑانے سے مراد نفرت اور ضد ہے۔ وہ تو دانت چڑاتا ہے۔
دانت کاٹی روٹی سے مراد محبت اور اتفاق ہے جیسے آجکل نواں کی دانت کاٹی روٹی ہے۔
دانتوں میں زبان دبانے سے مراد حوصلہ اور صبر کے ہیں۔
چنانچہ:۔
حوصلہ کرو ذرا دانتوں میں زبان دبا کر بیٹھو۔
زبان دینے سے مراد وعدہ اور اقرار کے ہیں۔
وہ زبان دے چکا ہے۔
زبان ہارنے سے مراد بے وفائی اور بے عہدی کے ہیں۔
وہ زبان ہار چکا۔
ہونٹ کاٹنے سے مراد غُصّہ اور غیظ و غضب ہے۔
وہ تو یہ سُنکر ہونٹ کاٹنے لگا۔
ہونٹ چبانے سے مراد تردد اور غور ہے۔
ہونٹ چبا کر کہا۔
آنکھ مارنے سے اشارہ تحریک مراد ہے۔
آنکھ مار کر کہا۔
صرف آنکھ کا اشارہ کافی ہے۔
آنکھ کے اشارے میں کہا۔
آنکھ کو آنکھ پہچانتی ہے۔
آنکھ کے پھیر میں ہو گیا۔
آنکھ بدل گئی۔
آنکھ پھر گئی۔

مُنہ بنانے سے مراد نفرت ہے۔
وہ تو مُنہ بناتا ہے۔
مُنہ چڑانے سے بھی نفرت مراد ہے۔
وہ تو مُنہ چڑاتا ہے۔
مُنہ نہ چڑاؤ۔
مُنہ دھو رکھنے سے مراد ناواجب دعوے اور ناواجب خواہش ہے۔
ذرا مُنہ دھو رکھو۔
مُنہ تو دیکھو سے بھی یہی مراد ہے۔
مُنہ تو دیکھو۔
یہ مُنہ اور یہ چپیڑ سے مراد ناموزونیت اور ناقابلیت کے ہیں۔
یہ مُنہ اور یہ چپیڑ۔
جیسا مُنہ ویسی چپیڑ۔
پیٹھ دکھانا انکار اور بے وفائی سے مراد ہے۔
پیٹھ دکھا گیا۔
سر کے بل۔ آنکھوں کے بل۔ مُنہ کے بل عجز و نیاز سے مراد ہے۔
مُنہ کے بل گیا۔
سر کے بل آؤں گا۔
آنکھوں کے بل۔
آنکھیں چومنا محبّت اور پیار۔
مَیں تو آنکھیں چومتا ہوں۔
بوسہ دینا محبّت اور پیار
آنکھیں چڑھانا علامت غصّہ اور خفگی کی ہے۔

آنکھیں نہ چڑھاؤ۔

آنکھوں پر ہاتھ رکھنا تسلیم اور اعتراف

گوشہ چشم سے دیکھنا غیرت نفرت سے مراد ہے۔

کیوں گوشہ چشم سے دیکھتے ہو۔

گھورنے سے مراد خفگی اور غصّہ ہے۔

گھور کر کیوں دیکھتے ہو۔

ایک آنکھ سے دیکھنا رعایت یا ناانصافی سے مراد ہے۔

حضرت ایک آنکھ سے نہ دیکھو۔

اُنگلی مُنہ میں رکھنا حیرت سے مراد ہے۔

انگشت بدنداں۔

انگشت بدہان۔

انگشت حیرت۔

ہتھیلی پر سرسوں کے اطلاق سے مراد نفی ہے۔

ہتھیلی پر سرسوں۔

ناک بھوں چڑھانا نفرت۔

کیوں ناک بھوں چڑھاتے ہو۔

ناک چڑھانے سے بھی یہی مراد ہے۔

کیوں ناک چڑھاتے ہو۔

ناک رگڑنے سے مراد عجز و نیاز ہے۔ جیسے اب تو وہ ناک بھی رگڑتا ہے۔

سجدہ کرنے سے بھی مراد عجز و نیاز ہے جیسے سب کے سب سجدہ میں گر گئے۔

بڑے بڑوں نے بھی گردنیں جھکا دیں۔

جھکنے سے بھی یہی مراد ہے۔

بعض وقت سر ہلانے کا مدعا۔ لذّت اور حظ بھی ہوتا ہے۔

چنانچہ کیسے مزے میں سر ہلا رہا ہے۔

جھومنے سے بھی بعض وقت یہی مراد لی جاتی ہے۔

جیسے وہ تو جھوم رہا ہے۔

زبان دبانا متامل ہونا۔

پیٹھ ٹھونکنا حوصلہ دلانا۔

اُس نے اُس کی پیٹھ ٹھونک دی۔

اُس کی پیٹھ تو ٹھونکو۔

رونا غم اور رنج کی علامت ہے۔

ہنسنا خوشی اور مسرت کی علامت۔

یہ جتنی حرکات کا ذکر کیا گیا ہے یہ سب ایک قسم کے ایسے اشارات ہیں کہ جن سے بغیر منہ بولے اور بات کہئے کے بھی دیکھنے والے سمجھ جاتے ہیں کہ ایسے اشارہ کرنے والوں کی کیفیت حالت اور مراد کیا ہے۔ جس طرح ہم اب ایسے اشارات کے مطلب سمجھ جاتے ہیں۔ اسی طرح پہلے لوگ اُس وقت بھی سمجھ جاتے تھے جب زیادہ دار انہیں پر مدار تھا۔ اور علمی رنگ میں اب بھی ہم مقررہ اشارات سے بڑی بڑی باتیں سمجھ جاتے اور بڑے بڑے واقعات کی اطلاع دیتے اور پاتے ہیں یہ تار برقی وائرلیس ہیلوگراف وغیرہ وغیرہ جھنڈیوں کے اشارات اشارات ہی تو ہیں دیکھو یہ سب علمی اشارات اس زمانہ میں بھی کس خوبصورتی سے کام دے رہے ہیں اور کس وسعت کے ساتھ دنیا میں ان کا استعمال ہو رہا ہے وہ قومیں جو ان علمی اشارات سے اب تک ناواقف ہیں وہ اس وجہ سے ایک بڑے گھاٹے میں ہیں اور انکی کاروباری زندگی ایک دھندلے میں گذر رہی ہے ہر ترقی یافتہ قوم

کے فضائل اور اعلیٰ تمدّن اور خوش آئند تہذیب کے عناصر مقدم ہیں سے
یہی علمی اشارات ہیں زندگی کی اُن ضروریات سے ایسی قومیں محروم نہیں
رہ سکتی ہیں۔ کیونکہ ان علمی اشارات کے بغیر اُن کا گذارہ نہیں چل سکتا۔ انکی
تہذیب اُن کا تمدّن اور اُن کی کاروباری زندگی اسی طرح ان اشارات علمی
کی محتاج ہے جیسے اور حوائج زندگی کی۔ اگرچہ یہ اشارات زبان کے ماتحت
ہی کام دیتے ہیں مگر پھر بھی اشارات ہی ہیں اور اشارات ہی کے
رنگ میں اُن سے کام بھی لیا جاتا ہے ؎

حروف تحریر بھی اشارات ہیں

شروع میں انسان چونکہ زبان کے ناکمل ہونیکی وجہ سے اشارات
کنایات سے کام لینے کا عادی رہا ہے اس واسطے اب تک یہ طریقہ اُس
سے چھوٹا نہیں اب بھی بہت کچھ اشارات اور کنایات سے کام لیتا ہے
اور بعض وقت یہ اشارات اور کنایات مطلب براری کے واسطے اسکو
تحریر اور حروف سے بھی زیادہ کام دے جاتے ہیں تار برقی۔ وائر لیس
لاسلکی اور ہیلوگراف وغیرہ معمولی تحریر سے زیادہ تر کارآمد اور مفید
ثابت ہوئے ہیں اور بعض وقت معمولی تحریر اسقدر کام نہیں دے
سکتی جس قدر ایسے اشارات دیئے جاتے ہیں۔ شارٹ ہینڈ طریقہ
بھی ایک قسم کے اشارات مخصوصہ ہی ہیں یہ رمزی اور معمولی تحریر جو ہر زبان
میں اس وقت قریباً کسی نہ کسی رنگ میں مروج ہے اشارات اور کنایات
ہی تو ہیں آدمی ایک چٹ پر چند حروف لکھ کر کاسے کوسوں تک بھیجدیتا
ہے اگلے پڑھنے والے اُس سے ایسا ہی مطلب نکال لیتے ہیں جیسے

بھیجنے والا مُنہ زبانی باتیں کر رہا ہو۔ پڑھنے والا بھی ایسا ہی خیال کرتا ہے کہ کاتب
خط اُسکے سامنے یا اُس کے پہلو میں بیٹھ کر اپنی کہانی کہہ رہا ہے۔ صدیوں کی
کتابیں اور کتبے انہی اشارات اور کنایات میں موجود ہیں اور ہزاروں دفتر
ان ہی رموز میں دنیا کے راز سربستہ لئے ہوئے کمروں میں بند ہیں اُن کے
لکھنے والے اُن کے بانی صدیوں سے تہِ خاک پڑے ہیں اُن کا ذکر تک نہیں
ہوتا نسلیں دن بدن اُنہیں فراموش کرتی جاتی ہیں لیکن اُن کی تحریریں اُنکی
یادداشتیں اشاراتی اور کنایاتی رنگ میں اب تک زندہ اور گویا ہیں
(بمصداق) نویسندہ را نیست فردا امید
نوشتہ بماند سیاہ بر سفید
حکومتوں اور تاجروں کے اسرار اور راز کی باتیں چند اشارات میں ہی تکمیل
پاتی ہیں تار برقیوں اور خط و کتابت میں ایسے مقررہ اشارات ہی سے
ضرورت پر کام لیا جاتا ہے جو لوگ اُن سے واقف ہوتے یا اُن رموز
سے آشنا ہیں وہ بآسانی مطلب سمجھ جاتے ہیں لیکن دوسرے ایک
حرف بھی نہیں پڑھ سکتے کیا ہم اس زندہ مثال سے یہ قیاس نہیں کر سکتے
کہ اسی طرح شروع شروع میں یہی حالت تھی اور ایسے ہی مقررہ اشارات سے
لوگ کام نکالتے تھے اور اُن ہی سے بزنگ ارتقائی رفتہ رفتہ لسانی ترقیات
کی بنیاد پڑتی گئی ہے اس سے یہ بھی استدلال ہو سکتا ہے کہ کل
قوموں کی پہلے ایک ہی زبان بھی تھی۔ اور ایک ہی نسل۔ اور ایک ہی مورث

تجربہ اکبر

۱۴ - جون ۱۹۱۶ء

یہ روایت ہے کہ اکبر بادشاہ نے ایک دفعہ جانوروں کی صحبت میں
ایک لڑکا جو رکھوا کر دیکھا تو وہ گونگا نکلا کچھ بول نہیں سکتا تھا اس سے

بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ انسان میں ملکۂ تکوینِ زبان نہیں ہے
میری رائے میں یہ درست نہیں ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ انسان
ناطق ہے اور یہ ملکہ اس کو فطرتاً اور طبعاً حاصل ہے اگر یہ درست ہے تو
یہ ملکہ کسی صورت میں بھی سلب نہیں ہو سکتا چاہیے کوئی بچّہ انسان انسانوں
میں رہے اور نشو و نما پائے اور چاہے جانوروں میں البتہ اس میں بوجہ
عدمِ مشق اور عدمِ عادتِ طلاقت میں ایک قسم کی کمزوری یا نقص آ سکتا ہے؛
اگر یہ بات درست نہیں تو اس کا دوسرا پہلو یہ ہوگا کہ اگر کوئی جانور یا کوئی
درندہ چرندہ پرندہ انسانوں میں نشو و نما پائے تو بلا محنت انسانی بولیاں
بولنے لگے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا گھریلو جانور ہمیشہ انسانوں کے
ساتھ پہلو بہ پہلو رہتے ہیں چاہیئے تھا کہ وہ بھی انسانی بولی بولنے
لگتے انسان کا بچّہ جو جانوروں میں رہ کر گونگا سا ہو جاتا ہے وہ دراصل
گونگا نہیں ہوتا بلکہ طلاقت کا عادی نہیں رہتا یا یہ کہ وہ بھی جانوروں
میں رہ کر اُن کی سی بولیاں بولنے لگتا ہے لیکن اس پر بھی وہ اپنی نوعی
طلاقت سے محض بیگانہ نہیں ہو سکتا سو یہ ایک دوسری بات ہے
اور اگر وہ جانوروں کی بولی سیکھ لیتا اور کسی حد تک بول بھی سکتا ہے
تو یہ اور بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس کی فطرت میں ہی ملکۂ تکوین
اور ملکۂ اموختن ایک خاص مقدار میں ودیعت شدہ ہے۔ اور
اُس میں نہ صرف نقل کا ہی مادہ ہے اور اُس کی قوّت اور ملکہ نہ صرف
نقل ہی کی استعداد رکھتا ہے بلکہ ایک تخلیقی اور تکوینی مواد سے
بھی کام لیتا ہے رہا یہ کہ جانوروں میں اکبر بادشاہ نے جو بچّے پالو رکھے
تھے وہ مہمل آوازیں نکالتے تھے اور محض گنگ تھے یہ اس بات
کا ثبوت نہیں کہ انسان زبان کی تکوین سے وہبی رنگ میں عاری اور

قائم ہے بلکہ اس بات کا کہ اُس میں آوازیں نکالنے کی قوّت اور ملکہ پایا جاتا ہے اور وہ جانوروں کی صحبت میں بھی رہ کر اس فطری خاصہ سے محروم نہیں رہ سکتا کیا اب بھی انسان باوجود غیر مہمل آوازوں نکالنے کے مہمل آوازیں نہیں نکالتا اور کیا ایسی آوازوں کی وجہ سے انسان گنگ ہوتا ہے اُس کا آوازیں نکالنا ہی اُس کے نطق اور ملکہ تکوین رکھنے کا ایک زندہ ثبوت ہے اور نہ اس سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی بنی بنائی زبان سیکھتا ہے اور خود کچھ نہیں بناتا اور خود صرف ایک ناقل ہے۔

اگر اس کائنات اور خصوص انسانی کائنات کا کوئی شروع ہے تو یہ کہا جائیگا کہ اس قوّتِ نقل اور محض آموخت کی صورت میں انسانی خلقت سے پہلے کوئی زبان صفحۂ دنیا پر موجود ہو گی یا تو اسے کوئی بولتا ہوگا اور یا اُس کے الفاظ فقرات اور جملے خوبصورتی کے ساتھ کسی درخت یا درخت کے پتوں پتھروں اور چٹانوں پر کندہ اور تحریر ہوں گے اور پہلے انسان نے اُنہیں وہاں سے نقل کیا ہوگا میری رائے میں یہ توجیہ اور یہ تاویل درست نہیں۔

بات یہی ہے کہ قدرت کی جانب سے انسان کی سرشت اور فطرت میں ایک تکوینی اور نقلی مادہ رکھا گیا ہے اُس کی وجہ اور اُس کے زور سے انسان زبان بناتا اور سیکھتا ہے چاہے اسے الہام کہو اور چاہے القا چاہے ایک وہبی ملکہ۔ رونا اور ہنسنا بھی ایک طبعی جذبہ ہے بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی رونا اور ہنستا بھی ہے حالانکہ اُس نے کبھی اس سے اوّل کوئی ایسا منظر آغوش مادر میں دیکھا نہیں ہوتا کیا اس سے یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ اسی طرح انسان کا بچہ بھی پیدا ہونے کے ساتھ ہی ملکہ تکوین زبان اور نقل زبان فطرتاً ساتھ ہی لاتا اور رفتہ رفتہ اُس سے کام بھی لیتا ہے

انسان نے کسی سے الفاظ زبان شروع میں سُنے نہیں بلکہ خود اُس کے اندرونہ میں سے بزور ملکۂ تکوین رفتہ رفتہ نکلتے رہے ہیں اور وہی شروع کے الفاظ یا شروع کی زبان کا بانی بھی ہے دنیا میں اس وقت نادر سے نادر ... جو کلیں جو مشینیں جو ایجادات اور جو کمالات موجود اور معمول ہیں شروع میں انسان نے اُن کی نقل کہاں سے اُڑائی اور کس کے نقش قدم یا نمونہ پر وہ چلا شروع میں جس انسان نے کسی کل کسی مشین کی بنیاد ڈالی اُس کا بانی اور اُس کا نکالنے والا صرف وہی اور اُس کا تن تنہا دل و دماغ ہی تھا نہ تو اُس وقت اُس کے سامنے کوئی نمونہ تھا اور نہ کوئی نظیر۔ اسی طرح زبان کی بھی ابتدا ہوئی اور اسی طرح ملکۂ تکوین کی بدولت یہ دولت زبان انسان کے ہاتھ لگی۔ اور اس رنگ میں رفتہ رفتہ فلاسفی علّم اٰدم الاسماء کلّھا کی پوری ہوئی ؎

مشینوں اور کلوں کا بنانا یا دیگر کمالات کا حاصل کرنا تکوین زبان اور تخلیق الفاظ سے کم نہیں ہے جب انسان اسپر قادر ہے تو کیا تخلیق اور توضیع زبان اور الفاظ پر قادر نہیں ہے ایجادیں تو بہت کچھ سوچنا پڑتا ہے تخلیق زبان میں تو صرف ایک ہی ملکۂ تکوین سے کام لینا ہے۔ ایک طرف انسان صوتی اور صدائی الفاظ بناتا اور گھڑ لیتا ہے اور دوسری طرف اندرونی ملکہ کے زور سے دوسرے غیر صوتی الفاظ بھی بنا لیتا ہے اور بناتا رہا ہے اور بناتا رہیگا ؎

ہمارا اور بعض دیگر اصحاب کا اس تھیوری میں صرف یہ اختلاف ہے کہ اُن کے خیال میں انسان نے بعض الفاظ اس طرح سنے جس طرح اب وہ دوسروں سے سنتا یا کسی رسالہ اور کتاب میں پڑھتا ہے اور ہم یہ کہتے ہیں کہ اُس نے شروع میں نہ تو کسی اور سے الفاظ سُنے اور نہ

کسی کتبہ پر پڑھے بلکہ اُس کے اندر ہی سے الفاظ نکلتے رہے ہیں اور اب تک نکل سکتے ہیں اور نکلتے ہیں اور نکلتے رہیں گے فرق صرف یہ رہا کہ دوسرے بعض لوگ ایک عارضی ذریعہ سماعی الفاظ کا قرار دیتے ہیں اور ہم ملکۂ تکوین کے ماتحت ایک مستقل اور دائمی ذریعہ مانتے ہیں وہ بھی زبان بننے کے دو طریقے بیان کرتے ہیں اور ہم بھی دو طریقے مانتے ہیں اُن کے نقطۂ خیال سے وہ سماعی یا عارضی طریقہ بند ہو چکا ہے اب انسان کے کانوں میں اُس قسم کی آوازیں نہیں پڑتی ہیں اور نہ اب طبقۂ دنیا پر کسی کو لسانی الہام ہوتا ہے اور نہ قدرت کسی کے کان میں کوئی لفظ پھونکتی ہے اور ہمارے خیال میں الہام روحانی کی طرح اب تک بھی اُس ملکۂ تکوین کی معرفت ویسی ہی آوازیں انسانی اندرونہ سے سنائی دیتی اور نکلتی ہیں مبصرین ان دونوں تھیوریوں میں بآسانی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرین حقیقت کونسی تھیوری ہے ؞

شائد بعض لوگ کہیں کہ اب بھی انسان جو بعض الفاظ با معنی مہمل اور تابع مہمل بول دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک زبان کے الفاظ سے واقف ہے اور خود بھی ایک زبان رکھتا ہے اس واسطے وہ ایسے ایسے الفاظ بول سکتا ہے اگر اُس نے ایسے الفاظ سُنے نہ ہوتے تو شائد نہ بول سکتا ؞

بے شک انسان خود ایک زبان بولتا اور اُس کے الفاظ سے آشنا ہے اور جو بعض جدید الفاظ وہ بولتا ہے اُن کا وزن اور اُنکی ترکیب سماعی الفاظ کے مطابق ہی ہوتی ہے چاہے معنوں میں کوئی ترادف اور اتحاد نہ ہو۔ لیکن اس سے یہ قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نرا ناقل ہی ہے بلکہ یہ کہ وہ اصلی الفاظ نکالتا اور بولتا بھی ہے جب ہم یہ الفاظ بولتے

ہیں ⁂

چن ⁂ ذان ⁂ فان ⁂ ڈاؤ ⁂ ٹان ⁂ ڈاسا ⁂ فاٹ ⁂ چیف ⁂ نیزی ⁂ گل سا ⁂ بوکی ⁂ سیف ⁂ سالن ⁂ چاپے ⁂ زول ⁂

تو گو ان الفاظ کے اوزان ہمارے دوسرے مستعملہ اور بامعنی الفاظ کی طرح ہی ہیں لیکن یہ اُن سے طلاقتی پہلو سے مغایر بھی نہیں اور بولتے وقت ہم یہ خیال بھی نہیں کرتے کہ ہم بعض الفاظ کی نقل اشکالی کر رہے ہیں ایک ناخواندہ بچہ جب بے ساختہ ایسے الفاظ بول سکتا ہے حالانکہ وہ دوسرے مستعملہ الفاظ سے واقف تک نہیں ہوتا تو کس طرح یہ خیال کیا جائے کہ یہ صرف ایک نقل ہی ہوتی ہے ⁂

اس میں تو کسی کو اعتراض اور شبہ نہیں کہ انسان مختلف آوازیں نکال سکتا ہے یا آوازوں کی نقل کر سکتا ہے۔ اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ آوازوں ہی کی دوسری شکل الفاظ بھی ہیں الفاظ کیا ہیں اشکال اور اشکال کیا ہیں الفاظ جب انسان طبعاً آوازیں نکال سکتا ہے اور اُن آوازوں کی کوئی نہ کوئی شکل ہوتی ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ انسان طبعاً تحت ملکہ تکوین کے بانی الفاظ اور ظلّی رنگ میں خالق زبان ہے جب یہ ملکہ تکوین شروع شروع میں ایک حد تک کام کر چکا اور ہمارے اسلاف اس سے ایک لسانی داغ بیل ڈال چکے تو پھر زیادہ تر نقل زبان سے کام لیا جاتا رہا اور بوجہ ایک ضروری سرمایہ زبان کے مہیا ہو جانے کے رفتہ رفتہ لوگوں اور بولنے والوں کی توجہ اس طرف سے ہٹتی گئی اور ایک سابقہ سرمایہ ہی سے

کام لینا موزون خیال کیا گیا اور اس ابتدائی کوشش سے الگ رہ کر زبان کی دیگر لطافتوں خوبیوں اور کمالات پر زور دیا گیا وہ باتیں وہ خوبیاں جو اب بعض ترقی یافتہ اور ادبی زبانوں میں پائی جاتی ہیں شروع میں کہاں تھیں بزرگوں نے ملکۂ تکوین کے ماتحت شروع میں ایک ڈھانچہ بنا کر رکھ دیا اور اخلاف نے اُسپر وہ گلکاریاں کیں کہ اب وہی ناتراشیدہ اکھڑی اکھڑی زبانیں انسان کی تہذیب ادبیات کا مایۂ ناز ہیں اور اُنہی پر ہمیں فخر ہے یہ ایسی ہی ترقی ہے جیسے رفتہ رفتہ دیگر اشیائے آسائش انسانی میں ارتقائی پہلو سے ہوتی گئی ہے اور آج اُنہیں ایک انتہائی درجہ حاصل ہو چکا ہے ؀

استدلال برنگ دیگر

تمام علوم و فنون کے اعلیٰ ذرائع صرف سات ہیں۔ ممکن ہے کہ انکے سوائے کوئی اور ذریعہ بھی ہو مگر استقرائی بنیاد پر یہی ذرائع راس الذرائع معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) بصارت -
(۲) سماعت -
(۳) قوّتِ شامہ -
(۴) قوّتِ ذائقہ -
(۵) لمسی ادراکات -
(۶) تخیل -
(۷) تفکّر -

تخیّل اور تفکّر باقی کے کُل ذرائعہ سے مربوط اور وابستہ ہیں گو نہ تخیّل اور تفکّر کے بجائے خود الگ فرائض بھی ہیں مگر یہ دونو قوتیں باقی سب قوتوں کی بھی خادمہ ہیں۔ اگر انسان کے قابو میں یہ ہر سات ذرائع نہ ہوتے تو انسان کسی علم اور فن کی داغ بیل نہ ڈال سکتا ان ذرائع میں سے گو بعض ذرائع دیگر زندہ مخلوق کو بھی ایک حد تک حاصل ہیں اور اُن سے دوسری مخلوق اپنے اپنے رنگ میں کام بھی لیتی ہے مگر اُسے وہ کمال وہ ضبط اور وہ خوبی حاصل نہیں جو حضرت انسان کے حصّہ میں آئی ہے یہی وجہ ہے کہ دوسری مخلوق انسانی کمالات کو اب تک نہ پہنچ سکی اور نہ وہ پہنچ بھی کس طرح سکتی انسان ہی ایک ایسی خلقت ہے جو انتہائی ترقیات کا خواہشمند ہے اور اُس کی طاقتیں اور جذبات ساکن اور صابر نہیں ہیں دوسری زندہ مخلوق کی طاقتیں اور جذبات اپنی حدود میں ساکن ہیں نہ تو انہیں کوئی تحریک اُس طرف لیجاتی ہے اور نہ خود اُن کی اپنی فطرت میں بھی کوئی ایسی تحریک رکھی گئی ہے۔ بالفاظ دیگر ماتحت ان سب ذرائع کے تمام علوم وفنون انسانی کی بنیاد :-

(الف) مختلف قسم کی آوازیں۔

(ب) مناظر۔

(ج) احساسات۔

(د) ادراکات۔

(ھ) تخیلات۔

ہیں اور غور کرنے سے معلوم بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی علم و کمال اس خمسہ ضروریہ سے باہر اور خارج نہیں محاصلات ان وسائل کی کفیل

انسان کی زبان اور نطق ہے اور وہ تاویلی مرحلہ جسے کسی قوم اور کسی ملک کی لسان یا زبان کہا جاتا ہے گو مختلف زبانوں کی صورت ترکیب اور وسعت طلاقت جدا گانہ ہے اور گو ہر ایک زبان کے الفاظ معانی اور ترکیبات میں بہت کچھ تضاد ہے مگر پھر بھی ان ذرائع یا ان موجبات سے خارج اور خالی نہیں ہیں ہر زبان آواز منظر احساس اور تخیل و ادراک کے تابع ہے زبانوں کے تمام اجزا صغیرہ و کبیرہ بے معنی اور بامعنی ان ہر سات اجزا سے مربوط ہیں دوسرے الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ ان ہر سات اجزا کی ترکیب اور نظم کا نام ہی زبان ہے اور ہر زبان مختلف آوازوں کے تابع ہے*

آواز کیا ہے؟

آواز ہمیشہ کسی تصادم۔ تضارب اور تقارب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے آواز ہوا۔ پانی اور زمین کے ذریعہ سے سفر کرتی ہے ہر ایک قسم کی آواز ہمیں ہوا کے ذریعہ سے سنائی دیتی ہے اور کبھی کبھی زمین کے ذریعہ سے بھی سُنی جاتی ہے جیسے سڑک پر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دیتی ہے اسی طرح ایک غوطہ لگانے والا آدمی کسی قدر باہر کی آواز سُن سکتا ہے جہاں ہوا نہ ہو وہاں کوئی آواز ظاہر اور متموّج ہی نہیں ہو سکتی زمین اور پانی کی آوازوں میں بھی ایک گونہ ہوا کا دخل ہوتا ہے جہاں ہوا نہیں وہاں قریباً تمام قسم کی آوازیں مدہم پڑ جائیں گی آواز دینے سے یا آواز نکلنے سے ہوا میں ایک قسم کی موجیں اور لہریں پیدا ہو جاتی

ہیں اور یہ لہریں ایک تموج اور ایک زور کے ساتھ تمام فضا میں پھیلتی جاتی ہیں اور جہاں جاکر رک جاتی ہیں وہیں ایک مرکز بنا لیتی ہیں جب ہوا کی لہر انسان کے کانوں سے جاکر ٹکراتی ہے تو اس ٹکرانے سے انسان کے رگ پٹھے اس کا احساس کرکے دماغ تک اسکی خبر پہنچا دیتے ہیں اس تصادم اور تضارب سے ملکۂ تکوین کے زور سے الفاظ بنتے جاتے ہیں یا انسان توضیع الفاظ پر متوجہ ہوتا ہے۔

گو زبان کا شروع آوازوں اور تخیل سے ہوتا ہے اور خیال ہی کے تابع مختلف آوازیں بھی خارج ہوتی ہیں اور الفاظ کی شکل اختیار کرکے دوسروں تک پہنچتی ہیں لیکن تخیل بھی آواز ہی کی صورت میں صورت پذیر ہوتا ہے اگر تخیل آواز کی شکل سے منکشف نہ ہوتو اس کی دلاویز ہستی اندرونہ میں ہی رہ کر ختم ہوجائے جو کچھ ہم بولتے اور سنتے ہیں در اصل وہ ایک خیال ہی ہوتا ہے جو ایک آواز کی صورت میں ہم تک پہنچتا یا پہنچایا جاتا ہے جب زید بکر کو یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ ضرورت ہے تو یہ فقرہ ایک آواز کی صورت اور تمثل میں ہی کہا جاتا ہے زید کا یہ وہ خیال ہے جو اس کے اندرونہ میں پرورش پاکر باہر نکلا ہے اگر ایک آواز کے قالب میں مشتمل نہ ہوتا تو بکر اس کو نہ سن سکتا اور نہ سمجھ سکتا گو اس کا موجد اول خیال ہے لیکن اس کا موجد ثانی وہ تموج یا طریق عمل ہے جس کا نام آواز ہے ۔

آواز صرف انسان ہی کے منہ سے نہیں نکلتی دیگر زندہ ہستیوں اور غیر زندہ سے بھی آوازیں نکلتی اور خارج ہوتی ہیں ہر ایک قسم کی آواز آواز ہے صرف فرق یہ ہے کہ جو آواز انسان کے منہ سے نکلتی ہے اسکو انسان کی بولی یا بولنے اور نطق سے تعبیر کرتے ہیں اور جو آوازیں دیگر زندہ مخلوق یا غیر زندہ ہستیوں سے نکلتی ہیں انہیں محض آواز یا دیگر ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے جس طرح انسان کی آوازیں ممتاز اور مختلف ہوتی ہیں

اسی طرح دیگر ہستیوں کی آوازیں بھی عموماً مختلف ہوتی ہیں مثلاً جو آواز لوہے سے چوٹ یا ضرب کے بعد نکلے گی۔ وہ پیتل۔ سونا۔ چاندی اور لکڑی کی آواز سے گونہ مختلف ہوگی انسان بشرطیکہ اُسے شناخت آواز کا ملکہ ہو ان جداگانہ آوازوں میں بخوبی تمیز کرسکتا ہے +

آوازوں کی شکلیں

جتنی آوازیں مختلف اجسام یا مختلف طریق سے نکلتی ہیں اُن سب کی کوئی نہ کوئی شکل یا ہیئت ہوائی کرہ میں بنتی جاتی ہے ہوا میں ہی نہیں بلکہ مُنہ میں بھی بولتے وقت اُن کی شکل بن جاتی ہے انسان جو کچھ بولتا اور کہتا ہے اُس کی ہیئت اور شکل کھینچی جاسکتی ہے گراموفون اس خیال کی تائید میں ایک زندہ شہادت ہے گراموفون اور فونوگراف میں آوازوں ہی کی اشکال کا عکس ہوتا ہے۔ فونوگراف میں ایک بیلن جو ایک قسم کی لاکھ سے بنایا جاتا ہے پُرزوں کی حرکت سے چاروں طرف گھومتا ہے اور اُس آواز کو جو ہوا میں سے آتی ہے جذب کرتا رہتا ہے اور اس آواز کے نشان لاکھ کے بیلن پر بنتے جاتے ہیں اگر آواز کی شکل نہ ہوتی تو اُس کا یوں عکس کس طرح ہوسکتا جب ایک آواز دوسروں تک پہنچ جاتی ہے تو وہ ایک ہوائی مجسمہ ہی ہوتا ہے ورنہ کس طرح پہنچ سکتی ہے +

ہوا میں خدائے کریم نے ایک فورس اور ایک لچک دے رکھی ہے اور اس لچک میں ایک لذیذ مادہ بھی رکھا گیا ہے جب کوئی آواز اپنے مرکز سے نکلتی ہے تو وہ لذیذ مادہ اُسے اپنے آپ میں جذب کرکے ایک حقیقت یا ایک شکل بخشتا ہے اور اُس ہیئت یا اُس شکل کی نشان میں دوسروں تک اُسے پہنچا دیتا ہے دیکھو سورج کی کرنیں اور روشنی کی

لہریں کن کن مختلف اشکال میں جلوہ افروز ہوتی ہیں اور کس طرح عین مطابق محل اور موقعہ اُن کی شکلیں بن جاتی ہیں اسی طرح ہوائی کرہ میں آوازوں کے مختلف دائرے بنتے جاتے ہیں اور اُن دائروں کے مطابق ہر آواز مختلف اشکال اختیار کرتی جاتی ہے ۔

چونکہ ہوا دیکھی نہیں جا سکتی اس واسطے اُسکے ایسے صدای دائرے بھی دیکھے نہیں جا سکتے جب ہم الفاظ - خدا - اکبر - اعلیٰ محبت - اقبال افتخار - سراج - ظفر - جمال امیر - بشیر - نیاز - عزیز - افضال - مراتب غیاث معین - شجاعت - محبوب محرم - شوق - کرشن - ریاض - رشید سعید حیات اور قیوم بولتے ہیں تو جس طرح کاغذ پر ان کی شکلیں ہر ایک زبان میں ترقیم پاتی جاتی ہیں اسی طرح ہوائی تختی پر بھی ایسی شکلیں بنتی جاتی ہیں جب مُنہ سے کوئی آواز نکلتی یا کسی اور مخرج سے سُنی جاتی ہے تو گراموفون میں اُسکا عکس اُترتا جاتا ہے مُنہ سے نکلنے کے وقت وہ اپنا مرکز اول چھوڑ چکتی ہے گراموفون میں عکس ہونے تک وہ گویا ہوا میں معلق اور متموج رہتی ہے اگر وہ متموج اور معلق نہ ہوتی تو اُس کا گراموفون میں یوں انعکاس کس طرح ہوتا ۔ یہ شعر پڑھو :-

کوئی چارہ نہ تھا نہ مجبوری ہیں کوشش کے سوا ۔ رہ نما تُو منزلِ مقصد ضرورت بن گئی

ہر لفظ پڑھنے اور بولنے کے ساتھ ہی مُنہ اور زبان سے الگ ہو کر ہوا میں منعکس ہوتا جاتا ہے اور ادھر ساتھ ہی گراموفون میں عکس ہونے لگتا ہے گراموفون میں اُس وقت تک عکس ہونا مشکل ہے جب تک ہوا میں اُس کا وجود متموج اور معلق نہ ہو چونکہ تمام قسم کی آوازیں بجائے خود ایک ہوا ہیں اس واسطے اُن کا ہوا میں منعکس ہونا مشکل نہیں ہے ہر آواز ایک قسم کا فورس اور جذب رکھتی ہے اور ادھر ہوا میں بھی ایک فورس اور ایک

زور ہوتا ہے جب یہ دونو فورس بالمقابل آتے ہیں تو ہوائی فورس اپنے زبردست جذب کی بدولت آواز کو اپنے میں جذب کرلیتا ہے اور اُس انجذاب سے ہوائی سطح پر ان کا عکس ہوجاتا ہے ؎

چونکہ ہوا میں پانی کے بخارات شامل ہوتے ہیں اور اُس میں گیس بھی ہوتی ہے اور وہ روشنی بھی لے سکتی ہے اس واسطے اُس میں آوازوں کی تصویر کا اُترنا یا عکس ہونا مشکل نہیں ہے ؎

تخیل اور آوازیں

ہم یہ پھر جتانا چاہتے ہیں کہ تخیل ہی کی بدولت آوازوں کا بہت سا حصّہ ہم تک پہنچتا ہے مثلاً جب ہم کوئی خارجی آواز سنتے ہیں تو ہمارے دماغ میں اُس کا وجود تخیل ہی کی بدولت منعکس ہوتا ہے بے شک وہ آواز ایک خارجی آواز ہوتی ہے لیکن اگر ہمارے دماغ تک اُس کی رسائی نہ ہو تو ہم کس طرح اُس سے واقف ہو سکتے ہیں دماغ میں اُس کی ایک شکل اور ایک ڈھانچے بن کر زبان پر کسی نہ کسی لفظ کی شکل میں جاری ہو جاتی ہے جب تک آواز کا تخیل نہ ہو تب تک ہماری زبان سے کس طرح کوئی آواز نکل سکتی ہے بولنے کے اوّل ہم اپنے اندرونہ میں ایک مجسم خیال پاتے ہیں اُس کے تموج کے بعد ہماری زبان سے کوئی لفظ نکلتا ہے ہمیشہ دو طرح سے ایسا تخیل ہوتا ہے :-

(۱) بذریعہ اندرونی تموّج ۔

(۲) بذریعہ بیرونی تموّج

انسان عالم خاموشی میں بذریعہ تخیل یہ تماشا کر سکتا ہے کہ اُس کے

اندرونہ میں کس کس قسم کے خیالات پے بہ پے پیدا ہوتے اور مدہم پڑتے
جاتے ہیں ایک ابھی ختم ہونے میں نہیں آتا کہ دوسرا پیدا ہو جاتا ہے
اور لطف یہ کہ ہر خیال کی شکل اور آواز اندرونہ میں ہی متمثل ہوتی جاتی
ہے کبھی ایسے خیالات ایک ہی سلسلہ کے تابع ہوتے ہیں اور کبھی
مختلف سلسلوں سے آنکھیں بند کرکے ایک خاموشی کے ساتھ اس
اندرونی تموّج کا تماشا کرو کہ کس کس قسم کے خیالات اور کس کس قسم کی
شکلیں اور ہیئیات اور تمثلات مرتسم ہوتے ہیں کچھ شک نہیں کہ ایسے
تمثلات اور نقوش کا بہت سا حصہ بیرونی دنیا یا بیرونی خیالات
اور بیرونی مناظر کا ہی شمہ اور عکس ہوتا ہے لیکن بعض وقت ایسے
اشکال ایسے نقوش اور ایسے تمثلات کی بھی نوبت آجاتی ہے کہ جن کا
اس ظاہری اور مادی دنیا میں کوئی نمونہ نہیں ملتا ہر شخص اس بحث کے
متعلق اپنا تماشا آپ کرسکتا ہے کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ
آنکھیں تو بند ہیں اور ایک قسم کی دُھندلی سی روشنی میں ہم مختلف
اشکال۔ نقوش اور تمثلات کا تماشا کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ ہم بیداری میں ایسا دیکھ رہے ہیں مرتاض لوگوں اور فلاسفروں
کی اصطلاح میں یہ ایک اندرونی تماشا ہے جو اندرونی روشنی میں
دیکھا جاتا ہے بعض ڈاکٹروں نے لکھا ہے کہ بعض انسان آنکھوں
پر پٹی باندھ کر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ غور کرنے سے اس قسم کے وجدانی
مشاہدے ہو سکتے ہیں ؀

مَنْ جَدَّ فَوَجَدَ

بیرونی تموّج کی زیادہ تر تفصیل کی ضرورت نہیں ہے ہر منظر

اس کا شاہد اور ہر صورت اس کی ممد اور گواہ ہے آوازوں اور
اشارات و کنایات سے تخیل متاثر ہو کر دماغی طاقت کے تحت
مختلف آوازوں اور مختلف الفاظ کے ذریعہ سے واقعات کائنات
اور کیفیات موجودات کا لسانی رنگ میں اعلان کرتا ہے گو ایسے
واقعات اور کیفیات کا تلفظ سنائی نہیں دیتا صرف منظر ہی منظر
ہوتا ہے مگر تخیل میں دماغی تصرف کے ذریعہ سے اُن کا خاکہ بننا شروع
ہو جاتا ہے جب مطلق تخیل سے بذریعہ ملکۂ تکوینی اور دماغی طاقت
کے آوازیں متلفظ ہو کر منہ اور زبان کے ذریعہ سے نکلتی ہیں تو وہی
تلفظ کسی ایک زبان کی داغ بیل ہو جاتا ہے

لفظ

۱۹۔ جون سنہ ۱۹۱۶ء

لفظ کے لغوی معنی منہ سے ڈالنے کے ہیں یا بات کہنے کے۔
چونکہ انسان جو کچھ بولتا ہے وہ منہ ہی سے نکلتا ہے اس واسطے جو
کچھ بولا جاتا ہے اُس کا نام لفظ رکھا جاتا ہے اور ہندی یا اردو میں
اُسے بول یا واک کہا جائے گا ہندی میں منہ کو واک کہتے ہیں
اس واسطے اُس میں سے جو کچھ نکلتا یا جو کچھ اُس سے خارج ہوتا ہے
اُس کا نام واک رکھا جاتا ہے

منہ سے جب کوئی لفظ نکلتا یا انسان جب بات کرتا اور بولتا ہے
تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسان کے اندرونہ میں الفاظ اور
فقرات کا ایک خزانہ یا ذخیرہ بھرا ہوا ہے اَن پڑھ اور پڑھے ہوئے
دونو قسم کے انسان یہ ذخیرہ رکھتے ہیں انسان صرف اُسی قدر الفاظ
منہ سے نکال سکتا یا بول سکتا ہے جسقدر یا تو اُس کی زبان میں مدون

اور موضوع ہیں یا جسقدر وہ بے معنی الفاظ بول سکتا ہے جو الفاظ ایک زبان میں نہیں ہیں وہ کوئی انسان با معنی الفاظ کے سلسلہ میں نہیں بول سکتا مثلاً جو شخص صرف اردو۔ اور ہندی جانتا ہے وہ عربی اور انگریزی الفاظ نہیں بول سکتا جس قدر الفاظ انسان مُنہ سے نکالتا اور بولتا ہے وہ سب اُسے یاد ہوتے ہیں یا اُس کے حافظہ میں محفوظ دیکھو جو الفاظ یاد نہیں ہوتے وہ ایک زبان دان بھی نہیں بول سکتا انسان ضرورت اور کلام کرنے سے پہلے یہ نہیں جانتا کہ اُسکے خزینہ حافظہ میں کسقدر الفاظ محفوظ ہیں مگر جوں جوں ضرورت پر بولتا جاتا ہے دماغ نکالتا جاتا ہے چونکہ حافظہ کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) حافظ بالفعل۔

(ب) حافظ بالقوہ۔

اس واسطے بولنے اور ضرورت سے پہلے کبھی بھی انسان یہ جانتا ہی نہیں کہ اُسکے دماغ میں الفاظ کا کسقدر ذخیرہ ہے وہی الفاظ اُسے یاد ہوتے ہیں جو ہر وقت کام میں آتے رہتے ہیں وہ الفاظ جن سے کبھی کبھی کام پڑتا ہے ضرورت پر ہی یاد آتے ہیں ایک تقریر کرنیوالا ایک تحریر کرنیوالا سوچ سکتا ہے کہ تقریر اور تحریر کے وقت الفاظ کس طرح بے ساختہ دماغ میں سے نکلتے آتے ہیں اور کس طرح اُنکی بارش ہوتی ہے بیشک بعض وقت ذرا دِقّت سے الفاظ نکلتے ہیں یا موزون الفاظ کی تلاش اور انتخاب میں ایک قسم کی دِقّت اور تکلیف ہوتی ہے مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ضرورت پر دماغ کنجوسی نہیں کرتا اور ماننا پڑتا ہے کہ دماغ خاموشی کے ساتھ صدہا الفاظ اپنے خزانہ میں خوبصورتی اور دیانتداری کے ساتھ جمع رکھتا ہے اور ضرورت کے وقت پر واپس

دینے سے دریغ نہیں کرتا ایک مضمون لکھنے اور ایک سلسلہ تقریر شروع کرنے سے پہلے ہمیں یاد بھی نہیں ہوتا کہ کون سے الفاظ لکھے اور لائے جائینگے مگر شروع کرنے کے ساتھ ہی الفاظ کی بارش اور آمد آمد شروع ہوجاتی ہے اور ساتھ ہی ایکے بعض وقت طبیعت خود بخود اُنکی چھانٹ بھی کرتی جاتی ہے اور موزون و ناموزون دیکھ کر لکھتی یا لاتی ہے۔ تعجّب یہ ہے کہ جسقدر الفاظ ہمارے دماغ سے نکلتے ہیں ہمیں باوجود اسقدر صرف کے یہ پتہ بھی نہیں لگتا کہ دماغی سرمایہ میں کسقدر کمی آگئی ہے کوئی کمی نہیں آتی وہی الفاظ جو ہم بیسیوں دفعہ مُنہ سے نکال چکے ہیں پھر بھی بدستور موجود رہتے ہیں گویا دماغ میں قدرت نے ایک ایسا چھاپہ خانہ لگا رکھا ہے جو کاپی در کاپی چھاپکر دیتا جاتا ہے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کاپیاں چھپتی جاتی ہیں اور ایک ایڈیشن نہیں بلکہ صدہا ایڈیشن پھر بھی کوئی کمی نہیں ہوتی ٭

انسان جسوقت کوئی لفظ کوئی جملہ کوئی فقرہ مُنہ سے نکالتا ہے تو مزید غور سے یہ پتہ لگ سکتا ہے کہ بولتے وقت انسان کے اندرون دہان کا ایک ایسا نقشہ بنتا جاتا ہے جس سے لفظ کی شکل اور حقیقت کا قیاس بھی کچھ نہ کچھ ہوسکتا ہے یا یہ کہ اندرونہ دہان کی شکل اور ہیئت ایسی ہی بنتی جاتی ہے یا ایسی شکل و ہیئت کا گمان ہوتا ہے ذرا بولتے وقت اسپر غور کرو اور دیکھو کہ بولتے ہوئے الفاظ اور مُنہ کی شکل میں کیا کچھ نسبت ہوتی ہے۔ آ۔ بَا۔ جَا۔ بولنے کے وقت مُنہ کا نقشہ بھی ایسا ہی بنجاتا ہے۔ تُو۔ بُو۔ خُو کے بولنے پر کچھ اور نقشہ بنجائیگا ہَم۔ تُم۔ کے کہنے پر کوئی اور صورت ہوگی اگر صرف ہیئت یا شکل مُنہ ہی کی سے بولے ہوئے الفاظ لکھے جائیں تو اُن کی شکل اور اُنکی ہیئت تحریری بھی ایسی ہی ہوگی جیسے اب لکھنے میں آتی ہے یہ بات صرف کسی ایک زبان ہی سے مخصوص نہیں ہر زبان سے مختص [1] ہے ٭

[1] مثلاً جب انگریزی میں آئی۔ یو۔ ڈُو۔ مِی۔ وائی بولوگے تو لکھنے کے وقت اُنکی شکلیں بھی اُن اشکال سے ایک نسبت رکھیں گی جو بولنے کے وقت بولنے والے کے مُنہ کی بنتی ہیں۔ ... بھی
اس سے ثابت ہوا کہ تجوید اور تقریر میں ایک نسبت اور مشابہت ہوتی ہے جو دایرے حروف اور الفاظ کے تحریر میں بنائے گئے ہیں وہی دایرے بولنے کے وقت بھی انسان کے اشکال ... سے ظاہر ہوتے اور بنتے ہیں۔ منہ

الفاظ کیا ہیں

الفاظ چند حرکات اور چند حروف کا مجموعہ ہیں - کوئی کم اور کوئی بیش انسان کے منہ سے جب کوئی کلمہ نکلتا ہے - تو وہ ایک لفظ ہی ہوتا ہے - چاہے بے معنی حرف ہی نکلے - جب تم الف اور ب کہو گے تو وہ بھی ایک لفظ ہی ہو گا - کوئی ایسا کلمہ نہیں نکلتا - جو لفظ کی ترکیب اور صورت نہ رکھتا ہو علیٰ ہٰذا القیاس جب دوسرے حیوانات یا دوسری کائنات کے بعض عناصر سے بحالت تصادم و تضارب کوئی آواز نکلتی ہے تو وہ بھی لفظ ہی کی شکل رکھتی ہے - انسان جو کچھ بولتا ہے - وہ بھی ہر حالت میں لفظ ہی کہے جائینگے - بعض دفعہ یہ شبہ گذرتا ہے - کہ ہمارے منہہ اور زبان سے بعض الفاظ مثلاً - آ - با - تا - آو - آئی - آئین - اور آؤں جو نکلتے ہیں - یہ الفاظ نہیں ہیں یہ غلط ہے - یہ بھی لفظ ہی ہیں - لفظ کے معنے جب منہہ سے نکلنے کے ہیں تو انہیں بھی لفظ ہی کہا جائیگا - کیونکہ ایسے الفاظ بھی منہہ ہی سے نکلتے ہیں -

البتہ جب تحریری رنگ میں لائے جائینگے تو حروف شمار ہونگے - دیکھو آ - ب - ت تلفظ میں الف - با - تا ہونگے - جو مرکب ہیں اور لکھنے میں یہ حروف ہیں +

وضع الفاظ

یہ ایک بڑا اہم سوال ہے - کہ

"الفاظ وضع کس طرح ہوئے -

"کس طرح حضرت انسان اس توضیع پر کامیاب ہُوا۔
"کس ضرورت اور کس چیز نے انسان کو اس پر آمادہ کیا۔
ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب انسان نے ہوش سنبھالا تو اُس وقت الفاظ کی گٹھڑی اس کے پہلو میں رکھّی ہوئی تھی۔ یا اُسکے گرد وپیش الفاظ کا ذخیرہ موجود تھا۔ یا مختلف اشیاء اور مواد پر اُن کا نام کندہ تھا۔ ہر شئے اور ہر کائنات انسان کے سامنے بغیر کسی نام کے پیش کی گئی ہے قدرت نے بظاہر کوئی شئے ہمارے سامنے کسی نام سے پیش نہیں کی ہے۔ ہر شئے اور ہر کائنات اپنے اپنے دائرہ میں بے نام ہی دامن ہستی میں مستور ہو کر وجود پذیر ہوتی ہے۔ یہ بار انسانی ذہانت اور انسانی قابلیّت پر ہی رکھّا گیا تھا۔ کہ رفتہ رفتہ وہ اپنے اردگرد کی اشیاء اور کائنات سے واقف ہو کر اُن کے نام رکھّے اور اُن کی کیفیّات سے آشنا ہو یہ جُدا بات ہے کہ قدرت کے دفتروں میں اُن کے کچھ نام ہوں قدرت کا یہ بڑا فیض ہے کہ انسان ہی کے حصّے بخرے میں یہ فضیلت آئی ہے۔ اور انسان ہی اس کے قابل سمجھا گیا۔ انسان نے جب اپنے گرد وپیش انواع و اقسام کے سامان مناظر اور تحریکات سُنیں اور دیکھیں تو اُسکی اکثر طبیعت ایک گھبراہٹ اور مخمصہ میں پڑ گئی۔
اُس کے نوآموز دل و دماغ میں ایک غلجان سا ہونے لگا۔ اُس نے اپنے اردگرد دیکھا تو اُس کا ان بکھرے حالات میں کوئی بھی مونس وغمگسار نہ تھا۔ اُس نے ہر پہلو سے خود کو ایک بیکسی اور تنہائی میں پایا۔ اس نے جدھر نظر اٹھائی ہُو کا عالم ہی دیکھا۔ اسکی آنکھیں حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں لیکن کوئی راز سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اسکی

کانوں میں سمندروں دریاؤں ہواؤں اور آندھیوں کا حیرت افزا شور و غل سنائی دیتا تھا۔ لیکن اُن کی بابت اُسے کوئی نہیں بتاتا تھا کہ وہ کیا شے ہیں۔ چاروں طرف طیور و پرند اپنی اپنی بولیوں میں قدرت کے گن گا رہے تھے۔ انسان نہیں جانتا تھا۔ اور نہ اسکی سمجھ میں کچھ آتا تھا۔ کہ اُن کا نام اور ان کی حقیقت کیا ہے۔ چرند اور درند بھی اسیطرح اُس کے انجان دل کے واسطے یاس افزا تھے آسمان کے ستارے سیارے سورج چاند اس کو اور بھی رہ رہ کر پریشان اور حیران کرتے تھے۔ زمین کا ایک لمبا فرش اور چوڑی صف گو اس کے واسطے ایک حد تک آرام دِہ چیز تھی لیکن وہ یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اس میں قدرت نے کیا کچھ بھر رکھا ہے اور اُسکی حقیقت کیا ہے۔ وہ ان حیرت افزا حالات میں تسلّی کا کوئی ذریعہ نہیں پاتا تھا۔ ہاں اس کے اندرونہ سے اُسے کبھی کبھی یہ دل خوش آواز آتی تھی۔

"حیران اور پریشان نہ ہو میں ہی ان تمام گتھیوں کو رفتہ رفتہ سلجھاؤنگی"۔

"قدرت نے مجھے اسیواسطے تیرے اندرونہ اور تیرے قابو میں رکھا ہے کہ میں ضرورت پر تیرے کام آسکوں"۔

"استقلال اور بُردباری سے غور کریں تیرے ساتھ ہوں"

یہ وہ حوصلہ افزا الفاظ تھے جن سے انسان کی شکستہ کمر بندھ گئی۔ اور وہ ایک استقلال اور بُردباری سے اپنی قابلیت سے کام لینے لگا۔ بچوں کی طرح اُس نے اپنے اندرونہ میں سے بہت سی آوازیں اور الفاظ نکالے جو شے جو سماں اسکے سامنے آیا اُس نے اُس کی کوئی نہ کوئی تعبیر کی

اور اُس کا کوئی نہ کوئی نام رکھا جو ضرورت اُسے پڑی اُس کے حل کرنے میں ایک معتد بہ حصّہ لیا - ہر چیز اور ہر کیفیّت جو اُسے دکھائی دی - اسکی دریافت اور ادراک پر اُس نے حتی الامکان زور دیا جس کا اثر یہ ہُوا کہ رفتہ رفتہ اس کے دامنِ آرزو میں چند الفاظ اور مختصات کے جواہر جمع ہوتے گئے - اگرچہ یہ جواہر ناتراشیدہ اور کچھ بے ڈولے سے تھے - لیکن ضروریات کے اعتبار سے اس وقت اُن کی قیمت بہت بڑھ چڑھ کر تھی - اسکو اِس کامیابی سے یقین ہو گیا کہ اُس نے جو بنیاد رکھی ہے - وہ رفتہ رفتہ بلند و بالا ہوتی جائیگی - اور اس کی رفعت اور شان کسی روز آسمان سے باتیں کریگی -

جتنی چیزیں اور جتنی کیفیّتیں اس کے سامنے آئیں - اُس نے اُن کا کچھ نہ کچھ نام رکھدیا - جب اس کی ذریات بڑھی تو اُس نے بھی وہی راہ اختیار کی اور اپنے مورث کی پیروی میں بڑھتی گئی یہ کچھ ضرورت نہ تھی - کہ انسان کے منہہ سے یکساں الفاظ ہی نکلیں بھانت بھانت کے الفاظ نکلے اور مختلف قالبوں میں ڈھلتے رہے - قابلیّت لفّاظی کے سوائے انسان کی طبیعت میں قدرت نے ایک اور صفت صرّاف اور نقادی بھی ودیعت کر رکھی تھی - جو لفظ خوبصورت خوش آیند معلوم ہوئے وہ استعمال میں آنے لگے جو مقبوح اور ناخوش آیند تھے وہ رفتہ رفتہ ترک ہوتے گئے - چنانچہ یہ طریقہ اور چھان بین اب تک جاری ہے - صدہا متروکات ایسے ہیں جو کسی زمانہ میں بولے جاتے تھے وہی رہنے پائے جو سماعت اور تلفظ میں خوش آیند اور خوشنما تھے - جن میں ثقل تھا - اور جو کھردرے تھے - وہ رفتہ رفتہ خود ہی اپنی ہستی چھوڑتے

گئے۔ زبان میں بھی تنازع للبقاء کی لڑائی ہوتی ہے۔ وہی الفاظ وہی جملے اور وہی فقرات داوی السنہ میں باقی رہ سکتے ہیں۔ جو باعتبار اپنی خوبیوں اور متانت کے رہنے کے قابل ہیں۔ اور اہل زبان جن کا رکھنا لسانی ضروریات کے واسطے ضروری خیال کرتے ہیں۔

جو الفاظ اس معیار پر پورے نہیں اترتے وہ رفتہ رفتہ اپنی اپنی جگہ یا اپنی ہستی چھوڑتے جاتے ہیں۔ بجائے اُن کے وہ الفاظ ملفوظ اور مستعمل ہوتے ہیں جو اس تنازع للبقاء میں بازی لے جاتے ہیں۔ یہ معیار رفتہ رفتہ قائم ہوتا رہتا ہے۔ اور ہر صدی میں اس کی کتر بیونت ہوتی رہتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں۔ عربی۔ فارسی۔ اور انگریزی و اردو وہ نہیں ہے۔ جو ایک صدی پہلے تھی پرانی کتابوں کی عبارتیں بہت کچھ موجودہ زبانوں کے سامنے قریباً اجنبی معلوم ہوتی ہیں۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے۔ کہ زبانوں کی رفتہ رفتہ کانٹ چھانٹ ہوتی رہتی ہے اور ارتقائی اصول کے ماتحت زبانیں یا تو ترقی کرتی جاتی ہیں اور یا انحطاطی صدمہ سے رفتہ رفتہ کمزور اور معدوم ہوتی جاتی ہیں۔

معیارِ توضیعِ الفاظ

مندرجہ ذیل طریق پر رفتہ رفتہ الفاظ کی توضیع عمل میں آتی گئی۔

(الف) ایک شئے دیکھی اور اس کا نام رکھ دیا گیا۔

(ب) ایک کیفیت سُنی اس کو کوئی نام دیا گیا۔

(ج) ایک واقعہ گذرا اور اسکے یاد رکھنے کے واسطے کوئی نشان مقرر کیا گیا یا کوئی اور سبیل اختیار کی گئی۔

(د) ایک ضرورت کا پتہ کیا گیا۔ اور اس کا نام رکھا گیا۔
(ہ) ایک خیال دل میں پیدا ہوا اور اسے کسی زیور نام سے مزین کیا گیا۔

مثلاً سردی اور گرمی کی وجہ سے انسان کو کپڑے کی ضرورت پڑی جو کپڑا تیار کیا گیا۔ اس کا کوئی نہ کوئی مثلاً کرتہ پگڑی پاجامہ وغیرہ نام رکھا گیا۔ یا پہلے ایک نام رکھا اور پھر اس کی اصلاح ہوتی گئی۔ یہ سوال کیا جائے گا۔ کہ کس معیار کے مطابق ایسے نام رکھے گئے یا ایسے الفاظ کی توضیع عمل میں آئی۔

میری رائے میں ہر ایک قسم کے معیار حسب ذیل ہو سکتے ہیں:۔

(۱) من جہت اشکال اشیاء
(۲) من جہت عمل اشیاء
(۳) من جہت خصوصیت اشیاء
(۴) من جہت صدائے اشیاء
(۵) من جہت نسبت اشیاء
(۶) من جہت خاصیت اشیاء
(۷) من جہت نوعیت اشیاء
(۸) من جہت اثمار اشیاء
(۹) من جہت ذائقہ اشیاء
(۱۰) من جہت تاثرات اشیاء
(۱۱) من جہت تصرفات اشیاء
(۱۲) من جہت حقیقت اشیاء

(۱۳) من جہت مجاز

(۱۴) من جہت انتقال

(۱۵) من جہت تبادلہ

اسی قسم کے اور چند اقسام بھی قیاس کر لو۔ فارسی میں پانی کو آب کہتے ہیں آب کے معنے چمک کے بھی ہیں۔ چونکہ پانی میں بھی ایک قسم کی چمک ہوتی ہے۔ اسیواسطے پانی کا نام آب رکھا گیا۔ آب کے معنی تیزی اور کاٹ کے بھی ہیں۔ چونکہ پانی میں بھی ایک قسم کی تیزی آب اور کاٹ ہوتی ہے اسی واسطے اُسے آب کہا گیا ہے۔ جب فارسی دانوں نے اُسے پہلے پہل دیکھا تو اس کی چمک اور تیزی سے اُن کے دل و دماغ میں ایک قسم کے خیالات کا ہجوم ہوا۔ اس ہجوم خیالات سے اُن کا ذہن اس مرحلہ پر پہنچا کہ اس شئے یا اس سیال مادہ کا نام آب رکھا جائے۔ رفتہ رفتہ یہ سیال چیز بنام آب ہی مشہور ہو گئی۔

آبرو کے معنی عزّت کے ہیں۔ یہ ایک مرکّب لفظ ہے۔ جو آب اور رُو سے مرکب ہے آب کے معنے چمک کے اور رُو کے معنے مُنہ۔ یعنی مُنہ کی عزّت چونکہ عزّت اور احترام کا پہلا عکس منہ ہی پر پڑتا ہے۔ اور بشرہ بھی دل کے خیالات کا مترجم ہے۔ اسیواسطے آب اور رُو کے مرکّب سے یہ مراد لی گئی۔

آبگینہ بھی دو لفظوں سے مرکّب ہے۔ آب اور گینہ سے اسیطرح آبشار۔ اور آبنائے۔ بھی دو دو لفظوں سے مرکّب ہیں۔ ان کی ترکیب باعتبار عمل کے ہوئی ہے۔ آفتاب کا نام آفتاب باعتبار تاثرات کے پڑا ہے۔ اور نیز اِس وجہ سے بھی کہ وہ چمکتا اور درخشاں ہے۔

پنجابی زبان میں ہُدہُد کو (چکی راہ) کہتے ہیں اس کی چونچ اُس آلہ سے ہُو بہو مناسبت رکھتی ہے۔ جس سے چکی کے پتھر کھردرے کیے جاتے ہیں۔
اسی طرح سے ایک اور جانور بھی ہے جس کو پنجابی زبان میں (ٹوکا) کہتے ہیں۔ یہ جانور ہمیشہ اپنی چونچ سے درختوں کو چیرتا رہتا ہے۔ اور اُس کی آواز ٹک ٹک سی ہوتی ہے۔ اس مناسبت سے اسکو ٹوکا کے نام سے موسوم کیا گیا۔ زمینداروں کے ایک آلہ کا نام بھی ٹوکا ہے۔ چونکہ اُس سے گھاس ٹکڑے ٹکڑے کیا جاتا ہے اسی واسطے وہ ٹوکا سے موسوم ہُوا۔
طائر کو طائر اور جانور کو جانور اسی واسطے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ اڑتے ہیں اور جاندار بھی ہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے انہیں ان ناموں سے موسوم کیا گیا۔
ہندسہ کو ہندسہ اسیواسطے کہتے ہیں کہ وہ مُلکِ ہند سے نکلا ہے یا ہند سے منسوب ہے۔ مروحہ پنکھے کو کہتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت امیرؔ فرماتے ہیں ؎

کیا خاک ہو امید کمینوں سے عیش کی
کب مروحہ بنا پرِ زاغ سیاہ کا

چونکہ اس سے ایک قسم کی راحت نصیب ہوتی ہے۔ اسی واسطے مروحہ کے نام سے تعبیر کیا گیا۔
ہندی میں پنکھے کو اسی واسطے پپنکا کہتے ہیں۔ کہ پون کے معنی ہیں ہوا کے۔ کہا کے معنے کھانے۔ حاصل کرنے اور پانے کے ہیں۔
چونکہ اس سے ہوا ملتی اور لگتی ہے۔ اسی واسطے اس کا نام مجازاً پھینکا

رکھا گیا۔

الفاظ کی دوسری دو قسمیں اور بھی ہیں۔

(الف) مفرد۔

(ب) مرکّب

مفرد وہ الفاظ ہیں جو دو لفظوں سے مرکّب ہو کر ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ اور

مرکّب وہ الفاظ ہیں جو دو یا تین چار الفاظ سے ترکیب پا کر معنے دیتے ہیں۔ زبان عربی ایک ایسی زبان ہے جسمیں مرکبات کا بہت ہی کم ذخیرہ ہے۔ اکثر حصّہ الفاظ کا مفرد ہے۔ اسی طرح جو دوسری زبانیں مثلاً سنسکرت وغیرہ کلاسیکل زبانیں ہیں اُن کا بھی تقریباً یہی حال ہے جو زبانیں دوسری زبانوں کے الفاظ سے ترکیب یافتہ ہیں جن کا سرمایہ عموماً دوسری زبانوں سے آیا ہے۔ اُن میں مرکبات بہت ہیں۔ جیسا کہ اردو زبان چونکہ یہ زبان کئی ایک زبانوں سے مرکّب ہے۔ اسواسطے اس میں مرکبات کی کثرت ہے۔ اس میں سوائے اسکے کوئی اور نقص نہیں ہے کہ۔ زبان کا طول اور ذاتی وسعت اب تک محدود ہے۔ بیشک یہ زبان اُن زبانوں میں سے نہیں ہے۔ جو پرانی اور قدیمی زبانیں ہیں۔ اور جو اُن نسلوں کی یادگار ہیں۔ جو دور دراز زمانوں میں گذر چکی ہیں۔ لیکن یہ ترقی کی ایک خاص قوت رکھتی ہے۔ اور وسیع الظرف ہو سکتی ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسانوں کے مُنہوں اور زبانوں سے اِس وقت تک ہر ایک زبان میں کس قدر الفاظ نکل چکے ہیں۔ اور اُن کا کس قدر حصّہ ترک ہو کر مدّ متروکات میں داخل ہو چکا ہے۔ اور کسقدر چھانٹ کے

بعد ہماری بول چال میں آچکا ہے - لغات اور ڈکشنریاں یہ تو کسی حد تک بتا سکتی ہیں کہ فلاں زبان میں اسقدر الفاظ استعمال میں آتے ہیں - لیکن لغات اور ڈکشنریاں یہ نہیں بتا سکتیں کہ اصل ذخیرہ اس قدر تھا - جسکا بقیہ یہ رہ گیا ہے -

اردو زبان اگرچہ ایک نئی زبان ہے - لیکن چونکہ یہ چند زبانوں مثلاً سنسکرت - بھاشا - فارسی - عربی - اور انگریزی سے وقت بوقت مدد لیتی ہے - اور تقریباً پہلی چار زبانوں سے اسکی بنیاد بھی پڑی ہے اسواسطے یہ پیشگوئی کوئی بیجا نہ ہوگی - کہ کسی وقت باوجود اس کے کہ خطہ ہندوستان میں اور چند زبانیں بھی پہلو بہ پہلو مختلف رنگوں میں بولی جاتی ہیں - اُسکا ستارہ چمکے گا - اور یہ ہندوستان کی ایک مشترکہ زبان کا درجہ حاصل کر کے رہے گی - گو کہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بھی اُس کے ساتھ ہی ساتھ ترقی پذیر ہونگی - مگر موجودہ حالات کہ رہے ہیں - کہ اسمیں ایک خصوصیت ضروری ہے - اور ہندوستان کی موجودہ اقوام کی یہ ایک مشترکہ زبان ہے -

انسان زبان بناتا ہی یا سیکھتا ہے

یہ وہ دلچسپ سوال ہے جو اکثر علمی مجلسوں میں زبان یا زبانوں کے متعلق پیش ہوتا یا پیش کیا جاتا ہے - میرے خیال میں ملکہ وہبی کے ماتحت بہ مجوائے وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

(الف) انسان زبان بناتا بھی ہے -

(ب) اور سیکھتا بھی ہے -

اس وقت دنیا میں جسقدر زبانیں پائی جاتی ہیں - یا بولی جاتی ہیں - اُن کی دو قسمیں ہیں :-

(۱) وہ زبانیں جو بنائی گئی ہیں۔

(۲) وہ زبانیں جو اور زبانوں سے ترکیب دی گئیں۔

یہ قرار دینا کہ شروع دنیا میں کونسی زبان تھی بڑا پیچیدہ سوال ہے۔ اور اس جواب کے دینے کے واسطے ہم اس وقت تیار نہیں ہیں لیکن یہ کہا جائیگا۔ کہ جسطرح شروع میں سب انسانوں کا مورث صرف ایک ہی انسان تھا۔ اسی طرح سب زبانوں کا شروع بھی ایک زبان ہے۔ اور اسی زبان کی موجودہ زبانیں فروعات یا شاخیں ہیں۔

شروع شروع میں اس ملکہ اور اس قابلیت کے ماتحت جو قدرت انسان کے دل و دماغ میں ودیعت کر چکی تھی۔ زبان کی داغ بیل رفتہ رفتہ ڈلتی گئی۔ اور اس پر انسانی ضروریات کی ترقی اور تقاضہ کے ساتھ زبان بھی مرتقی ہوتی گئی۔

وہ قابلیت اور وہ ملکہ جسے ہم زبان یا زبانوں کا موجد اور باعث قرار دیتے ہیں ایک فطری ملکہ ہے۔ جو اور ملکات انسانی کی طرح شروع خلقت انسان سے حصہ انسان میں آ رہا ہے۔ اگر اس سے اسلاف انسان کام لیتے تھے تو اب تک انکی ذریات بھی لیتی ہے۔ اس پیمانہ اور اس طریق پر نہ سہی جو اسلاف کا معمول تھا کسی اور طریق پر سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ملکہ اب تک معمول ہے اگرچہ ہمارے ہاتھوں میں کوئی ایسی ابتدائی تاریخ نہیں جو شروع ہی میں خود پہلے انسان نے لکھی ہو۔ لیکن ہم ایک وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ

انسان نے اپنے اسلاف کے مقابلہ میں رفتہ رفتہ جیسے ہر امر میں ترقی کی ہے ایسے ہی زبان میں بھی کی ہے۔ گو متفرق نسلوں کی وجہ سے پہلی زبان مختلف

صورتوں میں منفرد اور منتشر ہوتی گئی۔ مگر باوجود اس کے بھی ترقی ہر شعبہ میں ہوتی گئی۔

جب یہ بحث شروع کی جائے کہ انسان زبان یا زبانوں کا بانی ہے۔ یا کوئی اور طاقت۔ تو اس وقت یہ سوالات قابل بحث ہونگے۔

(۱) کیا کوئی تکوینی ملکہ انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔

(۲) وہ کس طرح عمل کرتا ہے۔ یا اُسکے عمل سے کیا مراد ہے۔

(۳) زبان یا زبانیں بنیں کیطرح

(۴) اتفاقیہ بن گئیں۔

(۵) یا رفتہ رفتہ انسان ہی اُن کا بانی ہوا۔

ہم ثابت کر سکتے ہیں اور ہمارا ضمیر اور ہمارا دماغ اسپر شاہد ہے کہ تکوینی ملکہ انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے۔ اور اسی کی بدولت انسان شروع میں تکوین الفاظ اور تدوین زبان کا بانی ہوا ہے۔

یہ ملکہ اسی طرح عمل پذیر ہے جسطرح اور قوتیں عمل کرتی ہیں۔ لیکن دوسری قوتوں اور اس ملکہ میں ایک فرق بھی ہے۔ دوسری قوتیں بطور القاء یا الہام کے کام نہیں دیتیں۔ اور یہ ملکہ تکوین الفاظ اور تدوین زبان میں بطور ایک القاء اور الہام کے کام دیتا ہے۔ اگر کبھی کبھی الہام کی صورت میں آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اور سننے والوں پر اُن کا فوری ہی اثر ہوتا ہے۔ تو اس ملکہ کی جانب سے ہی جو آوازیں آتی یا سنائی دیتی ہیں۔ وہ ایک خاموشی کے ساتھ انسان کے اندر وہ ہی سی دل و دماغ پر ایک ایسی ضرب لگاتی ہیں کہ جن سے انسان اپنے اندر ونے ہی سے بیساختہ یا کسی قدر تکلیف کے ساتھ الفاظ بناتا جاتا یا بولتا جاتا ہے

اگر الہام صحیح ہے۔ اور ہماری رائے میں صحیح ہے تو اُس کا ضمیر کے ذریعہ سے سُنائی دینا بہ نسبت اسکے کہ آواز سے سنائی دے زیادہ تر آسان محفوظ اور موثر ہے۔ ہم اگر کسی زبان کو الہامی کہینگے تو اسی رنگ اور اسی ٹون میں کہ وہ زبان بتحت عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا ضمیری آوازوں سے ترکیب دی گئی ہے۔ اور جو زبان بمقابلہ دوسری زبانوں کے۔

"حسن بیان -

"حسن استدلال -

"جامعیت الفاظ -

"حسن معانی -

"حسن تاثر -

"حسن متصرفات -

"حسن تعبیر -

"حسن اشتقاق - رکھتی ہے -

وہی زبان الہامی طبعی اور مکمّل کہی جائیگی - اور اس زبان کی نسبت یہ کہا جائے گا - کہ وہ ملکہ وحی کے تاثرات و تصرفات سے زیادہ تر قریب ہے - اس ملکہ اور اس قابلیت وہبی سے ہم انکار نہیں کر سکتے - اور یہ قابلیت بجائے خود ایک الہام اور القاء ہے -

یہ کہنا کہ کیا قدرت کی جانب سے کسی نے آواز دیکر فلاں زبان کے الفاظ کی تلقین کی ہے - ہماری رائے میں یہ ایک اور قیاس فضول ہے - ہماری رائے میں جسطرح ملکہ تخیل ایک فطری ملکہ ہوتا ہے - اسی طرح لسانی ملکہ بھی ایک فطری ملکہ ہے - اور یہ ہر ایک انسان کو دیا گیا ہے - ہاں اُسکے

مدارج اور تصرفات میں فرق ہے جسطرح انسانوں کے جذبات اور اذہان
میں فرق ہوتا ہے۔ اسیطرح اس ملک کے تصرفات اور تاثرات میں بھی فرق ہی
ہماری بحث اور بعض دیگر لوگوں کی بحث میں ملک کے تصرفات کی صورت
میں صرف یہ فرق ہوگا کہ ہم اس رنگ میں زبان یا زبانوں وہبی تعلیم اور
وہبی الہام کے ماتحت رکھتے ہیں۔ اور وہ براہ راست بعض زبانوں کو الہامی
کہتے ہیں۔ اور آگے چل کر ہم دونوں اس مرحلہ پر متفق ہو جاتے ہیں۔ کہ
دنیا کی کل فروعی اور منفرد زبانیں الہامی نہیں ہیں جسطرح الہام کے ماتحت
دیگر احکام کا صدور ہوتا ہے۔ اسی طرح ملک لسانی کے ماتحت السنہ منفردہ
نشوونما پاتی ہیں۔ اگرچہ کوئی ایسی تاریخ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔
جس سے ہم یہ استدلال یا یہ ثابت کر سکیں کہ

" زبان یا زبانیں اسطرح بنی ہیں۔

کیونکہ جب شروع شروع میں کسی ابتدائی زبان کی داغ بیل ڈالی گئی۔ تو
اس وقت حضرت انسان خود اپنی تاریخ لکھنے یا روایات جمع کرنے کے
قابل ہی نہ تھا۔ اور اسکے سوا اور کوئی ایسی ہستی اس کے اردگرد نہیں تھی
جو انسانی روایات اور تاریخ لکھنے پر قلم اٹھاتی صرف لے دے کر خود انسان
ہی ایک ایسی ہستی تھی۔ جو اپنی بابت کچھ کہہ سکتی تھی۔ یا لکھ سکتی تھی
یہ ثابت ہے کہ انسان ایک مدت کے بعد عرفی رنگ میں لکھنے پڑھنے
کے قابل ہوا۔

بایں حالات سوائے اسکے اور کوئی سبیل نہیں کہ موجودہ قرائن اور کیفیات
سے انسان کی ابتدائی روایات اور کیفیات لسانی سے ایک حد تک
استدلال کیا جائے۔

ہمیں اس بحث میں خصوصیت کے ساتھ بچوں کی حالت سے استدلال کی ایک بڑی حد تک ضرورت ہے۔ بچوں کی حالت اور کیفیت ایک بڑی حد تک انسان کی ابتدائی حرکات اور کیفیات کا ایک صحیح خیال اور نمونہ خیال کیا جا سکتی ہے۔ بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے۔ کسی زبان سے آشنا نہیں ہوتا تا وقتیکہ وہ رفتہ رفتہ آشنا نہ ہو یا آشنا نہ کیا جائے۔ اگر ایک ہندوستانی بچہ کسی یورپین خاندان میں رکھدیا جائے تو وہ بجائے ہندی زبان کے انگریزی۔ فرینچ۔ جرمن۔ اور یونانی زبان میں بات چیت کرنے لگے گا۔ اگرچہ اس کے ماں باپ اور اس کا خون ہندی ہوگا۔ لیکن اسکی زبان یورپین میں رہکر یورپین ہوگی۔ اس سے ثابت ہے کہ انسان کی اپنی زبان کوئی نہیں ہے جس ملک اور جس مقام میں وہ نشو و نما پائے گا۔ وہی اسکی زبان ہوگی۔

اور ساتھ ہی اسکے یہ بھی ثابت ہے کہ چاہے بچہ کسی نسل اور کسی ملک اور کسی خاندان میں رہے۔ اسکی طبعی زبان یا طبعی غوں غاں اور اوں آں وہی رہے گی۔ جو اسکی طبیعت کا ایک فطری خاصہ ہے۔ ایک ہندی خون کا بچہ بھی اسی رنگ میں غوں غاں اور اوں آں کرے گا۔ جیسے ایک انگریزی بچہ کرتا ہے۔ بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی فطری جوش میں غوں غاں کرنے لگتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اپنی بساط اور ذہن کے مطابق اشیا اور مناظر پیش آمدہ کے مختلف نام رکھتے ہیں اور اپنی ذہانت اور اپنے فطری ملکہ کا ثبوت دیتے ہیں۔ کبھی اشارات اور کنایات سے مطلب ظاہر کرتے ہیں اور کبھی غوں غاں اور اوں آں سے کبھی اُن کے ننھے ننھے منہ اور زبان سے اس قسم کے الفاظ بھی

نکل جاتے ہیں۔ جو ہماری ڈکشنریوں کی کسی ردیف میں بھی نہیں آتے اگرچہ
ان کی ترکیب قریباً اسی ابجد کے ماتحت ہوتی ہے جو ہم میں طبعی قانون
کے ماتحت معمولی ہے۔ لیکن الفاظ بالکل اجنبی اور نرالے ہوتے ہیں۔
ہاں بعض اوقات اُن اجنبی الفاظ کے سلسلہ میں بعض لفظ بامعنے بھی
نکل جاتے ہیں اور اُن کا نشان اور پتہ ہماری مختلف زبانوں کے کسی
نہ کسی ڈکشنری میں مل سکتا ہے۔ لیکن خود بچے ایسے الفاظ کی ہستی اور
معانی سے بالکل یا محض ناآشنا ہوتے ہیں۔ ہاں ماں باپ یا دایہ مزید
غور اور تجربہ سے ان الفاظ سے کچھ نہ کچھ نکال ہی لیتی ہے۔ اور بچوں
کا مطلب پورا ہو جاتا ہے۔

جیسے کہ ہم اوپر کسی موقعہ پر کہہ چکے ہیں کہ بچے لگاتار بھی بامعنے بے معنے
الفاظ بول سکتے ہیں اس سے اور نیز اس بات سے بھی کم بچے شروع ہی
سے خود بخود اپنی غوں غاں اور اوں آں کا کوئی نہ کوئی مفہوم رکھتے ہیں
ثابت ہوتا ہے۔ کہ

(الف) خدائے قدیر نے انسان کے دل و دماغ میں یہ ملکہ اور
یہ قابلیّت رکھی ہے کہ وہ تخلیق الفاظ پر قادر ہو سکے۔

(ب) اس قابلیت اس ملکہ وہبی کی طاقت اور زور سے انسان
اس پر قادر ہے۔

(ج) انسان ہی اس ملکہ وہبی یا قابلیّت کی وجہ سے زبان یا زبانوں
کا موجد یا بانی ہے۔

اگر ایسی قابلیت اور ایسا ملکہ انسان نہیں رکھتا تو پھر ایک نووارد بچہ
کیوں غوں غاں کرتا۔ اور کیوں ایک صغیر سن بچہ الفاظ رٹتا اور

بولتا جاتا ہے۔

یہ جدا بات ہے کہ بچوں کے منہ اور زبان سے جس قسم کے الفاظ نکلتے اور اطلاق پاتے ہیں۔ اُن کی بلحاظ معنوں اور مفہوم کے قیمت اور وقعت کیا کچھ ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرا سوال ہے۔ بحث اس میں ہے کہ بچے ایسے الفاظ بے ساختہ بول لیتے ہیں۔ یا نہیں۔ اور اُن کا بے علم اور ناپختہ دماغ ایسے الفاظ اپنے جوف میں سے نکال سکتا ہے۔ یا نہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ شاہد ہے کہ بچوں کو یہ طاقت حاصل ہے اور ان کی فطرت اور وہبی ملکہ اس کا باعث اور موجب ہے جس طرح ایک بھرے ہوئے اور لبالب چشمہ سے پانی خود بخود نکلتا اور اچھلتا ہے۔ یا جس طرح پانی ہمیشہ نشیب کی طرف جاتا ہے۔ اسی طرح چشمہ نطق و عین قابلیت وہبی میں سے بھی مختلف قسم کے الفاظ کا اخراج ہوتا رہتا ہے۔ بچوں کی زندہ اور معصوم شہادت ایسی نہیں کہ ہم اسے کوئی وقعت نہ دیں۔ اور اسکی کوئی قیمت نہ لگائیں۔ یہ شہادت ہمارے واسطے صدہا روایات اور تاریخوں سے زیادہ تر اقوی اور مستند ہے۔ یہ شہادت ہمیں اس منزل پر لے جاتی ہے۔ کہ جس سے یہ نظارہ ہو سکتا ہے۔ کہ شروع شروع میں اولین انسان کے اردگرد سوائے چند مناظر اور کیفیات صامتہ کے اور کیا تھا۔ انسان کے کانوں میں اس عالم تنہائی میں سوائے چند مختلف آوازوں۔ سنوں سناں کے اور کونسی آواز پڑ سکتی تھی۔ اور سوائے چند خوفناک حالات کے انسان کا اور کون مونس تھا۔ انسان ایک مدت تک ہو کے عالم میں رہا ہوگا۔ اور گرد و غبار کے طوفان مختلف مناظر کے اشارات۔ پانیوں کی تیز و تند موجیں۔ ہواؤں کی سائں سائں کے سوا اور کوئی منظر

ہی نہ ہوگا۔ اس حالت میں پہلے انسان یا آدم کے دل و دماغ پر جو کچھ
گذرتی ہوگی وہ اس کے دل وگردہ سے پوچھنی چاہئے۔ اور اس سے صرف
وہی واقف ہوسکتا ہے۔ باوجود ان سب مشکلات اور مایوسیوں کے بھی انسان
اس ملکہ وہبی سے خالی نہ تھا جسے ملکہ نطق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسوقت
ملکہ نکو ہیئی اور قوت ناطقہ بہ نسبت اپنی مابعدی ذریات کے کچھ اور ہی رنگ
رکھتی ہوگی۔ اس وقت ابوالبشر کو اس ملکہ اور اس قوت سے کام لینے کے
متعلق بہت سی مشکلات پیش آتی ہونگی۔ وہ ایک نووارد بچہ کی طرح
اٹک اٹک بولتا ہوگا۔ اور باوجود چند قسم کی مزاحمتوں کے بھی اس کے
دل میں سے اس پانی کی طرح جو روکنے سے رکتا نہیں یا جسے کوئی روک نہیں
سکتا تکلم اور نطق کی لہریں پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہونگی۔ پہلا انسان یا آدم
اس تموج نطق اور ان ناطقہ لہروں کے پھوٹنے سے اگرچہ کسی حد تک متشکلف
اور متحیر ہوگا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے وہ یہ بات جانکر خوش بھی ہوگا۔ کہ قدرت
نے صرف اسی کے دل میں جو سب سے پیچھے آیا ہے ایک [illegible] ایک
ایسا جذبہ ایک ایسا ملکہ اور ایک ایسی ناطقہ [illegible] بیت رکھدی ہے۔ جو نہ
[illegible] ذریات کے واسطے بھی ایک حجت
شرافت اور سند نجابت اور طرۂ امتیاز ثابت ہوگی اور کوئی دوسری مخلوق
کائنات بھر میں اس کا مقابلہ اس قابلیت میں نہیں کرسکے گی۔ قابلیت
وہبی اور ملکہ نکو ہیئی کے زور سے انسان مختلف رنگوں میں مادہ نطق سے
کام لیتا ہوگا۔ اور دوسری طرف اسکے گرد و پیش مختلف قسم کی کائنات
اور گوناگوں موجودات ہوگی اس کے دل و دماغ میں بھی بوقلموں خیالات
کا ہجوم ہوگا اور یہ صورت ہجوم اسکی قوت قابلیت اور مادہ نطق ان

خیالات کی تاویل اور تعبیر مختلف صورتوں پر کرنے کیواسطے اپنے اندر ایک
مجبوری اور ایک زور پاتا ہوگا۔ جب ہوا کا احساس اس کے دل و دماغ میں
پہلے پہل ہوا ہوگا۔ تو اسکی یہ پہلی کوشش ہوگی کہ طبعی قابلیت اور ملکہ نطق
کے زور سے اسے کسی نام سے تعبیر یا موسوم کرے۔ تاکہ آیندہ بولنے
میں گونہ سہولت ہو۔ دیکھو بچہ پیاس کے وقت کن مختلف ناموں سے
پانی مانگتا ہے۔ کوئی مم کہتا ہے۔ کوئی انا کوئی پا جب ماں بچہ کو کوئی
اور چیز دیدیتی ہے۔ تو وہ غصہ سے پھینک دیتا ہے۔ اس سے ظاہر
ہے کہ ننھا بچہ اپنے دل میں اپنے لفظ اور اپنی درخواست کا مطلب خوب
سمجھے ہوئے تھا۔ جب ماں پانی دیتی ہے۔ تو پیارا بچہ بڑی خوشی سے
پی لیتا ہے۔

یہی کیفیت پہلے بزرگ انسان کی تھی۔ یا ہوگی۔ احساس ضرورت پر اُسکے
منہ سے مختلف ضروریات اور مختلف جذبات کیوجہ سے اور نیز مختلف
اشیاء کو دیکھ کر مختلف الفاظ نکل جاتے ہونگے۔ اور بقاعدہ کلیہ اسکے
ذہن میں ان کا کوئی نہ کوئی مطلب اور مفہوم ہوگا۔

اکثر تعبیرات وہ بھول گیا ہوگا۔ اور اکثر اُسکے دماغ میں مرتسم رہیں
اکثر اشیاے کائنات کی تاویل مختلف الفاظ میں کی ہوگی۔ رفتہ رفتہ ایک
ذخیرہ تیار ہوتا گیا۔ اور جوں جوں اُن سے ضروریات بڑھتی گئیں وہ بھی انہی
الفاظ اور انہی تعبیرات سے آشنا ہوتی گئی۔ پہلے کچھ مدت تک اشارات
اور کنایات ہی سے کام لیا ہوگا۔ اور ابتدا لئے الفاظ ہی بطور اشارات
اور کنایات کے استعمال پاتے ہونگے۔ پھر نوبت تکلم اور تلفظ کی آگئی
دنیا میں چونکہ انسان کے سوائے اور کوئی مخلوق گویا اور ناطق نہیں ہے

اس واسطے کائنات اور اجزائے کائنات کے جسقدر نام اسوقت پائے جاتے ہیں۔ اُن کا رکھنے والا صرف انسان ہی ہے۔ انسان گویا خود ہی کوزہ اور اور خود ہی کوزہ گر ہے۔

اس ملکہ وہبی یا قدرت منطق اور قابلیت تکوینِ زبان کا ثبوت یونہی ہو سکتا ہے۔ کہ ہر انسان خود اپنی ہی ذات پر یہ آزمائش کر سکتا ہے۔ کہ وہ ہر شے اور ہر کیفیت کو کسی نہ کسی جدید نام سے موسوم کرنے پر قادر ہے وہ اپنی اس قابلیت کے ذریعہ سے ایک ہی منٹ میں بیسیوں مہمل اور تابع مہمل اور با معنے الفاظ بول جاتا ہے اسکی زبان سے صدہا ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ جو اگرچہ ان کا بہت سا حصہ با معنے تو نہیں ہوتا مگر وہ دائرہ الفاظ سے خارج بھی نہیں ہوتے۔ اگر کوئی چاہے تو ایسے الفاظ کی ایک اچھی لمبی فہرست تیار کر سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی اسکے یہ بھی کہ اگر وہ ان کے معانی مقرر کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے۔ کہ وہ فوراً ہی الفاظ سابقہ کی فہرست میں شامل نہ ہو سکیں۔ اور ایسے الفاظ ہر زبان میں ہر کوئی خواندہ ناخواندہ وضع کر سکتا اور بول سکتا ہے۔ ہندوستان میں اب بھی چند بولیاں سرسری زرزری۔ فرفری وغیرہ ایسی ہیں کہ زائد حروف لگا کر لوگ انہیں بولتے ہیں۔ جب ہمارے مورثوں اور اسلاف میں تحقیق الفاظ کا مادہ موجود تھا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ انکی ذریات میں یہ قابلیت اور یہ ملکہ نہ پایا جائے۔

اب ہم تمثیلاً چند جملے اور فقرات مقابلتاً ایسے لکھتے ہیں۔ جو اس وقت کسی زبان کا جزو مستعمل نہیں ہیں۔ یا یہ کہ بے معنی جملے ہیں۔ لیکن وہ ملکہ تکوینی کے ماتحت بنائے گئے ہیں۔ اور ان کے معانی بھی مقرر کر لئے گئے ہیں۔

جیسے کہ لفظ وار ان کے تحت لکھے گئے ہیں - اس سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں - کہ ملکہ نکوبی کی دسترس کہاں تک ہے -

نمبر	جملہ مستعملہ	جملہ جدید
۱	تمہارا نام کیا ہی	ٹا - مانو - کاری تمہارا - نام - کیا ہے
۲	میرا نام زید ہے	سا - مانو - بے - زید میرا نام ہے زید
۳	فوراً جاؤ	ٹرہ - ٹاؤ - فوراً - جاؤ
۴	مہربانی کرو	فا - مانی کرو - مہربانی
۵	کام کرو	فا - کسٹو کرو - کام
۶	سو جاؤ	گیپ سو جاؤ
۷	نام بتاؤ	مانو - فائی - نام بتاؤ -

ان ہی الفاظ سے ان کے دیگر متصرّفات اور مرکّبات بھی بنائے جا سکتے ہیں - اور اگر یہی الفاظ رفتہ رفتہ بول چال اور کتابت میں آتے رہیں تو کسی روز اور الفاظ کی طرح ان کی بھی کھپت ہو جائیگی یہ الفاظ کچھ سوچ

اور غور کے بعد نہیں لکھے گئے۔ بلکہ ایسے ہی جیسے کہ مستعمل الفاظ روزمرہ لکھے جاتے ہیں۔ اور ایسے ہی لکھے گئے ہیں۔ جیسے کہ پہلے سے یاد اور ازبر ہوں۔ صرف ایک تخصیص معانی کر دی گئی ہے۔ اس سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ ابتک انسان اس وہبی کے ماتحت تخصیص الفاظ پر قادر ہے۔ اور اسکی یہ قدرت ایک فطری قدرت ہے جو اسی پر ختم بھی ہو جاتی ہے۔ اور اسی سے شروع بھی ہوتی ہے۔ قدرت نے کسی اور مخلوق کو اس میں حصّہ بجز نہیں دیا ہے +

خدا نے زبان سکھائی اور انسان نے بنائی

جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ بمصداق عَلَّمَهُ الْبَیَان خدا نے انسان کو زبان سکھائی۔ تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ خدا نے کسی مکتب اور مدرسہ میں انسان کو رکھکر زبان سکھائی یا الفاظ الہام کے ذریعہ سے اُنہی شکلوں اور ہیئتوں میں اسپر نازل ہوتے تھے جسطرح الہامی کتابیں انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوئی ہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایک قابلیت اور ایک ملکہ اس قسم کا دیا گیا۔ کہ جسکی امداد سے وہ زبان اور الفاظ زبان کے وضع کرنے اور بنانے پر قادر ہو گیا۔ اور اس کے اندر وفعہ ہیں سے اس قابلیت اور اس ملکہ کی قوت سے مختلف الفاظ بن بن کر نکلتے گئے۔

قدرت نے طبائع میں جو ایسا مواد رکھا ہے۔ وہ ضرورت پر کام دیتا ہے ضرورت کے احساس پر خود بخود طبائع سے الفاظ نکلتے رہے اور نکلتے رہینگے یہ بھی ایک قسم کا الہام ہی ہے۔ ہمیں اس قابلیت اور اس ملکہ کے

الہامی قرار دیتے ہیں۔ کوئی بھی تعذر اور تامّل نہیں ہو سکتا ہم اس امر سے بھی منکر نہیں کہ اللہ میاں بذریعہ الہام کے بھی زبان اور الفاظ زبان سکھا سکتا ہے۔ اور یہ حد امکان سے باہر نہیں کہ ایسا ہوا بھی ہو ہم بطور ایک کلیہ اور قدرت و فیض جاریہ کے یہ کہتے ہیں کہ در اصل انسان کی طبیعت میں ہی وضع الفاظ اور تکوین زبان کا ایک ملکہ اور ایک قابلیت رکھی گئی ہے۔ وہ قابلیت اور وہ الہام ایک الہام ہی ہے۔ الہام کی دو قسمیں ہیں ایک الہام لفظی۔ اور دوسرے الہام معنوی۔ یا وجدانی۔ عام طور پر دوسری قسم کا الہام زبانوں کے متعلق انسانوں کو ہوا ہے۔ اور اب بھی ہوتا ہے۔ شروع میں اسلاف انسان کو ہوتا تھا۔ اور اب بھی اسکی ذریات کو ہوتا ہے۔ یعنی ملکہ تکوینی اور قابلیت وضع الفاظ ہر شخص اور ہر انسان طبعاً رکھتا ہے۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ انسان نے زبان بنائی تو اس کا دوسرے الفاظ میں مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس ملکہ وہبی اور قابلیت فطری کے تحت ایک الہامی رنگ میں انسان کے دل میں الفاظ یا ترکیب الفاظ کا سالہ رکھا گیا۔ اور طبعی رنگ میں اسے الفاظ کا ایک ذخیرہ بخشا گیا۔ جو شروع سے لیکر اخیر تک اس کا ساتھ دے گا۔ اور اس میں ہرگز کمی نہیں آئیگی۔ اسلاف انسان نے بھی اس سے ایک حد تک کام لیا۔ اور اب بھی لیتے ہیں اور برابر لیتے رہینگے۔

انسان زبان بناتا ہے۔ اور زبان کا بانی ہے۔ لیکن شروع میں اُسنے ملکہ وہبی کی بدولت یہ دولت زبان حاصل کی اور خود اُس کے اپنے دل و دماغ سے الفاظ کا ذخیرہ نکلتا رہا۔ اور بہت کچھ اس نے اس میں طبعاً

اضافہ بھی کیا۔ بعدازاں جب ایک معتدبہ ذخیرہ اسلاف کی بدولت جمع
ہوگیا۔ تو پھر ضروریات کے ماتحت اس میں ترقی کرتا گیا۔ اور سیکھتا اور سکھاتا
رہا۔ پرانے ذخائر میں سے جدید ذخائر کی نوبت آئی اور بنیاد پڑی زبان
کی تصریفی تبدیلیوں کی وجہ سے اسمیں بہت کچھ ترقی ہوتی گئی۔ وہبی
ملکہ کے تحت الہامی رنگ میں انسان نے زبان بنائی اور خدا سے سیکھی
یا خدا نے سکھائی اور مادی رنگ میں انسان ذخائر سابقہ میں سے امداد
لیکر زبان کو ترقی دیتا رہا۔ اگر ہم اس بات کو مان بھی لیں کہ خدا نے لفظی
رنگ میں زبان سکھائی ہے۔ تو اس سے بھی ہماری تھیوری پر کوئی حرف نہیں
آسکتا۔ کیونکہ دونوں قیاسات میں صرف ایک تعبیری فرق ہے ہم اس
بات سے منکر نہیں ہیں کہ خدائے تعالیٰ لفظی یا قولی رنگ میں زبان
سکھا نہیں سکتا یا۔ اسطرح اس کا الہام نہیں ہوسکتا ہم اعتراف کرلیں گے
شاید شروع میں ایسا ہی ہوا ہو اور ایسا ہونا مشکل ہی نہیں ہے لیکن
جو رنگ فطری ہم پیش کرتے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ موثر اور واضح ہے
زید یہ کہتا ہے کہ مجھے جو ایک قسم کا کمال حاصل ہوا ہے۔ وہ ایک استاد
سے ایک اسکول میں رہ کر حاصل ہوا ہے۔ اور بکر یہ کہتا ہے۔ کہ جو کمال
اور جو ذہانت زید کو حاصل ہے وہ فطرتاً میری طبیعت میں ہی رکھدی
گئی ہے۔ مصنوعی حسن اور طبعی حسن میں جسطرح فرق ہوتا ہے اسی طرح
ان دونوں صورتوں میں بھی فرق ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ نبی ریاضت اور
محنت سے بنتا ہے۔ اور دوسرا شخص یہ کہتا ہے کہ نبی پیدائشی ہوتا ہے
ہر شخص باوجود محنت اور زہد و ریاضت کے بھی نبی نہیں ہوسکتا اسطرح
جب ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ

انسان فطرتاً زبان بنا سکتا ہے اور سیکھ سکتا ہے۔ تو یہ بہ نسبت اسکے زیادہ تر افضل ہے۔ کہ خدا نے انسان کی طبیعت میں توضیع زبان اور آموختِ زبان کا مادہ اور قابلیت یا ملکہ رکھدیا ہے۔ چاہے انسان سیکھے یا نہ سیکھے ہر حالت میں وہ اس طبعی ملکہ کی امداد سے وضع زبان اور وضع الفاظ کرسکتا ہے۔ ہاں ملکہ ملکہ میں فرق ہے کوئی ممتاز ملکہ رکھتا ہے۔ اور کوئی اُس سے کم کوئی محض معمولی اور کوئی غیر معمولی اور دوسروں سے اعلیٰ اور فایق تر ؛

آموختِ زبان کی وسعت

جیسے انسان زبان بناتا اور بنا سکتا ہے اور یہ ملکہ وہبی اسکو فطرتاً حاصل ہے۔ ایسے ہی وہ زبان سیکھتا بھی ہے اور اس وقت یہی صورت زیادہ تر ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بتدریج الفاظ بنتے اور بنائے بھی جاتے ہیں۔ لیکن اس کا علم اور اسکی شہرت بہت ہی کم ہوتی ہے۔ اور اس وقت اس کا علم ہوتا ہے جبکہ ایسے الفاظ تحریر اور تقریر میں رفتہ رفتہ جگہ لے لیتے ہیں۔ انسان جبر بنسل اور جس قوم میں پیدا ہوتا ہے صرف اسی کی زبان نہیں سیکھتا۔ بلکہ غیر السنہ بھی بآسانی سیکھ سکتا۔ اور ان میں بھی ایک کافی ملکہ پیدا کرسکتا ہے۔

انسان کوئی زبان سیکھکر بشرطیکہ عملی رنگ میں سیکھے اور حاصل کرے بہت کچھ ترقی بھی کرتا ہے۔ چنانچہ اس وقت تک مختلف زبانوں میں آموخت کے بعد جسقدر ترقیات ہوئی ہیں وہ بہت کچھ قدر ومنزلت کے قابل ہیں۔ مختلف قواعد اور ضوابط کے ماتحت زبانوں کا لانا اور مختلف ادبی ترقیات اس امر کا ثبوت ہے کہ انسان کا ملکہ تکوینی اور

قابلیت نہ صرف وضع زبان اور تخلیق الفاظ تک ہی محدود ہے۔ بلکہ دیگر اندرونی کمالات پیدا کرنے سے ہی وابستہ ہے۔ یہ کہنا کہ انسان صرف زبان سیکھتا ہی ہے بناتا نہیں یا اس میں بنانے کی قابلیت نہیں رکھی گئی ہے۔ ایک مغالطہ ہے۔ اگر صرف یہی تھا تو پھر اس کا جواب کیا ہوگا کہ شروع میں جب انسان پیدا ہوا تو کیا اس وقت زبان یا زبانیں اور ان کے الفاظ جڑی بوٹیوں اور درختوں کے پتوں اور ارد گرد کے پتھروں پر کندہ اور منقوش تھے یا جانوروں کی زبانی سن سنا کر انسان انہیں بولنے لگا ہے۔ یا انسان کے کان میں اسقدر الفاظ کوئی فرشتہ پھونک گیا تھا۔ نہیں نہیں انسان کو ملکہ ہی اس قسم کا دیا گیا ہے کہ وہ تخلیق الفاظ پر قادر ہو سکے اور یہ بھی ممکن ہے کہ شروع کے انسان یا انسا[illegible] یہ ملکہ خاص طور پر ایک وافر پیمانہ پر دیا گیا ہو اچھایوں یہی مانی ہو بہت سے الفاظ انسان کو ترکیبی صورتوں میں القاء اور الہام بھی ہوئے اور ان ہی سے انسان ترقی کرتا گیا۔ اس میں بھی کوئی استحالہ لازم نہیں آتا۔ کیونکہ قدرت یہ بھی قدرت رکھتی ہے۔

فطرت اور تدوین لسنہ

قدرت نے یہ بات انسان کی فطرت میں رکھدی ہے۔ کہ وہ اپنی آسائش کیواسطے مختلف طریقے نکالے زبان یا زبانوں کا بنانا یا تدوین اور تکوین بھی ایک فطرتی خاصہ ہے۔ چونکہ ایک طرف انسانی نسلیں دیگر ضروریات کے تحت رفتہ رفتہ جدا ہوتی اور دور دراز حصص ملک میں جا کر آباد ہوتی گئیں۔ جہاں کی آب و ہوا اور ماحول بھی جداگانہ

تھا۔ اور دوسری طرف فطرت کا پیمانہ اور ظہور بھی موقعہ بموقعہ اور مختلف تھا۔ اسی واسطے رفتہ رفتہ بہ اقتضائے فطرت و ضروریات کے اُن کی السنہ بھی مختلف ہوتی گئیں۔ اور اس خاصہ فطرت کے ماتحت زبانیں تدوین اور تکوین پاتی گئیں۔ فطرت کا ایک پہلو اضطراری بھی ہے۔ جسقدر اس وقت ماحول یا کرہ انسانی میں ترقیات اور نشو و نما پایا جاتا ہے۔ اُس کا ایک بڑا حصہ اضطراری رنگ کا اثر ہے جب کبھی فطرت میں اضطراری کیفیت پیدا ہوتی ہے تو فطرت مختلف پہلوؤں پر نظر کر کے اپنا راستہ آپ نکالتی ہے۔ اور وہ راہیں لیتی ہے۔ جو انسانی آسایش۔ ترقی اور تمدن کے واسطے لازمی اور مفید ہوں۔

چونکہ فطرت میں ملکہ تکوین۔ اور تدوین السنہ کا بھی رکھا گیا تھا۔ اور اسکی ضرورت بھی تھی اس واسطے رفتہ رفتہ زبانیں پیدا ہوتی گئیں۔ اور اُن میں ترقی بھی ہوتی گئی۔

تحقیق الفاظ او موجودگی اشیا

زبان کے تحت میں یہ بھی سوال اٹھایا جاتا ہے۔ کہ جب تک پہلے سے مواد اشیا اور مناظر نہ موجود ہوں تب تک انکی تعبیر اور تاویل کے واسطے الفاظ کی تخلیق کسطرح ہو سکتی ہے۔ یہ ایک بڑی حد تک درست ہے انسان کی پیدایش سے پہلے اس کے خیر مقدم کیلیے اور اسکی قوتوں اور اسکے جذبات اور ملکہ تکوینی کی خاطر اس کائنات میں ہزاروں اشیا اور مناظر خوان قدرت پر موجود اور مہیا کئے گئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی سے انسان کی قوت قابلیت ایجاد زبان اور ملکہ تکوینی کام کرنے کے

قابل ہوئی۔ جب انسان نے انہیں بوقلموں دیکھا تو وہ انکی تعبیر اور تاویل پر آمادہ ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ اپنے ملکات سے کام۔ لیکر انکا نام رکھکر آیندہ کیواسطے اُن کی تخصیص اور تشخیص کرتا گیا۔ اور اس سبیل یا اس طریق عمل سے مندرجہ ذیل صورتیں پیدا ہوتی گئیں۔

(الف) سب سے اوّل اس نے خارجی تاثرات اور بیرونی مناظر سے متاثر ہوکر مختلف رنگوں میں ملکۂ تکوینی کے زور سے مختلف آوازیں نکالیں۔ چونکہ انسان کی زبان اور اجزائے زبان زیادہ تر لچکدار ہیں اس واسطے اس میں مختلف آوازوں کے نکالنے کی نسبتاً زیادہ تر استعداد تھی۔ ایک طرف مناظر قدرت انسان کے اردگرد کثرت سے جمع تھے۔ اور دوسری طرف اس کا ملکۂ تکوینی متاثر ہوکر اس بات پر آمادہ تھا کہ ان مظاہر اور مناظر کا اظہار مختلف رنگوں میں ہوکر اسکی آیندہ رہبری اور آرائش کا موجب اور کفیل ہو۔ صوتی آلات سے ملکۂ تکوینی کو خصوصیّت سے مدد ملی اور رفتہ رفتہ یہ آوازیں ہی مختلف معانی اور مختلف مفاہیم کا پیش خیمہ بنتی گئیں۔

(ب) دوسرے انسان کے کانوں میں اپنے اردگرد سے جو مختلف آوازیں رفتہ رفتہ پہنچتی گئیں ان کی نقلیں انسان اتارتا گیا جیسی انجن کی آواز بھپ بھپ ڈھول کی آواز ڈم ڈم کتّے کی آواز بھوں بھوں وغیرہ وغیرہ ان بیرونی آوازوں سے انسان کی لسانی ڈکشنری میں رفتہ رفتہ مزید ترقّی ہوتی گئی۔

اور چونکہ یہ بیرونی آوازیں عموماً آپس میں متضاد ہیں۔ اس لئے

اُن آوازوں سے جو الفاظ ترتیب دیئے جاتے رہے ۔ اُن کی شکلیں بھی مختلف بنتی گئیں ۔

(ج) انسان کے مختلف جذبات اور مختلف طبعی مدّو جزر سے جو کچھ انسان کے دل و دماغ پر مختلف رنگوں میں احساس ہوتا رہا اُن سے مختلف آوازیں خارج ہو کر ان جذبات کے متضمن اور ہم شکل بنتی گئیں ۔ رفتہ رفتہ جن سے زبان کی بنیاد پڑتی گئی ۔ جیسے خوشی کے وقت آہا ہا ۔ غم کے وقت آہ وغیرہ وغیرہ الفاظ استعمال میں آتے ہیں ۔

(د) ان کے سوائے ایک اور صورت بھی ہے وہ یہ کہ انسان اُن تمام صور سے متاثر ہو کر اپنے اندرونہ میں سے ملکہ تکوینی کے صحت اور جدید ترکیبات کا مرتب ہو کر تجدید الفاظ پر قادر ہوتا گیا اور تصریفی رنگ میں ایک لفظ سے اور الفاظ کی بنیاد پڑتی گئی ۔ اور اسکے ساتھ ہی اُسنے نقل سے بھی بہت کچھ کام لیا ۔ اور رفتہ رفتہ یہ سب سے پچھلی صورت پہلی صورتوں پر فوقیت لے گئی ۔ اور اس سے وہ کام نکلا جو دوسری صورتوں سے بمشکل نکل سکا ۔

تکلّم و تخاطب

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبتک کوئی مخاطب نہیں ہوگا اس وقت تک کس طرح کوئی ایک دوسرے متکلم انسان کے الفاظ کا مطلب سمجھ سکتا ہے ۔ یعنی یہ کہ مخاطب کے واسطے یہ لازمی ہے کہ وہ متکلم

کے الفاظ سے واقف ہو یہ بالکل درست ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ
ایک متکلّم مخاطب کے دل و دماغ پر اپنا مطلب رفتہ رفتہ نقش نہ کر سکے۔ جب
ہم ایک نوزائیدہ بچّہ کی بات سمجھ لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ بعض اشارات سے بھی
مطلب نکال لیتے ہیں تو کیسطرح دور از قیاس ہے کہ پہلے انسان یا انسانوں
نے اپنے مخاطبین کو اپنے مطلب سے رفتہ رفتہ آگاہ اور آشنا کر دیا ہو۔ یہ
کہنا کہ انسانی زبان بننے کے واسطے یہ لازمی ہے کہ متکلّم اور مخاطب میں کسی
خاص آواز کے خاص مفہوم کی تمہید پہلے سے موجود ہے۔ صحیح نہیں۔ بچّہ
جو کچھ کہتا اور جو کچھ سُنتا ہے۔ کیا اسکی تمہید پہلے سے ہوتی ہے اور کیا
خود متکلّم اولین نے پہلے ہی سے کوئی تمہید ٹھان کر لی تھی یہ بات نہیں ایک
متکلّم یا متکلّم اولین نے چند تعبیرات کرنے کے بعد دوسروں کو بھی رفتہ رفتہ
اُن سے آشنا کر دیا جسطرح چڑیا اپنے بچوں کو رفتہ رفتہ زندگی کی ضروریات
سے واقف کر دیتی ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ پہلا متکلّم الفاظ کے معانی
سے اپنے مخاطب کو واقف کرنے کے سوائے خاموش رہتا۔ خود جن تعبیرات
سے وہ کام لے چکا تھا انہی سے ایک مخاطب بھی رفتہ رفتہ آشنا ہو گیا۔
اب بھی ہم جب کبھی اشاروں سے بات چیت کرتے ہیں تو اگر کوئی مخاطب
آسانی سے نہ سمجھے تو کسی اور طرح سمجھا دیتے ہیں۔ یہی صورت شروع
شروع میں پیش آئی ہوگی۔ اور یہ بھی کہ پھر ایسے مخاطبین نے ہی اور لوگوں
تک اپنے معلومات کی تبلیغ کی ہوگی۔

یہ کہنا کہ انسان ملکہ تکوینی کے ماتحت آئے دن جدید الفاظ کا اضافہ
کیسطرح کر سکتا ہے۔ ایک مغالطہ ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر اس قدر
صدہا نہیں بلکہ ہزاروں اور لاکھوں الفاظ کیا آسمان سے لٹکے ہیں

آخر یہ کیسطرح ہماری بول چال اور ڈکشنریوں میں آ گئے۔ اس طرح کہ رفتہ رفتہ لوگ بنانے سے کچھ اصولی رنگ میں اور کچھ تصریفی رنگ میں درصل ایسے خیالات اسی صورت میں سد راہ ہوتے ہیں کہ جب ہم یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ زبانوں میں جدید الفاظ کس طرح داخل ہوتے ہیں۔ اور کس طرح اور کس عرصہ میں اُن کی کھپت ہوتی ہے۔ کسی کمیٹی کے تقرر یا نشست سے کبھی کوئی جدید لفظ کسی زبان میں داخل نہیں ہوتا۔ بلکہ رفتہ رفتہ کوئی لفظ کوئی بناتا ہے اور کوئی کوئی۔ کبھی کبھی جاہلوں کی زبان سے بھی جدید الفاظ نکل جاتے ہیں۔ اور پھر انکی صحت اور درستی ہو کر زبان میں داخلہ پاتے ہیں۔ مدتوں خبر بھی نہیں ہوتی کہ کونسا لفظ زبان میں اضافہ ہوا ہے۔ رفتہ رفتہ ضبط تحریر اور تقریر میں کھپتا ہے۔ اور جب اسطرح داخلہ ہو جاتا ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ لفظ نیا نہیں ہے۔ بلکہ زبان کا اصلی یا پرانہ جزو ہے۔ یا اُن الفاظ میں سے ہے۔ جو قدیمی الفاظ کی لسٹ میں آتے ہیں۔

یہ بات اس تمثیل سے بہت اچھی طرح ثابت ہو سکتی ہے۔ کہ زبان غیر سے جب کوئی لفظ کسی دوسری زبان میں منتقل ہوتا ہے تو وہ بھی رفتہ رفتہ ہی اپنا احساس کراتا ہے۔ اور یہ پتہ بھی نہیں لگتا کہ کب وہ دخل ہوا اور کون اُس کا لانے والا تھا۔ اور کس ضرورت سے اس وقت اردو زبان میں جو چند انگریزی الفاظ داخل ہیں ان کی بابت کون کہہ سکتا ہے۔ کہ اُن کا داخلہ فلاں شخص کی معرفت ہوا۔ اور فلاں وقت اور یہ لفظ لسٹ جو لایا گیا ہے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ کب اور کس وقت اور کس کی معرفت اور کس ضرورت پر اردو میں داخلہ پا چکا ہے۔ جب ایسے الفاظ غیر زبان

کا پتہ نہیں لگتا - تو جدید الفاظ کا کون پتا لگا سکتا ہے۔

وسائل تکوین زبان

یہ الفاظ جو ہمارے منہ سے نکلتے جاتے ہیں - عام اس سے کہ با معنے ہوں - یا بےمعنے - اُن کا اصلی ذریعہ تو وہی تکوینی ملکہ ہے جو قدرت کی جانب سے انسان کی طبیعت اور ذہن میں ودیعت کیا گیا ہے - لیکن یہ تکوینی ملکہ جن وسائل سے مدد پاتا ہے - وہ تین ہیں :-

(الف) مرئیات -

(ب) محسوسات -

(ج) تخیلات -

جب ہم کوئی شے یا کوئی منظر دیکھتے ہیں - یا جب کبھی ہمیں مختلف قوتوں کے ماتحت کچھ محسوس ہوتا ہے - یا جب کبھی ہمارے دل و دماغ میں مختلف خیالات متموج ہوتے ہیں - تو ان تینوں حالتوں میں وہ ملکہ تکوینی جو قدرت کا عطیہ ہے - اپنے رنگ میں تاویل اور تعبیر کی کوشش کرتا ہے - اور جسطرح ایک ٹکسال سے مختلف قسم کے سکے بنکر نکلتے رہتے ہیں اسی طرح ذہن انسان سے بھی بذریعہ قوت ناطقہ کے مختلف الفاظ خارج ہوتے رہتے ہیں -

جب ہم ایک شے دیکھتے ہیں تو دیکھنے کے ساتھ ہی ہمارے دل و دماغ میں یہ خیال اٹھتا ہے - کہ یہ کیا شے ہے - اور اس کا کیا نام ہے - یا اسکی کس رنگ میں تعبیر ہوسکتی ہے - اگر اسکی نسبت ہمارے دماغ پر پہلے سے کوئی خیال اور کوئی نقشہ مرتسم ہے - تو ہم حافظہ کی امداد سے

اسکے مطابق اس کی تعبیر کرتے ہیں۔ اور اگر پہلے سے کوئی ایسا نقشہ دماغ میں مرتسم نہیں ہے۔ تو ہم اس کے واسطے اس کوشش میں لگ جاتے ہیں۔ کہ اس کا کوئی نام رکھا جائے۔ اور اسکی کوئی نہ کوئی تعبیر کی جائے۔

اسی طرح جب کسی احساس کی وجہ سے ہم کسی شے کا احساس کرتے ہیں خواہ وہ احساس سمعی ہو اور خواہ بصری اور خواہ کسی اور حاسہ کے ماتحت تو ہم فوراً ہی یہ سوچنے لگ جاتے ہیں کہ یہ کیا شے ہے یا کیا اور کیسی کیفیت ہے۔ اگر پہلے سے ہمارے دماغ میں کسی ایسی شے یا ایسی کیفیت کی بابت کوئی خیال مرکوز ہے۔ اور کوئی یادداشت ہمیں کچھ بتا سکتی ہے۔ تو ہم اس کے مطابق اسکی تاویل اور تعبیر کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسی سابقہ یادداشت نہیں ہوتی تو ہم کسی نہ کسی اور رنگ میں اسکی تعبیر کر لیتے ہیں۔

جب تخیلاتی رنگ میں کوئی خیال ہمارے اندرونہ سے اٹھتا ہے۔ تو ہم اسکی بھی یہی تاویل اور تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی بیرونی صور سے اسکی تطبیق کرتے ہیں اور کبھی وجدانی رنگ میں ہی اس کی بابت سوچتے اور رائے لگاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کسی نہ کسی پہلو سے اسکی تعبیر کر کے ایک بات بنا لیتے ہیں۔

ان ہر سہ صورتوں میں ہر ایک قسم کی تاویل یا تعبیر ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے۔ کہ خیالی تاویل اور تعبیر کے سوائے عملی رنگ میں اسکی تاویل اور تعبیر کی جائے وہ عملی تاویل وار تعبیر کیا ہے تکوین الفاظ۔

کوئی سی صورت ہو جب ہمارے منہ اور زبان سے کسی منظر یا کسی شئے دیکھنے کے بعد کوئی کلمہ نکلے گا تو وہ لفظ ہی ہوگا۔ چاہے مفرد ہو چاہے مرکب چاہے بامعنے ہو اور چاہے بےمعنے چاہے جامع ہو اور چاہے غیر جامع۔

ان تینوں صورتوں کے سوا کوئی اور ایسی صورت نہیں ہے - کہ جس کے ذریعہ سے تخلیق الفاظ ہو سکے -

تمام قسم کے مرئیات محسوسات اور تخیلات ایک منظر اور ایک سامان پیش کر کے خود الگ ہو جاتے ہیں - اس کے بعد یہ کام ملکہ تکوین کا ہے کہ ان کی تاویل اور تعبیر کرے - اور ان کی تاویل اور تعبیر سے اپنے اندرونہ سے ایسے ایسے الفاظ نکالے جو اسکی کاروباری زندگی میں ایک بڑی حد تک مدد دیں - یہ تمام قسم کے مناظر اور مظاہر جو ان ہر ستہ رنگوں میں مہیا ہوتے رہتے ہیں - انکی صورتیں کئی ایک قسم کی ہیں -

۱ کبھی مذہبی رنگ میں -

۲ کبھی تجارتی رنگ میں -

۳ کبھی تمدنی رنگ میں -

۴ کبھی اقتصادی رنگ میں -

۵ کبھی [illegible] رنگ میں -

اکثر الفاظ زبانوں میں مذاہب کے [illegible] سے آئے ہیں اور اکثر الفاظ تجارتی پہلو سے اور اکثر تمدنی اور اقتصادی رنگ میں اور اکثر سیاسی صورت میں دیکھو جہاں اقتصادیات نہیں ہیں یا جہاں کوئی مذہب نہیں ہے وہاں وہ الفاظ نہیں پائے جاوینگے جو اقتصادیات اور مذہبیات میں مستعمل ہیں - اسی طرح جہاں سیاسات کا زور نہیں وہاں وہ الفاظ نہیں پائے جاوینگے - جو عموماً سیاسات میں استعمال پاتے ہیں جس قوم میں قوانین سیاسی نہیں ہیں ان کے ہاں وہ اصطلاحات اور وہ طرزیں شاذونادر ہی پائی جاتی ہیں - جو سیاسی قوانین میں مستعمل ہوتی ہیں جن قوموں میں مذہب کی لاگ نہیں نہ تو

وہاں دوزخ و جنت کی کہانیاں ہیں۔ اور نہ عذاب و ثواب کی۔ نہ فرشتوں کا نام ہے اور نہ ملائک کروبیوں کا اس سے ثابت ہے کہ۔

زبان اسی صورت میں مختلف الفاظ کی مالک بنتی ہے جب اس میں مختلف علوم و فنون اور مختلف صورتیں انسانی زندگی کے پائی جائیں۔ ضرورت ہی پر زبانوں نے ترقی کی اور ضرورت کے احساس پر ہی زبانوں میں مختلف الفاظ بنے اور بنائے گئے۔ جہاں طب نہیں وہاں طبی اصطلاحیں کس طرح بنائی جا سکتی ہیں۔ جہاں تعلیم نہیں وہاں نصاب اور دستور العمل تعلیم کے نام سے کون آگاہ ہو سکتا ہے۔ یہ سب باتیں احساس کی صورت میں ہی پائی جاتی ہیں۔

اگر شاعری نہ ہوتی تو نظم۔ عروض۔ قافیہ۔ ردیف وغیرہ الفاظ ان اصطلاحی معانی میں نہ ہوتے جو اس وقت مستعمل ہیں۔ اسی طرح اور شاخیں بھی لے لو۔ یہ سب الفاظ جو اس وقت مختلف صورتوں اور مختلف معانی و تاویلات و تعبیرات کے ماتحت پائے جاتے ہیں یہ سب کے سب مختلف مقاصد اور کاروبار انسانی کا اثر ہیں جس قوم کا تمدن ابتدائی یا کم زور ہوتا ہے۔ اس میں تمدنی الفاظ بھی مختصر اور معمولی ہی ہوتے ہیں۔ جب تک بعض قوموں میں صرف مٹی کے دیا (چراغ) ہی سے کام چلایا جاتا رہا۔ اس وقت تک انکی زبان میں ہریکین کا .... لفظ نہیں آیا تھا۔ جب معمولی اور موٹا کپڑا پہنا اور بنایا جاتا تھا تو اس وقت تک کپڑوں کے یہ نام نہیں تھے جو اب ہیں۔ جب ٹرین نہیں تھی تو ان معنوں میں ٹرین کا لفظ بھی نہیں تھا۔

اس قوم اور اس ملک کی زبان ترقی پاتی اور ٹکسالی ہوتی ہے جس کی کاروبار

زندگی اور وجدانی زندگی بہت کچھ دور جانے کی کوشش میں رہتی ہے۔ اپاہج اور سست و کاہل قوموں کی زبانیں ہمیشہ چند الفاظ پر ہی ختم ہو جاتی ہیں۔ اور وہی اُن کا سرمایہ ہوتا ہے۔ دنیا میں اس وقت بھی بعض زبانیں باوجودیکہ بعض قوموں یا حصہ قوموں میں وہ ایک حد تک بولی جاتی ہیں۔ ایسی ہیں کہ جن کا ذخیرہ الفاظ بہت ہی محدود اور ناکافی ہے۔ اُنکی زندگی کے کارنامے چند الفاظ کے ہیر پھیر میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔

الفاظ کے تاثرات

ہر زبان اپنے الفاظ ہی کی وجہ سے ترقی یافتہ کہلاتی ہے۔ اور کثرت الفاظ ہی کی وجہ سے ایک جامع زبان کہی جا سکتی ہے۔ الفاظ نرے معانی ہی نہیں دیتے یا صرف ان کے معانی ہی سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ علمی اور عملی الفاظ سے قوموں کی حیثیت وقار عزت و احترام فارغ البالی نیکی اور برائی وغیرہ وغیرہ امور پر ہی روشنی پڑتی ہے۔ جو قومیں ترقی یافتہ نہیں ہیں اُنکی زبانوں کے الفاظ بھی کم موثر کم کیف کم جاذب اور کم جامع ہوتے ہیں یا یہ کہ جو قومیں ترقی یافتہ نہیں ہیں اُن کی زبان کے الفاظ میں بھی کوئی عمدگی اور کوئی خصوصیت نہیں ہوتی اُنکی زبانیں اور اُنکی زبانوں کے الفاظ نہ تو جامع ہوتے ہیں اور نہ ان کا پیمانہ اور وسعت اس قدر اور ایسی ہوتی ہے۔ جو ایک نوخیز زبان کے لئے لازمی ہے۔ اور جس پر ایسی زبان کے شمول ادبی پر استدلال ہو سکتا ہے۔

وسعت ملکۂ تکوین زبان

یہ ملکہ تکوین زبان اور یہ قابلیت ایجاد لسان جو قدرت نے انسان کے حصہ بخرہ اور فطرت میں رکھی ہے - یہ کسی قوم سے خاص نہیں یہ فیضان شروع میں اس انسان اور اس مورث کو ہوا جو نسل انسانی کا مورث اور شروع ہے - اور اسی کی بدولت یہ دولت ورثتاً دوسروں کو بھی ملی اور زبان بعد اسی طرح اس میں بھی حتی المقدور فیضان قدرت ہر ایک نسل اور ہر ایک فرد کو اس کا حصہ دار بنایا گیا -

جس طرح دوسری قوتوں اور دوسرے جذبات میں فرق ہے - اسی طرح اس میں بھی فرق ہے - یا فرق ہوتا گیا -

جس طرح بہ نقطہ خیال قرآنی فلسفہ کے ہر ایک قوم میں ہادی بھیجا گیا ہے اور کوئی خطہ اس سے خالی نہیں رہا - اسی طرح اس الہام اور اس ملکہ سے بھی کوئی قوم اور کوئی نسل خالی نہیں رہی -

ہر نسل اور ہر ذریات خوان عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا سے حسب قسمت اور حسب لیاقت و استعداد فائدہ اٹھاتی اور اپنا حصہ لیتی ہے - یہ وہ خوان عام ہے جس سے کوئی فرد انسان محروم نہیں رہا - ہاں یہ کہ سکتے ہیں کہ جس طرح اور امور میں قوموں کے جذبات اور قوتوں کے اندر تفاوت اور امتیاز یا کمی و بیشی ہے - اسی طرح اس میں بھی گونہ فرق ہے - بمصداق فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ یہ کوئی انوکھی بات نہیں -

یہ کہنا کہ یہ ملکہ صرف کسی ایک قوم کو بھی عطا ہوا تھا - یا عطا ہوا ہے ایک مسامحت ہے - ہر قوم اس مزرعہ کی خوشہ چین ہے - اور ہر فرد یہ ملکہ اپنے

اندر رکھتا ہے۔ اور ہر قوم نے اس سے کام لیا اور لے رہی ہے۔ زبانوں کی ترقی اور حسن ترقی کا یہی ملکہ موجب ہے۔ اور اسی پہ ادبی دنیا کی امید کا مدار ہے اور یہی قابلیت طرۂ نطق انسانی ہے اور یہی موجب شرافت آدم ہے۔

حروف اور الفاظ کی شکل

حروف اور الفاظ کی شکل اور ہیئت ذہن ہی میں بنتی ہے۔ مثلاً فقرہ (تم کہہ دو) جب ہم بولتے ہیں تو پہلے اسکے کہ یہ فقرہ ہماری زبان اور ہمارے منہہ سے نکلے ذہن ہی میں اسکی شکل خیالاً بن جاوے گی۔ اور اسکے ساتھ ہی منہہ میں اسی شکل کا خاکہ اتر آئے گا۔ اگر ہم حرف شناس ہیں تو بولنے کے ساتھ ہی ہمیں اس ترکیبی ہیئت کا علم بھی ہو جاوے گا۔ جو لوگ خواندہ نہیں ہیں اگر خواندہ ہوتے تو وہ بھی خواندوں کی طرح سمجھ جاتے۔

تحریر میں وہی صورتیں مرتسم ہوتی ہیں جو منہہ اور زبان سے نکلتی ہیں کوئی ترقیمی صورت ایسی نہیں ہے جو ہیئت لسانی اور شکل دہانی کے خلاف صفحۂ قرطاس پہ صورت پذیر ہو سکے۔ یہ سوال کہ جو اشکال ذہن اور منہہ میں مرتسم یا متشکل ہوتی ہیں شروع ہی سے ذہن نشیں ہیں۔ یا ذہن ہی ان کا موجد ہے۔ یا ذہن ہی میں ایسا ارتسام کسی خارجی وجہ سے ہوتا ہے بجواب اس کے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ۔

الفاظ کا ذخیرہ تو انسان کی طبیعت ہی میں مودعہ تھا۔ یعنی تکوین الفاظ کا ملکہ قدرتاً شروع ہی سے اُسے حاصل ہے۔ جب اس ذخیرہ میں سے کچھ حصہ وُجود پذیر ہوا یا وجود پذیر ہونے لگا تو اسکی ترکیب اور تالیف

ان قواعد ترتیبی اور ضوابط اطلاعی کے ماتحت عمل میں آئی کہ جو ضرورت اور تجربہ سے مناسب اور موزون قرار پاتے تھے ایسی ترکیب اور تالیف کو کہ اذہان اور طبائع و ملکات تکوینی ہی کے ماتحت عمل میں آتی ہے۔

لیکن پھر بھی اس کا وجود خارجی اس ذخیرہ الفاظ یا مواد الفاظ سے جداگانہ ہوتا ہے۔ جو فطرتاً انسان کی طبیعت میں مودع ہے۔ مثلاً۔ الفاظ مادر۔ ام ٭ برادر۔ بھائی ٭ خواہر۔ بہن کا تکوینی مواد یا تکوینی تخیل ملکاتی رنگ میں انسان کی طبیعت میں ہی موجود تھا ضرورت کے احساس پر ان کا ظہور ہوا منہ سے لفظ (مادر) نکلتے ہی وہ ہیئت جن میں اب یہ لفظ لکھا جاتا ہے ذہن میں فطرتاً موجود نہیں تھی زبان سے خارج ہونے یا تلفظ کے بعد صورت پذیر ہوئی ہے۔

یا یوں کہیے کہ یہ ہیئت بالقوۃ ذہن اور طبیعت میں مرتسم اور موجود تھی اور چند حیات زندگی کے ماتحت رفتہ رفتہ فعل میں لائی گئی بالقوہ اشکال کا ثبوت اس طور پر دیا جا سکتا ہے۔ کہ جب ہم ذہنی طور پر اشکال الفاظ کا دھیان کرتے ہیں۔ تو ہمیں ایک خاص رنگ میں ایسے اشکال کا احساس یا ادراک ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ واضح تو نہیں ہوتا مگر کچھ نہ کچھ ہوتا ضرور ہے مثلاً جب ہم ۔کو۔ کا۔ ہوں۔ ہاں بولتے ہیں تو حرکات فہمی یا حرکات دہانی سے ہم سمجھ سکتے ہیں یا ایک قسم کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان الفاظ کی شکلیں موکس یا رسم تحریر میں کیسی اتریںگی۔ اگر ہم "تلفظ" کے ساتھ ہی ان الفاظ کی شکلیں بھی بنا دیں تو قریباً ویسی ہی اشکال بنینگی۔ جیسے اب یہ الفاظ لکھے جاتے ہیں شاید سرسری طور پر یہ بات سمجھ میں نہ آسکے ناظرین ذرا مزید غور اور توجہ سے سوچینگے تو معلوم ہو سکے گا کہ تلفظ کی

ساتھ ہی کچھ نہ کچھ شکل بھی بنتی جاتی ہے - الفاظ کی جسقدر ہیئات بنتی ہیں یا بنائی جاتی ہیں خواہ اذہان ہیں اور خواہ رسم تحریر کے اندر وہ ہمیشہ آوازوں کی مطابق ہوتی ہیں۔ حیطہ یا دائرہ۔ آواز سے باہر نہیں جاتی ہیں - مثلاً (اگر اور مگر) کی شکل وہی ہے جو آواز میں منکشف ہے - جب ہم (اگر اور مگر) بولتے ہیں - تو ان دونوں آوازوں کا ایک دائرہ ہوتا ہے - اگر کے تین جزو ہیں (ا - گ - ر) یہ تینوں جزو جدا جدا مخرج رکھتے ہیں - ہر مخرج کی ایک جداگانہ آواز ہے اور ہر آواز ایک جداگانہ دائرہ - چکر اور شکل رکھتی ہے - اگر ان مختلف شکلوں کا خاکہ اتارا جائے تو جس طرح کانوں میں آوازیں جداگانہ اپنے اپنے رنگ میں سننے میں آتی ہیں - اسی طرح ان کی کیفیت بھی ہوگی -

الفاظ پر بھی موقوف نہیں -

حروف کی بھی جدا جدا شکلیں بنتی جاتی ہیں -

الف - ب - جم - د - س - ش - جیسی جداگانہ آوازیں ہیں ایسی ہی انکی شکلیں بھی ہیں - جو اشکال رسم تحریر میں لائی جاتی ہیں - اگر اُن کا اشکال تلفظیہ یا اشکال دوائر صدائیہ سے مقابلہ کیا جائے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ ان دونوں میں ایک قسم کی مشابہت ہے - الف کی شکل ۲ جزو رکھتی ہے (ال اور ف) ذرا ان دونوں کا تلفظ کر کے دیکھو اس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا - کہ ان دونوں کی شکل سوائے الف کے اور کچھ بن بھی نہیں سکتی اسی طرح انگریزی ابجد کا حرف (A) بھی ہے مشق کر کے ذرا دیکھو تو معلوم ہو سکے گا - کہ تلفظ کے ساتھ ہی ایک شکل سی بھی بنتی جاتی ہے +

———

اشکالِ کائناتی اور الفاظ

جب انسان کی ہستی اس کائنات بوقلموں میں اپنے وقت پر وجود پذیر ہوئی تو اس کی خلقت سے پہلے بھی قدرت اسکی خاطر کائنات کا بہت سا حصہ اور سامان قدرت پیدا کر چکی تھی یا پیدا ہو چکا تھا۔ انسان نے آنکھ کھولتے ہی خود کو ایک ایسی حالت اور ایسے ماحول میں پایا جس میں اسکی ضروریات زندگی کیواسطے تقریباً ہر ایک شے موجود تھی اُسے یہ سب سامان دیکھ کر یہ فکر اور یہ گھبراہٹ ہوئی کہ یہ اشیا کیا ہیں اور اُن کا نام اور ان کی غرض کیا ہے۔ شروع میں یہی گھبراہٹ اور یہی فکر اسکی تکلیف کا باعث تھی جس طرف نظر کی اور جس چیز پر نگاہ پڑی اور جدہر دھیان کیا ایک بے اندازہ سامان اور بوقلموں ذخیرہ سامنے آگیا ساتھ ہی اُسکے یہ بھی حیرت ہوئی کہ کسی شے پر اسکی تعریف اسکی خاصیت اس کی غرض اور اس کا نام لکھا ہوا نہیں تھا۔ سب چیزیں بلا نام اور بلا کیفیت ہی تھیں اور زیادہ تر یہ حیرت تھی کہ ہمسایہ مخلوق میں سے بھی کوئی فرد خلقت اُسے بتانے والی نہ تھی۔ گو ہر شے اور ہر خلقت اُسے اپنی زبان حال سے اپنی جانب بلاتی تھی۔ اور دعوت دیتی تھی۔ اور مختلف رنگوں میں خیر مقدم پر آمادہ تھی۔ مگر یہ توقع نہ تھی کہ اس اجنبی کی حیرت کو بھی کوئی دور کر سکے۔ بایں حالات حضرت انسان شروع میں ایسا ہی تھا۔ جیسے وہ مسافر جو ایک ایسے ملک اور ایک ایسی قوم میں چلا جاوے جو وہاں کی زبان اور رسم طلاقت سے محض ناواقف ہے۔ اور اُسکے سامنے وہ سامان اور وہ چیزیں پیش کی جاتی ہیں جن کو دیکھکر وہ للچاتا تو ضرور ہے لیکن انکی کیفیت اور اُنکے نام سے محض نا آشنا ہے۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسے نووارد اور ناواقف شخص کی کیا کچھ حالات

اور کیا کچھ کیفیت ہوگی - اور اسکے واسطے کیسے اضطراب اور حیرت کا موقع ہوگا - ایسا انسان اس حالت میں اپنی طبیعت ہی کے زور سے ہی ہر ایک شئے اور ہر ایک سمان کی تاویل اور تعبیر کرنے کو مُقدّم سمجھے گا - اور جہانتک اُس کا قیاس اور اجتہاد کام دے گا - اس سے کام لے گا -

بایںحالات ایسا انسان مضطرب اور متحیّر ہوکر پیش آمدہ - سامان اور اشیاء کا اپنی سمجھ کے موافق نام رکھے گا - اور اُنکی حقیقت کچھ نہ کچھ قرار دینے پر زور دے گا - اور اپنے ارد گرد کے حالات سے کچھ نہ کچھ استدلال اور استنباط کریگا اور مختلف تاویلات تعبیرات سے کام لینے کی ٹھیرائے گا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسی حالت میں اُسکے منہ اور زبان سے بیساختہ مختلف قسم کے الفاظ نکلنے جائینگے -

یہی صورت شروع میں انسان اوّل کی بھی ہوگی یا اُن انسانوں کی جو انسانیت کے شروع زمانوں میں تھے - ایسے انسان یا ایسے انسانوں نے جب اپنی ارد گرد بوقلموں سامان اور ذخیرہ اشیاء مخلوقات پایا تو وہ گھبرائے کہ انکی کیا کچھ تاویل اور تعبیر ہوسکتی ہے - اور انہیں کس کس نام سے تعبیر کریں - کیونکہ حضرت انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے کہ -

جس شے اور جس سمان کو وہ اپنے ارد گرد دیکھتا اور پاتا ہے - اُسے وہ کسی نہ کسی رنگ میں مخاطب کرنا چاہتا ہے - یا اُسکی کوئی نہ کوئی تاویل اور تعبیر کرتا ہے انسان کی طبیعت ایسے وقت تفحص اور ادراک سے رُک کر خاموشی پسند نہیں کرتی جب شروع شروع میں انسان نے اپنے ارد گرد بہت کچھ دیکھا تو اُسکی طبیعت میں جو کچھ آیا تعبیر کی . . . . . .

اور جو کچھ اس وقت اسکی سمجھ میں آیا اُس ملکہ تکوینی کے ماتحت

جو قدرتاً اُسے حاصل تھا اشیاء اور کیفیات کا نام رکھدیا۔
مثلاً جب اس نے ارد گرد مٹی ہی مٹی دیکھی۔ اور اسکو یہ پتہ نہ لگا۔ کہ صحیفہ قدرت میں اس کا نام کیا ہے تو وہ حیران ہُوا اور سوچتے سوچتے ملکہ تکوینی کی امداد سے تعبیری رنگ میں اسکے منہ سے لفظ مٹی کا نکل گیا۔ چاہے یہ لفظ مٹی کی شکل وہیئت اور کیفیت کے مطابق تھا۔ اور چاہے کسی اور خصوصیت سے رفتہ رفتہ یہی لفظ مٹی کے واسطے موزون۔ اور معنے خیز سمجھا جانے لگا۔ جب انسان نے اس مٹی میں سے مختلف پودے نکلتے اور پھوٹتے دیکھے تو اس نے اپنی زبان میں ان کا نام پودہ یا درخت رکھدیا اور بات چیت میں ان سے وہی مراد لی رفتہ رفتہ یہی شہرت پا گئے۔
چونکہ قدرت نے کسی شئے اور کسی مولود کا نام نہیں رکھا تھا۔ یا ہمیں صحیفہ قدرت کے ان اوراق اور ان صفحات کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا۔ جن میں اشیار کے نام مندرج ہیں اس واسطے ملکہ تکوینی کے ماتحت یہ خدمت انسان کے ذمہ ہمت یہ ہی رکھی گئی۔

؎ ایں قرعہ فال بنام انساں بزدند

اور اس کی فطرت میں یہ ڈالا گیا۔ کہ اسکے ارد گرد جو کچھ پایا جاتا ہے وہی انکی تعبیر اور تاویل کرے۔ اور وہی ان کے نام بھی رکھے اور وہی اُن سے کام بھی لے۔ وہ ملکہ اس صورت میں کام آیا جس کا اشارہ آیت کریمہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا میں کیا گیا ہے۔
انسان کے سامنے وقتاً فوقتاً جو جو اشیار آتے رہے۔ اور جن جن ہستیوں سے اُسے سابقہ پڑا وہ اُنکی تعبیر اپنی سمجھ کے مطابق کسی نہ کسی نہج پر کرتا رہا یہاں تک کہ اُن اشیار کے اکثر حصّوں سے وہ اس رنگ

میں واقف ہو گیا۔ کسی گروہ انسان نے اپنے مذاق کے مطابق کچھ تعبیر کی اور کچھ نام دھر دیا اور کسی گروہ نے کچھ ہندوستان والوں نے ایک چیز اور ایک ترکیب کا نام روٹی رکھدیا اور فارس والوں نے اُسے نان کہا۔ عربیوں نے خُبز۔ اور انگلستان والوں نے بریڈ کے نام سے تعبیر کی گو اشکال کسی حد تک اس چیز کی مختلف ہوں لیکن غرض اور حقیقت ایک ہی تھی اور اوجود اس کے لسانی تعبیرات مختلف کی جاتی ہیں۔ اگر اب کوی ان سب اسما ئے مشمولہ کے خلاف کوئی اور نام رکھدے اور اُن ہی ناموں کی طرح اس کی بھی شہرت ہو جائے اور لوگ بھی اُسے اس مفہوم میں استعمال کریں تو وہ بھی ایک صحیح تعبیر یا ایک صحیح لفظ سمجھا جائے گا۔ اور وہ بھی ایک باضابطہ نشان کے معنوں میں استعمال ہوگا۔

دیکھو جب کسی غیر ملک غیر زبان کے لوگ کسی اور اجنبی خطہ میں جاتے ہیں تو جب وہ اس ملک اور اس خطہ میں بعض ایسے اشیاء دیکھتے ہیں جو ان کے ملک میں نہیں ہوتے یا انہیں اس سے اوّل اُن کے دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا تو وہ ایسے اشیاء کی ضرور اپنے اپنے رنگ میں کوئی نہ کوئی تعبیر کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی ان کا نام بھی رکھ ہی لیتے ہیں۔ اور اُن کے سرکل میں رفتہ رفتہ وہی نام مشہور بھی ہو جاتا ہے۔

مثلاً۔ جو لوگ شروع شروع میں افریقہ اور امریکہ کے ملکوں میں گئے تھے۔ وہاں انہوں نے جن جڑی بوٹیوں۔ اشیاء اور مقامات کو دیکھا اُن کا اُن کی ڈکشنری میں کوئی نام نہیں تھا۔ وہاں کچھ خلق خدا اس وقت تک بلا نام ہی پڑی تھی ایسے لوگوں نے اپنی سہولیت کاروباری زندگی کی آسایش کے واسطے ان اشیاء کے کچھ نہ کچھ نام رکھ ہی لیئے۔ یا یہ

کہ کسی نہ کسی رنگ میں ان کی تعبیر کی گئی اور اب ان ہی اسمار سے وہ اشیاء نامزد ہیں۔

اس سے یہ ثابت ہوا کہ موجودگی کائنات ہی کی وجہ سے اپنی نامزدگیاں ہوتی رہیں۔ جس طرح جب تک مسمّٰی نہ ہو تب تک کوئی نام رکھا نہیں جا سکتا اسی طرح جب تک اشیاء نہ ہوں اُن کی تعبیر نہیں کی جا سکتی۔ ایسے ہی اعمال اور افعال کے بھی نام رکھے گئے یا ان کی بھی مختلف پہلوؤں سے تعبیریں کی گئیں جس چیز سے فائدہ ہوا اُسے مفید کہا گیا۔ اور جو شے مضر نکلی وہ مضر ٹھہری۔

ہماری تمام زبانیں اور تمام علوم و فنون اور تمام اصطلاحات کائنات مختلف اشیار اور مختلف کیفیات ہی کا عکس اور ظل ہیں وہ ایک مواد ہے اور ہم اس کے معبّر اور مُوَلّف یا خوشہ چین ہیں۔

خدا نے انہیں ہماری خاطر بنایا۔ اور ہم نے ان کی مختلف رنگوں میں اپنے اپنے مذاق کے ماتحت تکوین ملکہ کی مدد سے تعبیر کی۔ اور اُن مختلف تعبیرات اور مختلف تسمیہ سے اقتصادی۔ تمدنی۔ اخلاقی اور سیاسی ضروریات کے چلانے کی خاصی سہولتیں پیدا ہوتی گئیں۔

زبان کی مادی حقیقت

زبان یا زبانوں کی عنصری قسمیں مندرجہ ذیل ہو سکتی ہیں۔

(الف) لفظی۔

(ب) معنوی۔

(ج) مادی

الفاظ حروف سے بنتے ہیں اور معانی کا استخراج ہر کلمہ حروف یا الفاظ سے

ہوتا ہے۔ چاہے کسی لفظ کے حقیقی معنے ہوں اور چاہے اعتباری اور نسبتی وکیفی وغیرہ سب کے سب حروف الفاظ ہی سے وابستہ اور مربوط ہوتے ہیں۔ اگر ایسی ترکیب توڑ دی جاوے تو وہ معنے باقی نہیں رہتے۔ جو اُس ترکیب سے مرسوم تھے۔ مثلاً اگر ہم قلب ـ ضمیر ـ تم ـ ہم ـ اور تمام الفاظ کی حروفی ترکیب توڑیں تو ان الفاظ کے مزعومہ یا معترفہ معانی باقی نہیں رہینگے اگر ان تراکیب کو اُلٹ دیں تو پھر بھی مزعومہ معانی باقی نہیں رہ سکتے ۔ مثلاً ہم لفظ قلب کے بڑے قاف کو چھوٹے کاف سے بدل دیں۔ یا قلب کو بہ ہیئت بلق الٹ دیں تو یہ معنے نہیں رہینگے۔ حروف کے ادل بدل حروف کے کمی بیشی حروف کے الٹ پلٹ سے معانی ہمیشہ بدل جاتے ہیں یا کچھ معنے ہی نہیں رہتے۔ ضمیر کو ریمض ـ مضیر ـ یضمر مضیر وغیرہ وغیرہ صورتوں میں الٹنے اور پڑھنے سے وہ معنی نہیں رہتے جو لفظ ضمیر سے منسوب ہیں۔ اور اگر حروف کی تبدیلی مناہجت املا بھی کی جاوے تب بھی مزعومہ معانی باقی نہیں رہ سکتے۔ مثلاً اگر ہم ضمیر ز سے یا ظ یا ذ سے لکھیں تو صورت ضمیر کی زمیر ظمیر ذمیر ہو جائیگی شاید ان الفاظ کے کسی نہ کسی زبان میں کوئی معنے ہوں مگر ضمیر کے معنے بایں صورت باقی نہیں رہینگے۔ چونکہ حروفی ترکیب کا زیادہ تر حصہ اعتباری ہوتا ہے۔ اس واسطے جب ایک ترکیبی اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ تو وہ معنے بھی باقی نہیں رہتے۔ املائی ترکیب یا تو اعتباری ہوتی ہے۔ اور یا ماتحت تلفظات مثلاً عین اور ق کا زبان عربی میں جسطرح اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح لفظ عین اور قاعدہ یا قول کا املا بھی ہے۔ جو الفاظ حلقوم سے نکلتے ہیں۔ اُن کے جزوی

مرکبات بھی حلقومی ہی ہوتے ہیں۔ جس زبان میں اطلاق حروف حلقومی آوازوں کے ماتحت ہے اُن میں یہ زیادہ تر التزام رہتا ہے۔ مثلاً زبان عربی اور سنسکرت میں ایسا التزام بالخصوص پایا جاتا ہے۔

تیسری قسم زبانوں کی مادی ہے۔ مادہ زبان یا مادہ الفاظ گو الفاظ اور معانی کی ہستی مادہ پر ہی موقوف ہوتی ہے۔ لیکن مادہ ہی ایک ایسا جزو السنہ اور جزو الفاظ ہے۔ کہ اسی سے ان کا ابتدائی یا اشتقاقی پتہ چلتا ہے جسطرح سب انسان میری رائے میں ایک ہی مورث اعلیٰ سے منسوب ہیں اسی طرح سب زبانیں ایک ہی مادہ کے ماتحت نشو ونما پا چکی ہیں یعنی شروع میں ابتدائی زبان یا موروثی زبان ایک ہی قسم کا چشمہ اور ایک ہی قسم کا مادہ رکھتی تھی۔ اسی سے ہر ایک زبان رفتہ رفتہ انسانی نسلوں کی تفرید و تفریق کی وجہ سے متفرد اور متضاد ہوتی گئی۔ اگر ہم غور سے مختلف السنہ کے الفاظ کا مصدر یا مشتق مقابلتاً دیکھینگے تو ہمیں پتہ لگ جائے گا۔ کہ ان سب کا یا ان میں سے اکثر کا مادہ ایک ہی تھا۔ دیکھو تمام زبانوں کی ابجدوں کا مادہ کسطرح ایک دوسرے سے مناسبت رکھتا ہے۔ ہر ایک زبان کی ابجد آپس میں نسبت تامہ رکھتی ہے۔ کیونکہ ابجدوں کا جو مخزن اور جو مصدر ہے وہ انسان ہی ہے۔ اور انسان باوجود اسقدر اختلافات کے ایک ہی ہے۔ تمام انسانوں کے وہ اعضا جو آوازوں۔ تکلم اور منطق کا وسیلہ ہیں عموماً ایک ہی کیفیت رکھتے ہیں اور اگر کچھ فرق ہے تو بہت نام یا بہت ہی کم۔ دیکھو قدرتی آوازیں۔

او - آ - آو - ابں - آں - ہیں - ہٰ - آہا - ہو - ھے - آہاہا - وغیرہ وغیرہ - جن سے بعض دوسرے الفاظ بھی ترکیب پاتے ہیں بشرق

اور مغرب میں ایک ہی قسم کا اطلاق رکھتی ہیں۔ یہی آوازیں مواد السنہ
اور مواد الفاظ ہیں۔ جب یہ کل زبانوں اور کل انسانوں میں متفقہ ہیں
تو یہ ماننا پڑے گا۔ کہ سب زبانیں ایرین اور سماطیقی ایک ہی ابتدائی
زبان کی شاخیں اور شعبہ ہیں۔ اوران سب کی طنابیں اسی ایک پہلی زبان
سے جاملتی ہیں۔ جو پہلے انسان کی طرح کل دنیا کی زبانوں کی ماں تھی۔
اور جسے ام الالسنہ کہتے ہیں بوجوہ یہ لازمی ہے کہ دنیا کی کل زبانوں
کی ابتدائی زبان ایک ہی ہو ٭

دنیا میں جس قدر زبانیں بولی جاتی اور علمی رنگ بھی رکھتی ہیں۔ ان
کی کوئی نہ کوئی صرف و نحو گرامر ہوتی ہے۔ ہر زبان کی گرامر میں کچھ نہ
کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ مشابہت ثابت کرتی ہے۔ کہ دنیا
کی سب زبانیں آپس میں کچھ نہ کچھ یا ابتدائی رشتہ اور وابستگی رکھتی ہیں
اور وہ سب کی سب ایک ہی چشمہ سے نکلی ہیں۔ موجودہ اختلافات اور
تباین جوان میں کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ یہ آب و ہوا اور تفرقہ کی وجہ
سے ہے۔ دیکھو صرف ہندوستان میں ہی کس قدر مختلف زبانیں ہیں
اوران سب کا آپس میں کیسا گہرا تعلق ہے۔ سمٹک زبانوں کو جو دنیا کی
دوسری زبانوں سے جدا کہا جاتا ہے۔ وہ صرف ایک اجتہادی خیال
ہے۔ ویاکرن ہر . . . .
زبان پہ غور کرنے سے پتہ لگتا ہے۔ کہ کسطرح اسکے قواعد اور قوانین

میں یک سوی پائی جاتی ہے - اگر زبانوں کا سرچشمہ شروع میں ایک ہی نہیں تھا - تو مختلف زبانوں کی وباکرن میں کیوں مشابہت تام پائی جاتی ہے - دیوناگری کے اکھشر یعنی حروف ان آوازوں پر منضبط ہیں جو انسان کے منہہ سے نکلتے ہیں - اگرچہ ایسا انضباط مشکل سے دوسری زبانوں کے حروف میں ملتا ہے - مگر اس سے یہ نتیجہ تو نکل سکتا ہے کہ کل زبانوں کے حروف کسی نہ کسی حد تک منہہ کی آوازوں کے نقش اطلاق پر ہی بنائے گئے ہیں - اور ان سب میں ایک قسم کی مشابہت بھی پائی جاتی ہے - اور یہی حروف کسی زبان کی ابتدا اور شروع بھی ہیں - اور اس میں سب زبانیں حصہ دار ہیں - اس سے ثابت ہی کہ دنیا کی کل زبانوں کا شروع ایک ہی ہے - اور ان سب میں ایک قسم کی لسانی مشابہت بھی پائی جاتی ہے - یا تو کسی ایک ہی مرکز اور موقعہ پر شروع میں شروع کی زبان کی داغ بیل ڈالی گئی - اور یا پہلی زبان کا بنانے والا اور دنیا کی مختلف قوموں کا مورث اعلیٰ ایک ہی تھا - دونو باتوں میں سے کوئی سی بات ہو - انہیں تسلیم کر کے یہ کہنا درست نہیں - کہ دنیا کی موجودہ زبانوں میں کوئی وابستگی نہیں ہے - یا ان سب زبانوں کا شروع کوئی ایک زبان نہیں تھی - یا سب انسانوں کا مورث ایک نہیں ہی اس وقت اقوام اور انسانوں کے حالات مقالات کیفیات اور زبانوں میں کیسا ہی اختلاف ہو شروع میں یہ سلسلہ ایک ہی تھا - بعد میں بیشک تفریق ہوتی گئی - مگر اس تفریق سے اجتماعی کیفیت بھی ثابت ہوتی ہے انسان خواہ کوئی بھی مورث اعلیٰ رکھتا ہو - اسکی انواع موجودہ میں ایک نہیں بیسیوں باتوں میں اتحاد اور یکسانیت پائی جاتی ہے -

نہ صرف اوضاع و اشکال میں ہی بلکہ خیالات ادراکات طرز تخیل طرز ادراک اور طرز ترقیات میں بھی کافی مشابہت پائی جاتی ہے سیمیٹک ایرین ۔ تاتاری ۔ اور تورانی ۔ وغیرہ وغیرہ تقسیمیں بعد کی اجتہادی صورتیں ہیں ۔ شروع میں ایک ہی صورت تھی ۔ تمدن ہند میں فرنچ مصنف کہتا ہے کہ

ہندوستان میں جاٹ قوم دراصل تاتاری خون اور نہ کی نسل میں سے ہے ۔ اگر یہ اجتہاد درست ہے تو دیکھو جاٹ نسل اور جاٹ قوم میں بوجہ تبدیلی سکونت اور مرور زمانہ کسقدر انقلاب آگیا ہے ۔ کہ وہ خود بھی خود کو تاتاری نسل سے کسی قدر تامل کے بعد ہی قرار دے سکتی ہے جب قوموں میں اس قدر بھاری تبدیلی ہو سکتی ہے ۔ تو زبانوں میں کیوں نہیں ہو سکتی ۔ فتدبر ۔

ہم مخرج اور ہم مادہ الفاظ اور زبانیں

عموماً تشخیص یا تحقیق زبانوں میں محققین السنہ اسبات پر زور دیتے ہیں کہ کس کس زبان کے اور کون کون سے الفاظ ہممخرج اور ہم مادہ ہیں ۔ اور کن کن الفاظ کی اشتقاقی صورتیں آپس میں ملتی ہیں ۔ یہ تحقیقات کا ایک اچھا طریقہ ہے ۔ لیکن بعض وقت اس میں اس قدر باریک بینی سے کام لیا جاتا ہے ۔ کہ بجائے یقین اور تسلی کے ایک قسم کا شبہ گذرتا ہے اور کہنا پڑتا ہے ۔ کہ خواہ مخواہ ایک ولولہ اور ایک تحقیقات کے ماتحت متضاد جوڑ ملائے جاتے ہیں ۔ اگر ہم اسبات کو مان لیں کہ تمام زبانوں موجودہ کی اصل زبان ایک ہی تھی ۔ جسکی یہ تمام فرعیں ہیں ۔ اور کل انسانی نسلیں ایک ہی مورث سے وابستہ ہیں تو اس ہم مخرج اور ہم مادگی کا بہت

سا جھگڑا اٹھ جاتا ہے۔

کُل زبانوں اور کُل الفاظ کے مخارج اور مواد حسب ذیل ہو سکتے ہیں۔

(۱) آوازیں۔

(۲) تخیلات۔

(۳) ادراکات۔

(۴) احساسات

(۵) حواس۔

(۶) موثرات۔

(۷) تغیرات۔

ان سب کے دہانے اور چشمے قریباً ایک ہی ہیں۔ اُن میں سوائے اسکے۔ کہ انواع جداگانہ ہیں۔ یا ان کی تعبیرات الگ الگ ہیں۔ اور کوئی فرق نہیں ہے۔ جب یہ سب ایک ہی چشمہ کی آبشاریں اور ایک ہی دریا کی نہریں ہیں۔ اور ایک ہی شجر کا ثمرہ تو پھر سرے ہی سے انہیں جداگانہ سمجھ لینا۔ خود تحقیقات کو دہندلا بنانا ہے۔ ہم مخرج اور ہم مادہ الفاظ کو مندرجہ ذیل صورتوں کے ماتحت بنایا اور قرار دیا جاتا ہے۔

(۱) مشارکت اشتقاقی سے۔

(۲) مشارکت لفظی سے۔

(۳) مشارکت ترکیب سے

(۴) مشارکت معنوی سے

(۵) مشارکت صرفیات سے

بیشک بعض مشارکتیں ہو بہو اترتی ہیں۔ جیسے مادر۔ مدر۔

فادر - پدر - برادر - برادر - دختر - ڈاٹر وغیرہ وغیرہ -

بعض مشارکتیں صرفی مشارکتیں تو کہی جا سکتی ہیں - لیکن پھر بھی اُن کا زیادہ تر حصّہ محض موہومی اور قیاسی ہوتا ہے - بیشک زبانوں کو آپس میں ایک بڑی حد تک صورت قربت حاصل ہے - اور یہ صرف اس وجہ سے کہ در اصل یہ ساری زبانیں کسی ایک ہی زندہ - یا مردہ زبان کی کچی پکی اور ترقی یافتہ شاخیں یا منتشر ریزے ہیں - نہ اس وجہ سے کہ کُل زبانوں کے الفاظ ایک دوسری زبان سے ایسے ہی ملتے جلتے ہیں جیسی کہ تحقیقی رنگ میں ضرورت ہے - اگر کوئی سرمایہ موروثی زبانوں کا ہے تو ایک مشترکہ اجتہاد مابعد کا بھی ہے - اور اسیطرح ایک ایسا سرمایہ بھی ہے جو بالکل جداگانہ ہے - کچھ تو محض بوجہ ایک جداگانہ اجتہاد اور استخراج کے کچھ اس وجہ سے بھی کہ بعد میں زبانوں کے اندر ادبی نقطۂ خیال سے بہت کچھ ادبی ترقیات کی گئیں - ہماری رائے میں پانچ قسم کی ترقیات زبانوں کے متعلق کی گئیں ہیں -

(الف) موروثی یا الہامی ترقی جو اسلاف نے کی -

(ب) مابعدی ترقی جو اس میں اخلاف نے کی -

(ج) تصریفی ترقی جو ضرورتاً ہوتی گئی -

(د) ادبی ترقی جو اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی گئی -

(ہ) خاص ترقی -

یہ ساری ترقیات شروع کی ترقی کی خوشہ چین اور مقتدی ہیں - اور اسی کی بدولت ان کی ہستیاں بھی جیسز ہستی میں آئی ہیں - ترقیات اشتقاقی اور رسم مخرجی و سہم مادگی وغیرہ کی صورتیں بھی مختلف قسم کی ہوئی ہیں مثلاً

(۱) بیّن۔

(۲) واضح

(۳) قیاسی

(۴) اجتہادی

(۵) موہومی

ان ہی مختلف صورتوں کے تحت بحث ہم مخرج اور ہم مادہ کی تنقید ہوتی ہے +

ذخیرہ الفاظ

خواہ انسان کے منہ سے کوئی لفظ نکلے اور خواہ کسی حیوان کے منہ سے اور خواہ وہ کسی تصادم اور تضارب اور تقارب کی صورت ہو۔ ہر حالت میں اُسے لفظ ہی کہا جائے گا۔ اگرچہ اصطلاحاً صرف وہی الفاظ ہوتے ہیں۔ جو انسان کے منہ اور زبان ہی سے نکلتے ہیں۔ لیکن بعض دیگر اصوات سے بھی الفاظ بنائے گئے یا لئے گئے ہیں۔ مثلاً بعض جانوروں اور بعض تصادمات کی آوازوں سے بھی بعض الفاظ بنائے گئے ہیں۔ جیسے کون۔ کون۔ کوّے کی آواز سے۔ کُوکُو قمری کی آواز سے۔ بھپ بھپ انجن کی آواز سے۔ اسی قسم کے الفاظ اب لغات انسان میں ویسے ہی استعمال پاتے ہیں۔ جیسے انسان کے خود اپنے الفاظ اور اپنی آوازیں انسان اپنے ارد گرد سے جو کچھ سنتا ہے۔ اور جس قدر آوازیں اسکے کان میں پڑتی ہیں ان کی وہ کسی نہ کسی رنگ میں تاویل کرتے اور ایسی تعبیر دو طرح کی جاتی ہے۔ ایک اسی صورت کے مطابق جیسے انسان سنتا یا احساس کرتا ہے۔ دوسرے

اس سے کسی قدر متغایر جب ہوا سے درخت کے پودے ہلتے ہیں تو انسان اپنے رنگ میں اُنکی آواز سے ایک آواز نکالتا یا پیدا کرتا ہے - جیسے سرسر سرسراہٹ وغیرہ وغیرہ کبھی کبھی انسان کی تعبیر بالکل مطابق ایسی آوازوں کے ہوتی ہے - اور کبھی کبھی کچھ فرق بھی رہ جاتا ہے -

انسان جو اصوات سنتا ہے - گو وہ بجائے خود کوئی لفظ نہیں ہوتے اور نہ انہیں انسانی اصطلاح کے مطابق لفظ کہنا چاہیئے - مگر چونکہ انسان اُن اصوات اور اُن تصادمات اور تضاربات کی اپنے رنگ میں ایک تعبیر کرتا اور ایسی تعبیر کی اسے ضرورت پڑتی ہے - اس واسطے انہیں بھی مجازاً سلسلہ الفاظ میں رکھنا چاہیئے - اور رفتہ رفتہ ایسے الفاظ بھی ان الفاظ میں جگہ پاتے جاتے ہیں - جو انسانی الفاظ ہیں یا جنہیں انسانی الفاظ کہا جاتا ہے - یہاں تک کہ اخیر پر ایسے الفاظ انسانی الفاظ ہی سمجھے جاتے ہیں -

(الف) کیا ذخیرہ الفاظ عطیۂ قدرت ہے -

(ب) یا انسان خود انہیں اختراع کرتا ہے -

میری رائے میں ذخیرہ الفاظ عطیات قدرت میں سے ان معنوں سے نہیں - کہ قدرت الفاظ ڈھال ڈھال کر وقتاً فوقتاً انسان کے منہہ میں ڈالتی رہتی ہے - یا ان کا کوئی سٹور ان کے سپرد کیا گیا ہے - بلکہ یہ کہ قدرت نے انسان کی فطرت ہی میں وہ مواد رکھ دیا ہے - جس سے الفاظ خود بخود منہہ سے نکلتے رہتے ہیں جسطرح قدرت کی جانب سے اور قوتیں اور جذبات انسان کو بخشے گئے ہیں - اسی طرح قوت مخترع الفاظ یا موجد اور قوت خالقہ الفاظ بھی بخشی گئی ہے -

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ اس وقت مختلف زبانوں میں جس قدر الفاظ پائے
جاتے ہیں۔ ان کا شروع میں انسان کے ہاتھ اور قبضہ میں کوئی سٹور نہیں
تھا۔ اور نہ انسان کو کوئی ایسا بیرونی ذریعہ حاصل تھا جسکی مدد اور زور
سے وہ الفاظ وضع کرنے پر قادر ہوتا۔ وہ پیدا ہوتے ہی منہہ سے مختلف
الفاظ نکالنے لگ گیا۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا۔ اور اُسے دنیا کی ہوا لگی ہی تھی
کہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ اسکے منہہ سے نکلنے شروع ہوئے گو کہ وہ اُنکے
مفہوم واقعی سے ناآشنا تھا۔ مگر ان سے اس کی کچھ نہ کچھ غرض تھی۔
جب بچہ پیاس اور بھوک کی حالت میں مضطربانہ منہہ سے کچھ بولتا
ہے تو گو ایسے الفاظ ہماری سمجھ میں نہ آئیں۔ مگر ان سے بچہ کا مطلب
کوئی چیز یا پانی اور غذا مانگنا ہی ہوتا ہے۔ جب بچہ پانی دیکھکر انّا۔ منّا۔
کہتا ہے۔ تو ان دونوں لفظوں سے اُسکا مطلب پانی ہی ہوتا ہے۔
ہم پانی کہہ کر پانی مانگتے ہیں۔ بچہ انّا اور منّا کہکر مانگتا ہے۔ نتیجہ
دونوں کا ایک ہی ہے اگرچہ بچہ کے الفاظ بے معنی ہیں اور ہمارے
بامعنی۔ بات تو ایک ہی ہے۔ یہ اعتراض کہ بے معنی الفاظ الفاظ کی
ذیل میں نہیں لائے جاسکتے۔ بجائے خود ایک بےمعنی اعتراض ہے۔
زبان کی تحت میں قواعد صرف نحو کے مطابق یا صرف نحو کی پابندی سے
نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا چاہے کوئی لفظ معنے رکھے یا نہ رکھے اسے ہر حالت میں لفظ ہی کہا جائیگا
و نیز الفاظ تابع مہمل معنی دار الفاظ کیساتھ جب بولے جاتے ہیں تو انہی الفاظ کی مسلّمہ سلک میں منسلک
کیا جاتا ہے۔ جو کچھ منہہ سے نکلتا ہے۔ اور جو کچھ ہماری زبان پر آتا ہے
جو کچھ ہم بولتے اور جو کچھ کہتے ہیں۔ جو جو آوازیں ہم دوسرے رنگ
میں سنتے اور احساس کرتے ہیں۔ ان سب کو الفاظ ہی کی ذیل میں رکھا

جاسے گا۔ کیا تم معنے دار الفاظ کے سوائے بے معنی الفاظ اگر بولنا چاہو تو نہیں بول سکتے۔ کیا تمہاری زبان اُن کے بولنے سے انکار کرتی ہے۔ اور کیا وہ تمہاری زبان پہ چڑھتے نہیں ہیں۔ کلیہ یہ ہے۔ کہ جو لفظ ہمارے منہ سے نکلتا ہے وہ ہر صورت میں لفظ ہی ہوتا ہے۔ فطرت کی یہ بڑی بھاری فیاضی ہے۔ کہ اسکے خزائن تعداد میں سے جواہر الفاظ کا کافی شافی ذخیرہ انسان کی معدن طبیعت میں ایک خوش اسلوبی کے ساتھ ودیعت کیا گیا ہے۔ جس کا کوئی انحصار اور شمار نہیں یہ ایک ایسا خزانہ ہے۔ جسکی نہ تو کوئی قیمت لگ سکتی ہے۔ اور نہ وہ ختم ہونے میں ہی آتا ہے۔ جسقدر الفاظ مختلف زبانوں میں اس وقت پائے جاتے ہیں۔ یا جن کا ایک بڑی حد تک استعمال ہو رہا ہے۔ وہ سب کے سب انسان کے ذہن اور طبیعت ہی میں سے نکلے ہیں۔ اور معلوم نہیں کہ ابھی اور کس قدر الفاظ نکلتے جائینگے۔ اگر انسان کی سمجھ میں یہ بات آجائے کہ ایسے الفاظ کا اس قدر بے بہا ذخیرہ دیا گیا ہے۔ تو وہ جان سکتا ہے۔ کہ فطرت کی مہربانی سے وسعت السنہ کے واسطے اسکو کیسے ممتاز اختیارات بخشے گئے ہیں۔ اور اسکی طبیعت میں کیسی طاقت موجود رکھی گئی ہے۔

انسان اب بھی ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں لفظ بنا سکتا ہے۔ اور بناتا ہے۔ چند چھوٹی عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک جا جمع کر کے کہو کہ وہ کچھ نہ کچھ بولتے جائیں عام اس سے کہ وہ با معنے الفاظ ہوں یا بے معنی۔ وہ صدہا ایسے الفاظ بولتے جائینگے جو ایک آسانی سے تعریف لفظی میں آسکیں گے گو کہ ان کے معنے نہ ہوں۔ مثلاً اگر ایک

چھوٹے بچے کو یہ کہا جائے کہ وہ لفظ (آج) کے ہم ردیف اور ہم وزن الفاظ بولتا جائے تو وہ یوں بولتا جاوے گا۔

آج - باج - تاج - ٹاج - ثاج - پاج - جاج - چاج

حاج خاج - داج - ڈاج - ذاج - راج - زاج - ژاج

ساج - شاج - صاج - ضاج - طاج - ظاج - تاج - تاج

کاج - گاج - لاج - ماج - ناج - واج - ہاج -

یاج -

اسی طرح تختیاں الٹتے جاؤ۔ جہاں تک کہ الٹی جاسکتی ہیں۔ پھر دیکھو کہ یہ چھوٹے چھوٹے ناسمجھ بچے کس قدر الفاظ بولتے جاتے ہیں۔ جو تختی لوگے وہی مختلف طریقوں پر گردانی جاسکتی ہے۔ ایسی تختیوں میں بعض الفاظ ایسے بھی ہوں گے۔ جو معنے بھی رکھتے ہیں۔ اور بعض ایسے جن کے ہماری زبانوں میں کوئی معنے نہیں ہیں۔ گویا وہ ہمارے واسطے بالکل نرالے۔ انوکھے اور جدید ہونگے۔ ایسے الفاظ کیوں بچوں کی زبان پر چڑھ گئے حالانکہ نہ تو وہ ہماری زبان میں پائے جاتے ہیں اور نہ ہم ان سے واقف ہیں اس سے ثابت ہے کہ قدرت نے جو ذخیرہ الفاظ یا مادہ الفاظ انہیں بخش رکھا ہے۔ اس کے سلسلہ میں ایسے الفاظ چھوٹے بچوں کے منہ سے بھی نکلتے جاتے ہیں۔ اور شروع سے یہی حالت چلی آتی ہے۔

جن الفاظ سے ہماری زبانیں ہمارے دل و دماغ آشنا تک نہیں ہیں۔ وہ ان بچوں خوردسال کی زبانوں سے نکلتے ہیں۔ جو یہ بھی نہیں جانتے کہ الفاظ سے مراد کیا ہے۔ اس سے بآسانی

یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ کہ ہم شروع شروع میں ہی علمی رنگ میں الفاظ سے ایسے ہی ناآشنا تھے جیسے خورد سال بچّے ہوتے ہیں جسطرح بچّوں کے منہہ اور زبان سے خود بخود بلا تصنع الفاظ نکلتے جاتے ہیں۔ اسی طرح طبعی اقتضا کے ماتحت شروع کی نسلوں یا اسلاف کے منہہ سے بھی نکلتے تھے۔ ان الفاظ کا مخزن اور مصدر بھی فطرت ہی ہے۔ اور اُن کا بھی فطرت ہی تھی یہ ایسا ذخیرہ نہیں ہے کہ کبھی ختم ہو جائے۔ یا انسان اُن سے کام نہ لے سکے زبانوں کی وسعت اور ترقی کا اصلی موجب اور اصلی منبع یہی ذخیرہ ہے۔ گو ہمیں بالصراحت یہ پتہ نہیں لگتا کہ ہماری فطرت اور قدرت موجدہ الفاظ و طاقت خالقہ زبان کے ضروریات میں ہماری کس قدر مدد کر رہی ہے۔ اور ہم کس طرح معمولی حالات میں بھی یہ امداد پا رہے ہیں۔ لیکن بامعان نظر دیکھنے سے پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ ہم قوّت خالقہ و مادہ موجدہ کی مدد سے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اور بہت کچھ کر بھی چکے ہیں۔ بے شک ہم میں سے ان لوگوں نے اس قسم کی مدد بہت کچھ دی ہے۔ جو نسبتاً خوش فہم ذہین اور طبّاع ہیں۔ یا جو علمی بہرہ رکھتے ہیں۔ لیکن عوام الناس اور جہلا نے بھی اس میں بہت کچھ مدد دی ہے۔ اور سچ پوچھو تو اُن کی بدولت ہی ایسے لوگوں کو مزید کوشش اور تفحص کا موقعہ ملتا رہا ہے شروع شروع میں تو سوائے اس ذخیرہ قدرت کے اور کوئی علمی صورت قواعد مرتبہ کے ماتحت موجود ہی نہیں تھی۔ اس وقت جو کچھ مدد ملی انہی لوگوں کی جانب سے جو ایک ابتدائی انسانی زندگی رکھتے تھے۔ اور چونکہ قوانین فطرت اور ضابطہ خلقت اُن ایّام میں نسبت

ہمارے ان کے زیادہ تر قریب تھا۔ یا وہ زیادہ تر اس کے ہمعصر تھے
اس واسطے اُن کے ذہن اور ارادوں کی فراست اور ملکہ لیسے کاموں
میں بہ نسبت ہمارے زیادہ تر روشن اور بالغ تھا۔ ہم اُن کے خوشہ چین
اور مقتدی ہیں۔ ان کی بدولت اس وقت ہمارے ہاتھوں میں توصدہا
قواعد زبان اور لغات موجود ہیں اُس وقت اُن کے ہاتھ اور قبضہ قدرت
میں سوائے فیضان قدرتی کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ محض قدرتی فیضان
کے بھروسہ پر اور طبعی فراست کی مدد سے وہ تیرہ و تاریک راہوں
سے بہت گذرتے گئے۔ اور ہمارے واسطے وہ نقش قدم چھوڑ گئے
جو آج ایک شاہ راہ کا نمونہ ہے +

کس قسم کے الفاظ ہمارے منہ سے نکلتے ہیں

ہمارے منہ ہی سے نہیں دیگر کائنات کے مخارج سے بھی جو
الفاظ نکلتے ہیں وہ عموماً سلسلہ اسمائیہ سے زیادہ تر نسبت رکھتے ہیں
مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم جس قدر الفاظ منہ سے نکالتے یا بولتے
ہیں ان کا اکثر حصہ اسما ہوتا ہے۔ تخلیق الفاظ کے متعلق جس قوت
سے ہم کام لیتے ہیں۔ اسکی ٹکسال میں سب سے اول اسمار ہی بنتے
ہیں اور اسما ہی پر مہر لگتی ہے۔ قرآن مجید میں انہی معنوں میں کہا
گیا ہے۔

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (پارہ الم)

قدرت نے ہمیں زیادہ تر اسمار کا ذخیرہ جو بخشا ہے۔ اسکی وجہ
یہ ہے۔ کہ سب سے اول اسمار کی نوبت آتی ہے۔ افعال کا نمبر بعد میں

آتا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ افعال کی بنیاد بھی اسما ہی ہوتے ہیں۔ اگر اسما
نہ ہوں تو افعال بھی نہ ہوں۔ کوئی سے فعل لے لو اس کا اسم ضرور ہوگا
اور اسم ہی سے اسکی بنیاد پڑی ہوگی۔ اسمار گویا ایک ایسا ذخیرہ ہیں جن
سے افعال کی گردان چلتی ہے۔ شروع شروع میں انسان نے بہت کچھ
اسمار ہی سے کام لیا تھا۔ اگر وہ اسمار سے کام نہ لیتا تو افعال پر دسترس
نہ حاصل کرسکتا۔ ہماری سرشت اور فطرت میں افعال اور مجہول و معروف
کا ذخیرہ یا تو رکھا ہی نہیں گیا اور یا بہت ہی کم رکھا گیا ہے۔ ہم سب
سے اوّل اسمار ہی کی گردان کرتے ہیں۔ بعدازاں اُن سے افعال اور
مجہول و معروف کے صیغے بناتے ہیں۔ کسی انسان خواندہ اور ناخواندہ
سے کہکر دیکھو کہ وہ بیساختہ اپنے منہہ اور زبان سے الفاظ نکالتا جائے
اُسکے منہہ سے جس قدر الفاظ نکلیں گے ان کا اکثر حصّہ اسمار ہی ہونگے
یا زیادہ سے تابع اسمار انسان کبھی کبھی جو افعالی الفاظ بھی رٹ دیتا ہی
وہ گویا ان افعال کا عکس یا ظل ہوتے ہیں۔ جو اسکی طبیعت اور دل
و دماغ میں ایک مدت سے موثر۔ مرکوز اور منقوش چلے آتے ہیں
مثلاً۔ ہم ایک چھوٹے بچّے سعید اور نذر او معین کو کہتے ہیں کہ وہ بیساختہ
الفاظ کہتا جائے دیکھو وہ تختی (ت ۔ الف) کی گردان کررہا ہے
تا ۔ تب ۔ تت ۔ تث ۔ تٹ ۔ تج ۔ تچ ۔ تح
تخ ۔ تڈ ۔ تد ۔ تذ ۔ تر ۔ تز ۔ تڑ ۔ تژ ۔ تس
تش ۔ تص ۔ تض ۔ طح ۔ طغ ۔ تف ۔ تق ۔ تک
تگ ۔ تل ۔ تم ۔ تن ۔ ته ۔ تو ۔ تی ۔

دیکھو ان الفاظ میں اکثر اسمار ہی ہیں۔ چونکہ بقاعدہ کلیہ

اسما ہی سے افعال اور تبع افعال کی بنیاد پڑتی ہے۔ اسی واسطے ضروری تھا کہ انسان قدرتاً اسما ہی سے اوّل اوّل کام لے جو شخص اسمار سے ناواقف ہے۔ وہ افعال اور تابع افعال سے کس طرح آشنا ہو سکتا ہے۔ صرف و نحو میں بھی سب سے اوّل اسم ہی کی بحث شروع کرائی جاتی ہے۔ سب سے اوّل دنیا اور دنیا والوں پر اسم ہی کا القا ہوا ہے۔ اسکے بعد افعال اور تبع افعال کی نوبت آئی ہے۔ ہمیں مناظر اور ذخائر قدرت کی واقفیت بھی اسما ہی سے ہوتی ہے۔ جب ہم کوئی فعل قدرت کا مشاہدہ کرتے یا سنتے ہیں۔ تو سب سے اوّل ہماری خواہش ہی ہوتی ہے۔ کہ فاعل کا نام معلوم کیا جائے۔ فاعل کی تلاش اسم ہی کی تلاش ہے۔ اس ساری کائنات کا دار و مدار اسم ہی پر ہے۔ اگر اسم نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔ اسم ہی فاعل اور اسم ہی مفعول ہے شناخت اور شناسائی کے واسطے اسم ہی کی ضرورت پڑتی ہے افعال سے اس وقت کام لیا جاتا ہے جب اسمار سے واقفیت حاصل کر لی جاتی ہے تو جو افعال ہماری زبان سے نکلتے ہیں۔ یا جو افعالی

---

۵۱ اس بحث سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے۔ کہ جن زبانوں میں اسمار کی کثرت یا معتدبہ تعداد نہیں ہے۔ وہ زبانیں وسیع اور مکمل نہیں ہیں۔ یا یہ کہ ایسی زبانوں میں اسمار کا اتفاقاً استعمال اور ذخیرہ نہیں ہے جس قدر کہ واقعی ضرورت ہے۔ ایسی زبانیں ان حالات میں بہت کچھ دوسری زبانوں سے لیتی ہیں۔ کیونکہ جب اسمار کی کمی ہے۔ تو افعال اور تابع افعال کی بھی کمی ہوگی۔ جن زبانوں میں مفرد اسمار کی کثرت ہوگی وہ زبانیں بمقابلہ دوسری زبانوں کے زیادہ تر یہ استحقاق رکھتی ہیں۔ کہ انہیں جامع اور وسیع زبانیں کہا جائے ٭

گردان ہم کرتے ہیں۔ ان سب کی تہ میں اسمار مضمر ہوتے ہیں۔ مثلاً جب ہم کرو۔ چلو۔ آؤ۔ جاؤ۔ دو۔ وغیرہ وغیرہ افعال کا اطلاق کرتے ہیں تو اس وقت تک ایسا اطلاق نہیں ہوسکتا۔ جب تک کہ ہم ان افعال کے اسمار سے واقف نہ ہوں۔ کرو۔ چلو۔ آؤ۔ جاؤ۔ اور دو۔ کے اسمائے مصدری کرنا۔ چلنا۔ آنا۔ جانا اور دنیا کی ہستی سے واقفیت لازمی ہے۔ ہمارا یہ دعوےٰ نہیں کہ انسان کے منہ سے الفاظ افعالیہ نکلتے ہی نہیں یا نکل ہی نہیں سکتے۔ ہمارا دعوےٰ یہ ہے کہ اوّل اسمار کا استعمال ہوتا ہے۔ بعد ازاں الفاظ افعالیہ کی نوبت آتی ہے۔

جیسے بظاہر افعال تابع اسمار ہیں ایسے ہی سلسلہ طلاقت اور نطق میں بھی اسمار مقدم ہیں +

جدید الفاظ

اگرچہ یہ جھگڑا جدا ہے کہ کل کائنات اور حضرت انسان کب یا کس طرح پیدا ہوا مذاہب بھی اس بارہ میں اختلاف رکھتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس میں بھی متضاد بحثیں کی جاتی ہیں۔ بعض کے خیال میں یہ سب کائنات محض امر یعنی ارادہ خدائی کے تحت وجود پذیر ہوی ہے یا یہ کہ نیست سے ہستی ہوئی ہے۔ بعض کے خیال میں مادہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ خدا نے صرف جوڑ جاڑ کے کائنات رکھ دی ہے خدا اور مادہ دونوں ازلی یا انادی ہیں۔ بعض کے خیال میں جو کچھ ہمارے ارد گرد پایا جاتا ہے یہ سب اتفاقی ہے۔ اور ارتقائی قانون کے ماتحت اس کا نشو و نما ہو رہا ہے۔ نہ کوئی اس کا شروع ہے اور نہ خاتمہ اسی

طرح یہ کارخانہ چلا جائے گا - ان سب بحثوں کے ہوتے جب ہم زبانوں
اور زبانوں کے حروف - الفاظ - اور اُن کے معانی پر غور کرتے ہیں
تو انکی نسبت بھی وہی سوالات پیدا ہوتے ہیں - جو کائنات کے بارہ
میں زیر بحث رہتے آئے ہیں -

جسطرح خود حضرت انسان کی تاریخ انسانی تحقیقات کے رُو سے
دھندلی اور بہت کچھ نامکمّل ہے - اسی طرح انسانی زبانوں اور انسانی
زبانوں کے الفاظ کی تاریخ بھی دہندلی اور نامکمّل ہے - یہ کوئی نہیں
کہہ سکتا کہ حضرت انسان کے منہہ سے پہلے پہل کون سے زبان کا لفظ
نکلا یا اُس کا شروع کیسے ہوا -

(۱) کیا الفاظ بھی حروف کی طرح طبعی ہیں - یا ان میں سے بعض
طبعی اور بعض غیر طبعی -

(۲) کیا اُن کا نشو و نما ارتقائی قانون کے ماتحت ہے -

(۳) کیا اُن کی ہستی کوئی میعاد رکھتی ہے - یعنی کس میعاد یا کس
زمانہ سے وابستہ ہے - اگر یہ موجودہ کائنات جس میں انسان بھی داخل
ہے - کسی خاص وقت سے وجود پذیر ہوئی ہے - اور اسکی کوئی عمر
ہے تو جس قدر انسانی زبانیں اور اُن زبانوں کے حروف اور الفاظ
ہیں ان کا بھی کوئی وقت اور انکی بھی کوئی عمر ہے اور اگر یہ کائنات
انادی یا ازلی ہے تو یہ زبانیں اور ان کے الفاظ بھی انادی اور ازلی ہیں
اور اگر یہ تمام سلسلہ اتفاقی ہے تو ہماری تمام زبانیں اور ان کے
الفاظ بھی اتفاقی ہیں کائنات کی ابدیت اور حدوث کی بابت اگرچہ جداگانہ
کیسے ہی ژولیدہ خیالات ہوں لیکن ہم زبان کی بحث میں یہ مان لینگے -

کہ انسان کی ہستی بہ موجودہ صورت ایک خاص وقت میں خلقت امر و خلقت وجود سے مزین ہو کر وجود پذیر ہوئی ہے انسان کے بعد تمام حروف الفاظ معانی کی نوبت آئی جوں جوں حضرت انسان ترقی کرتا گیا۔ ووں ووں زبانیں بھی بہ اصول ارتقائی ترقی کرتی گئیں۔ جب تک ہمیں قائل نہ کیا جائے ہم مسبات سے انکار نہیں کر سکتے۔ کہ شروع میں ساری انسانی کائنات کا ایک ہی مورث تھا۔ اور اسی ایک مورث سے انسان مختلف نسلوں۔ مختلف ذریات اور مختلف زبانوں میں رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا اگرچہ انسانی نسلوں کے چھان بین کرنے والوں نے مختلف واقعات آثار اور کیفیات کے ماتحت ایرین۔ سامی شاخوں میں تفریق کر کے انسانی نسل کی مختلف شاخیں اور شعبے قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ہم اس مورخانہ تفریق قائم رکھنے کے بعد بھی کہیں گے۔ کہ باوجود موجودہ اختلافات اور اضافوں کے بھی تمام انسانی نسلیں ایک ہی مورث اعلیٰ رکھتی ہیں۔ اس وقت مختلف انسانی نسلوں اور انسانی ذریات میں جو کچھ اختلاف پایا جاتا ہے یہ اس وجہ سے نہیں کہ ان کے مورث جداگانہ ہیں۔ بلکہ اس وجہ سے کہ مختلف ممالک کی آب و ہوا عناصر متضاد اور مختلف ضروریات نے رفتہ رفتہ ان کی یہ صورت اور یہ ہیئت بنا دی ہے۔ چونکہ اسکے اکثر تصرفات اور کام کاج مختلف عناصر کے ماتحت ہیں اس واسطے ان مختلف عناصر کیوجہ سے اسکی پیدائشی تاریخ اور تاریخی واقعات مختلف شاخوں یا بنیاد کا پتہ دیتے ہیں۔ ورنہ سب انسانی نسلیں ایک ہی مورث کی ذریات میں سے ہیں۔

جس طرح تفرقِ نسلوں کا استدلال چند دلائل اور استقرا کے ماتحت کیا جاتا ہے اسیطرح ایک ہی مورث کی بحث بھی چند دلائل کے ماتحت جاری رکھی جاسکتی ہے جب کبھی ایسی بحثوں میں تاریخی دلائل کمزور پڑ جاتے ہیں۔ یا اُن پر فلسفی رنگ میں اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ تو قرائن قریبہ بمنزلہ براہین مانے جاسکتے ہیں۔ دراصل ایسے قرائن بھی دلائل ہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہت سے دلائل بھی قرائن ہی سے ترتیب پاتے ہیں۔ ہماری رائے میں اس بحث کے واسطے مندرجہ ذیل قرائن دلائل کا حکم رکھتے ہیں۔ اور بہ دیگر الفاظ وہ ایک قسم کے دلائل ہی ہیں۔

(الف) تمام انسانی نسلوں کی جسمانی ترکیب ایک ہی قانون کے ماتحت پائی جاتی ہے۔

(ب) تمام انسانوں کے قوائے جذبات۔ خواہشات اور طبعی تاثرات ایک ہی چشمہ کی لہریں اور ایک ہی معدن کے جواہر کہے جاسکتے ہیں۔

(ج) تمام فطرتی امتیازات اور فطرتی تصرفات ایک ہی قسم کے ہیں۔

(د) تمام رجحانات اور میلانات ایک ہی قسم کے معلوم ہوتے ہیں۔

(ہ) تمام معادی اور معاشرتی خصوصیات باوجود چند در چند اختلافات کے بھی ایک ہی صورت رکھتی ہیں۔

(و) بہت سی رسوم اور عادات آپس میں ملتی جلتی ہیں۔

(ز) جسمانی بناوٹ جسمانی پرزے جسمانی اعضا باعتبار جنس اور نوع کے تقریباً ایک ہی نوعیت اور ایک ہی پیمانہ رکھتے ہیں۔

یہ ساتوں باتیں یا ساتوں چیزیں اس قدر متحد واقعہ ہوئی ہیں۔ اور ان ساتوں میں اس قدر نسبت اور تعلق ہے کہ باوجود تضاد اور اختلاف کے بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان کا بنانے والا۔ ان کا ترتیب دینے والا کوئی ایک ہی ہے

جیسے انسان نے رفتہ رفتہ ترقی پائی جس کا ایک مقررہ زمانہ ہے۔ چاہے وہ زمانہ کتنا ہی لمبا اور طول طویل قرار دیا جاوے۔ تو ایسے ہی یہ بھی ماننا پڑے گا۔ کہ زبانیں اور زبانوں کے الفاظ اور مشتقات کو بھی رفتہ رفتہ ترقی نصیب ہوئی ہے۔ اور اس کے ماننے میں کوئی مشکل نہیں عاید ہو سکتی۔ موجودہ زبانوں میں سے کوئی پرانی زبان ہے۔ اور کوئی جدید۔ دیکھو بہاشا۔ اردو کا ایک زمانہ میں نام و نشان بھی نہ تہا۔ مدتوں کے بعد اُن کا زمانہ آیا۔ اسی طرح سے دوسری زبانیں بھی درجہ بدرجہ بنیں۔ کوئی پہلے۔ کوئی پیچھے یہی کیفیت الفاظ کی بھی ہے بعض الفاظ پہلے کی ساخت یا پیدایش ہیں اور بعض بعد کی بعض پہلے استعمال میں آنے شروع ہوئے۔ اور بعض بعد میں۔ پرانی اور ابتدائی کتابوں کے دیکھنے سے بآسانی پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ شروع شروع میں جو الفاظ تھے۔ بعد میں تقریباً اُنکی ہیئت ہی بدل گئی۔ پہلی کتابوں اور پہلی بول چال میں وہ الفاظ نہیں ملتے جو پچھلی کتابوں اور پچھلی بول چال میں ملتے ہیں۔ بہاشا اور اردو کی کتابوں میں اور بہاشا اور اردو کی بول چال گذشتہ میں اکثر وہ لفظ نہیں ملتے جو اب مستعمل ہیں۔ یا تو بالکل ہی نہیں ملتے اور یا اُنکی شکل اور تلفظ میں بہت کچھ فرق آ گیا ہے۔ جنہیں متروکات کہا جاتا ہے وہ کیا ہیں۔ وہی الفاظ جو رفتہ رفتہ ترک ہو کر اُن کے بجائے یا تو نئے الفاظ نے جگہ لے لی ہے اور یا ان میں کچھ کچھ ترمیم ہو گئی ہے۔ ایسی مثالیں پرانی اور جدید کتابوں کے مقابلہ سے بہت کچھ مل سکتی ہیں۔ ایک دو نہیں بلکہ بہت سی۔ دیوان شاہ تراب سے یہاں صرف دو شعر لکھتے ہیں دیکھو رفتہ رفتہ الفاظ میں کیسی تبدیلی آتی جاتی ہے۔

چمن میں یار کل آیا لگائے مہندی ہاتھوں میں
گلوں نے رنگ حسرت سے پھیری اپنیاں ملیاں
بجز کافر پرستی اور کچھ بھاتی نہیں دل کو
بتوں کی صورتیں یارب اسی جب سے نظر پڑیاں

مورث اعلیٰ باعتبارِ زبان

باعتبار بحث زبان انسان کے مورث اعلے دو قسم یا دو حیثیت کے ہیں ۔

(۱) مورث اعلیٰ جامع ۔

(۲) مورث اعلیٰ منفردہ ۔

پہلے سب کا ایک ہی مورث اعلیٰ تہا ۔ اُس کے بعد رفتہ رفتہ دیگر ضمنی مورث ہوتے گئے ۔

یہ ہم مان لیتے ہیں کہ ابتدائی ضروریات کا مورث اعلیٰ جامع ایک ہی تھا ۔ اور اس کے بعد منفردہ مورثوں آرین اور سماطیقی کی نوبت آئی ۔ اور بوجہ جداگانہ اجتہادات کے دونوں کی جداگانہ شقوں سے تعبیر کی گئی ۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ شروع میں سب انسانوں کا ایک ہی مورث اعلیٰ تہا تو اسکے ساتھ ہی یہ بھی مان لینا پڑیگا کہ اس مورث اعلیٰ کی ذریات ایک ہی زبان اور لب و لہجہ رکھتی تھی ۔ جُوں جُوں نسلیں جُدا جُدا ہوتی گئیں زبان میں بھی اختلاف ہوتے ہوتے جدید زبانوں کی نوبت آتی گئی ۔ یہ استدلال بلا دلیل نہیں ہے ہم دیگر حیوانات میں بھی یہی کیفیت پاتے ہیں ۔ عموماً ہر نوع حیوانات ایک ہی مورث اعلیٰ رکھتی ہے ۔ اسکی زبان اسکی شکل و شباہت اسی کے ماتحت

ہوتی ہے۔ جو قرائن ہم نے اوپر اس ثبوت میں بیان کئے ہیں۔ وہ بھی اس پر شاہد ہیں۔ تمام زبانوں کی ڈکشنریاں مقابلتاً رکھ کر دیکھو کہ مختلف زبانوں کے الفاظ کسی باہم علاقہ رکھتے ہیں۔ اس مقابلہ سے ثابت ہو جائے گا کہ اکثر السنہ مختلفہ کے الفاظ میں معمولی مشابہت ہی نہیں۔ بلکہ ان کی جڑ اور مخزن بھی ایک ہی تھا۔ یہ اشتراک اور وحدت کچھ یوں ہی نہیں۔ بلکہ اسکی بھاری وجہ یہ ہے کہ چونکہ سب زبانیں ایک ہی ابتدائی زبان کی جزئیں ہیں۔ اس واسطے ان میں ایسی مناسبت وحدت کا ہونا لازمی ہے۔

ان الفاظ کو جانے دو جو رفتہ رفتہ کسی ایک زبان میں کسی دوسری زبان سے منتقل ہو کر آئے ہیں۔ ان الفاظ پر غور کرو جو بغیر انتقالی عمل کے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ابجد ہی کو لو۔ اگرچہ ابجدوں کے حروف کی تعداد میں گو نہ اختلاف اور کمی بیشی ہے لیکن ان کا لہجہ اور تلفظ عموماً ایک ہی قسم کا ہوگا (الف ۔ اے) (میم ۔ ایم) (ت ۔ ٹی) (سین ۔ ایس) کا تلفظ کیسا متحد الصوت ہے اگر بہ غور مزید دیکھو گے تو مختلف زبانوں کی شکل اور رسم خط میں بھی ایک حد تک یکسانیت اور مشابہت پائی جاویگی۔ جس طرح ایک یورپین ایم کا تلفظ کرتا ہے۔ اسی طرح ایک عربی دان اور سنسکرت خوان بھی کرتا ہے۔ سنسکرت دان۔ ہما۔ فارسی۔ عربی خوان میم۔ اور یورپین ایم کہتا ہے۔ ان تینوں تلفظات میں ایک مخرجی نسبت اور وحدت موجود ہے۔ ابجد کا قریباً ایک ہی کیفیت رکھنا متوارداً نہیں ہے۔ بلکہ ایک طبعی اور نسلی اقتضاء جسطرح اور متحدہ باتوں میں لباس اور خور دو نوش وغیرہ میں رفتہ رفتہ فرق آتا گیا۔ اسی طرح ابجد میں بھی فرق آگیا۔ اور یہی فرق طرز تحریر کے فرق کا بھی موجب ہوا۔ کوئی زبان دائیں ہاتھ سے لکھی گئی

اور کوئی بائیں سے جسطرح اور بھی بہت سے کام مختلف ملکوں اور قوموں میں مختلف طور پر دائیں اور بائیں ہاتھ سے کئے جاتے ہیں۔

فارسی میں۔ برادر۔ مادر۔ پدر۔ دختر۔ الفاظ انگریزی الفاظ برادر۔ مدر۔ فادر۔ ڈاٹر۔ سے بالکل ملتے جلتے ہیں۔ لہجہ کی وجہ سے دونوں کے تلفظ میں فرق آگیا ہے۔ ورنہ یہ بھی ایک ہی ہیں۔ نہ صرف مختلف زبانوں ہی میں کسیقدر فرق آتا گیا۔ بلکہ ایک ہی زبان کے اندر بھی مختلف طریقوں سے زبان بولی جاتی ہے۔ دلّی والے بعض الفاظ کا اطلاق جس طرح کرتے ہیں اس طرح لکھنوی نہیں کرتے۔ سکاٹ لینڈ والے بعض الفاظ کا تلفظ اہل انگلستان کی طرح نہیں کرتے۔ اس مختصر بحث کے بعد ہم یہ جتانا چاہتے ہیں کہ ہر ایک زبان کے موجودہ الفاظ کا ذخیرہ مندرجہ ذیل مواد اور صورتیں رکھتا ہے۔

(۱) ابتدائی الفاظ۔

(۲) محض جدید مخترعہ الفاظ۔

(۳) جدید مخترعہ الفاظ

(۴) دوسری زبانوں کے مستعمل الفاظ

(۵) الفاظ مستعملہ کے مخترعات

(۶) الفاظ منتقلہ کے مشتقات

(۷) توابع مہمل۔

جس قدر الفاظ کسی ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں بہ مختلف طریق منتقل ہوتے ہیں وہ منتقل الیہ زبان کے مقابلہ میں جدید ہی ہوتے ہیں۔ جہاں ہم زبانوں کی بحث میں جدید الفاظ بولیں گے اس سے ہمارا

یہی منشا ہوگا۔ کہ جس قدر الفاظ اس وقت زبانوں میں بولے جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب کسی نہ کسی وقت وضع ہوئے تھے۔

الفاظ ہمیشہ دو طرح پر بنتے ہیں۔

(الف) ارادتاً

(ب) اتفاقاً

الفاظ کا اکثر حصّہ ارادی ہے۔ یعنی انسانی ارادوں اور خواہشات کے ماتحت اُن کی بنیاد پڑی ہے۔ یہ سوال کہ توضیع الفاظ کی نوبت کب آئی یا کب آتی ہے۔ یا الفاظ کب بنائے گئے اور کب بنائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اس کا جواب کسی مورخانہ رنگ میں نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن یہ کہا جاسکتا ہے اور اس پر دلائل بھی ہیں کہ الفاظ کی توضیع ہمیشہ ضرورت کے پیش آنے پر ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہوتی رہتی ہے۔ دیکھو جن قوموں جن نسلوں اور جن ملکوں اور اقطاع ممالک میں جیسی جیسی قسم کی ضرورتیں کم و بیش ہوئی ہیں ان میں الفاظ بھی کم و بیش ہوتے ہیں۔ جن قوموں کا تمدن اور تہذیب عروج پر ہے ان کا لفظی ذخیرہ بھی وافر ہے۔ اور جن کا تمدنی اور تہذیبی دائرہ محدود ہے اُن کے لسانی ذرائع اور لسانی آلات میں الفاظ بھی کم اور محدود ہوتے ہیں جُوں جُوں انسانی ضروریات انسانی تمدن انسانی تہذیب انسانی معلومات اور وسائل زندگی کا دامن فراخ ہوتا گیا۔ ووں ووں الفاظ کی دولت اور سرمایہ بھی بڑھتا گیا۔ جب کسی قوم اور کسی ملک میں ضروریات کا دامن تنگ ہوتا ہے تو ذخیرہ الفاظ بھی محدود ہوتا ہے۔ جب یورپ کی قوموں اور سرزمین میں علوم و فنون کی اسقدر ترقی نہیں تھی الفاظ اور اصطلاحات بھی محدود تھے ترقی ہونے پر الفاظ اور اصطلاحات میں بھی روز افزوں ترقی ہوتی گئی

اس قسم کے الفاظ اور اصطلاحات رفتہ رفتہ زبان میں داخل ہوتے گئے کہ جن کا پہلے زمانوں میں سان و گمان بھی نہ تھا۔ اور جن کی ضرورت بھی شروع میں نہ تھی تمام انسانی نسلیں اور لوگ محدود الفاظ سے ہی گزارہ چلاتے تھے ضروریات کے بڑھنے پر رفتہ رفتہ ترقی ہوتی گئی۔

اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ کسی زبان میں تجدید الفاظ کی بھرتی کس قدر ہو چکی ہے تو ہمیں ان مخترعات ایجادات کیفیات۔ علمی۔ فنی۔ تمدنی۔ تہذیبی اور سیاسی کی ایک فہرست بنانی چاہیئے۔ جو ایک یا دو صدی سے ظہور پذیر ہوئے ہیں اس سے معلوم ہو سکیگا کہ کس زبان میں کس قدر جدید الفاظ وضع ہوئے۔ یا منتقل ہو رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی یہ بھی پتہ نکلنا مشکل نہ ہوگا کہ بعض الفاظ فلاں زمانہ میں داخل ہوئے یا بنائے گئے ہیں۔ مثلاً اردو اور ہندی زبانوں میں وہ الفاظ جو زمانہ انگریزی تجارت اور انگریزی عہد حکومت میں بنے یا بنائے گئے اور منتقل ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں بتا سکتے ہیں کہ ان کی عمر کتنی ہے۔ اور ان کی ساخت اور ان کا داخلہ کب اور کن حالات میں ہوا۔

یہ کہنا کہ سب الفاظ اور سب معانی کی عمر بھی اور زمانہ بھی ایک ہی ہے غلط محض ہے۔ الفاظ اور معانی الفاظ کی مختلف عمریں اور مختلف زمانے اور مختلف موجبات ہیں کوئی لفظ صدہا صدیوں کا ہے اور کوئی ہزاروں صدیوں کا اور کوئی ایک دو صدیوں کا کوئی نصف صدی کا اور کوئی سالوں ہی کا کوئی کسی حالت میں بنائے گئے۔ اور کوئی کسی حالت میں کوئی بلا کسی کتر بیونت کے داخل ہوا۔ اور کوئی کسی حد تک توڑ مروڑ کر داخل کیا گیا۔ کسی میں تصرف کیا گیا۔ اور کسی کو بلا تصرف ہی رہنے دیا گیا۔

طریق ساخت و طریق انتقال الفاظ

اس بحث کے ضمن میں ہمیں یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیئے کہ جدید الفاظ کس طرح بنتے ہیں یا بنائے جاتے ہیں اور دوسری یا غیر زبانوں سے الفاظ کس طرح منتقل ہوتے ہیں۔ ان کی صورتیں مختلف ہیں۔

(۱) صورت مفردات۔

(۲) صورت مرکبات۔

جب جدید الفاظ بنتے یا بنائے جاتے ہیں۔ تو وہ عموماً مفردات ہی ہوتے ہیں مفردات سے ہماری یہ مراد نہیں کہ وہ حروف سے مرکب نہیں ہوتے یا انہیں کوئی ترتیبی شکل حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ کہ چند لفظوں سے ترکیب نہیں پاتے انسانی فطرت زیادہ تر ایسے ہی الفاظ کے بنانے اور نکالنے کی مشتاق ہے۔ جو اوپر کی تعریف کے مطابق مفردات ہوتے ہیں کیونکہ انسانی طبائع میں مفرد اسمار کا ذخیرہ ہی زیادہ تر ودیعت کیا گیا ہے۔ اور وہ ہی خزانہ وافر رکھتی ہے۔ مفردات کے علاوہ مرکبات کی بھی ضرورت پڑتی ہے اس واسطے ان کا ذخیرہ بھی کسی حد تک ساتھ کے ساتھ جمع ہوتا جاتا ہے۔ جب کسی زبان میں علمی اور فنی ضروریات کی وجہ سے اصطلاحات جدیدہ کا بنانا پیش نظر ہوتا ہے تو اس وقت مرکبات سے زیادہ تر کام لیا جاتا ہے۔ اگرچہ مفردات سے بھی بہت کچھ کام نکالا جاتا ہے۔ لیکن مرکبات کا حصہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے بخصوص ان زبانوں میں جن کا اپنا سرمایہ کم اور محدود ہوتا ہے بعض وقت ایسی زبانوں میں مفردات کی تلاش اصطلاحی رنگ میں بہت کچھ مشکلات پیدا کرتی ہے اگر یہ بحث طے کر دی جائے کہ

"انسان ہمیشہ جدید الفاظ بنا سکتا ہے۔

" اور بناتا رہا ہے۔

" اور اس میں فطرتاً ایسا مادہ رکھا گیا ہے۔

" یا یہ کہ خود قدرت نے اسے ایسا سکھایا ہے۔

" اور اس کا ذہن یہ قدرت رکھتا ہے۔

تو اس قسم کی دقتیں ایک بڑی حد تک رفع ہو سکتی ہیں۔ کہ کوئی زبان کس طرح ترقی پا سکتی ہے یا ذخیرہ الفاظ کس طرح بڑھایا جائے۔

میری رائے میں کوئی وجہ نہیں کہ انسان کے پہلے اختیارات یا ورثہ جدی کو لیو سلب اور لاشئے ثابت کرنے کی کوشش کی جائے جب ہمارے اسلاف اور شروع کی نسلیں یہ فطرتی اختیارات برتتی رہی ہیں تو اب ہمیں کون مانع ہے۔

اگر اب تک ہمیں ضروری اندازہ سے بہت سا سرمایہ لفظی حاصل ہو چکا ہے تو اس وجہ سے باقتضائے انسانی فطرت اور ترقی کرنے سے ہمیں کون روک سکتا ہے اگر ہمیں اس وقت جدید الفاظ جدید معانی جدید اصطلاحات کی واقعی ضرورت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم خواہ مخواہ سابقہ سرمایہ کی توڑ پھوڑ میں لگ کر جدید کوشش سے دل چرائیں کیوں جدید سرمایہ کی کوشش نہیں کی جاتی اور کیوں۔ اس فیضان اور ملکہ تو جنیع اور اختراع سے کام نہیں لیا جاتا۔ جو قدرت نے ہمیں بخش رکھا ہے جس طرح ہمارے اسلاف اس میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ اسی طرح ہم بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس پچھلے نمونے موجود ہیں ان کے نقش ساخت پر ہم بڑی خوبی سے جدید الفاظ کی ٹکسال تیار کر سکتے ہیں۔ اور رفتہ رفتہ ان کی استعمالی رفتار اور مؤقتہ مشق سے ہماری فتوحات کی بھی ایک روز وہی قدر و قیمت ہو جائے گی۔ جو سابقہ الفاظ اور سابقہ اصطلاحات کی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں کون سی قباحت اور بدشگونی ہے

یا تو ہمیں یہ ثابت کرنا چاہیے کہ جتنا ہمارا پہلا سرمایہ اور ذخیرہ ہے وہ آسمان سے اترا تھا یا فرشتے سکھا گئے تھے۔ جس ملکہ اور جس قوت یا جس اجتہاد کے ماتحت ہمارے اسلاف نے زبان کو توسیع دی تھی وہی ملکہ وہی قوت اور وہی اجتہاد ہمیں بھی حاصل ہے۔ جو ضرورتیں پہلے تھیں ان سے بڑھ کر اب بھی ہیں۔ اور دن بدن اور بھی عائد ہوتی رہتی ہیں۔ جس طرح ہماری ضرورتیں ہمارا تمدن ہماری تہذیب ہماری معاشرت اور ہمارے کام کاج رفتہ رفتہ ترقی کرتے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہماری زبان اور سرمایہ زبان بھی ترقی پاسکتا ہے جن زبانوں کا سرمایہ بہت ہی کم یا نکما ہے وہ رفتہ رفتہ دوسری زبانوں سے اپنے اغراض پورے کرتی رہتی ہیں۔ یہ اردو زبان کیا ہے کچھ خود ساختہ اور کچھ چند زبانوں ہندی۔ بھاشا فارسی اور عربی وغیرہ کا مجموعہ یا توڑ مروڑ اور منقلبہ صورتیں اب اس میں انگریزی اصطلاحات بھی طوعاً کرہاً ملتی جاتی ہیں۔ اور بعض حصے اس کے محض جدید اختراع اور جدید اندوختہ ہیں۔ کوئی زبان آسمان سے براہ راست نہیں اترتی البتہ فیضانِ قدرتی اور ملکہ وہبی کے تحت انسان کے دل و دماغ سے نشو و نما پاتی اور اجتہادی تصرفات کے ذریعہ سے ترقی پذیر ہوتی ہے خدا نے خود ہمارے دل و دماغ میں اسماء اور الفاظ کا ایک سرمایہ اور ذخیرہ ودیعت کر رکھا ہے۔ اور ہم خود اپنی طبیعت ہی سے مختلف الفاظ بنا سکتے ہیں۔ اور وہی سرمایہ رفتہ رفتہ مختلف صورتوں اور مختلف اشکال میں صورت پذیر ہوتا رہتا ہے۔

بیسیوں نہیں صدہا۔ صدہا نہیں ہزاروں لفظ با معنے بے معنی اب بھی ہم اپنے دل و دماغ سے بناتے اور بنا سکتے ہیں لوگ غور نہیں کرتے ورنہ انہیں پتہ لگ جائے کہ کس قدر الفاظ رفتہ رفتہ دنیا کی زبانوں میں ملتے جاتے ہیں۔ کچھ ہماری ساخت ہوتے ہیں اور کچھ دوسری زبانوں میں سے

منتقل ہو کر آتے ہیں۔ بعض الفاظ محض اتفاقی جنم لیتے ہیں۔ بغیر ارادہ منہ سے نکل جاتے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ دوسرے یا سابقہ الفاظ میں مل کر استعمال ہونے لگتے ہیں۔ دنیا کی ہر ایک زبان میں اشیاء کے نام مختلف الفاظ میں ہیں مثلاً پانی۔ مٹی۔ ہوا۔ اگ۔ آسمان۔ زمین۔ ستارے۔ سیارے۔ چاند۔ سورج۔ پرند۔ چرند۔ درند۔ درخت۔ پتا۔ ٹہنی۔ پھل۔ گل۔ گلاب۔ اونچ۔ نیچ زیر۔ زبر۔ ہر زبان میں یہ الفاظ جداگانہ صورت اور معانی رکھتے ہیں اگر یہ اجتہادی تصرف نہ ہوتا تو ایسا اختلاف بھی نہ ہوتا۔ جیسے جیسے موقعہ ملتا گیا۔ الفاظ بنتے گئے۔ کسی نے کسی رنگ کا لفظ بنا لیا۔ اور کسی نے کسی رنگ کا میں نے ایک شئے زمین سے اگتی ہوئی کو درخت کہا اور دوسرے نے شجر تیسرے نے ٹری دیکھنے والے اور نام رکھنے والے مختلف تھے ہر ایک کے دل و دماغ بھی جدا جدا تھے ہر شخص نے اپنے اپنے اجتہاد کے ماتحت نام رکھ دیا بات اور شئے ایک ہی تھی مفہوم ایک ہی تھا۔ تعبیر جدا جدا کی گئی۔

ہر کسے را اجتہادے دیگر ست

اب بھی ایک ایسی شئے ایسی چیز چند ایسے لوگوں کو جو اس سے واقف نہیں دکھا کر پوچھو کہ اسے تم کیا سمجھتے ہو۔ اور اس کا نام تمہاری سمجھ میں کیا کچھ ہوسکتا ہے تو وہ اپنے اپنے مذاق اور اجتہاد کے ماتحت اسے جدا جدا ناموں ہی سے تعبیر اور موسوم کرینگے کوئی کچھ کہے گا کوئی کچھ اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ شروع میں ہی جب ہماری نظروں سے مختلف اشیاء مختلف چیزیں مختلف صورتیں مختلف کیفیات گزریں تو ہم نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق ان کا نام رکھا اور ان کی مختلف تعبیریں کی گئیں۔ دیکھو پانی ایک ہی ہے لیکن اس کے نام ہر زبان میں مختلف ہیں۔ یہ کیوں اس واسطے کہ ہر شخص

نے اوسکی تعبیر جداگانہ کی چھوٹی عمر کے بچے کچھ اور ہی کہکر پانی مانگتے ہیں ۔ اور
مائیں اُن کا مطلب سمجھکر پانی دے دیتی ہیں ۔ یہی صورت شروع میں پہلے انسانوں
کی بھی تھی وہ بھی ان بچوں ہی کی طرح اشیا پیش آمدہ کے نام رکھتے اور ان کی تعبیر
کرتے تھے ۔ جب کوئی شے دیکھتے اور کوئی سمان پاتے تھے تو ان کے دل و دماغ
میں ایک قسم کا تردد پیدا ہوکر انہیں اسبات پر مجبور کرتا تھا کہ وہ اپنے اپنے
رنگ اور مذاق کے مطابق اس کی تعبیر کریں اور اس کا کوئی نہ کوئی نام بھی رکھیں
ان کے منہ سے کچھ نہ کچھ نکل جاتا تھا ۔ وہی رفتہ رفتہ زبان زد ہوتا گیا ۔ یہاں
تک کہ اور ابنائے جنس بھی اس سے آشنا ہونے گئے ۔ اور لسانی دائرہ میں
اسے جگہ مل گئی ۔ اور وہ زبان کا ایک رکن اور ایک لفظ سمجھا گیا ۔ دیکھو جب ہم کوئی
شے کوئی سمان دیکھتے ہیں جس سے ہم واقف نہیں ہوتے تو ہم فوراً ہی یہ سوچنے
لگتے ہیں کہ یہ ہے کیا ۔ اگر ہم اسے دریافت نہیں کر سکتے تو پھر اس کی تعبیر ان الفاظ
میں کرنے لگتے ہیں ۔ جو یا تو ہماری زبان میں پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں
اور یا بالکل نئے ہوتے ہیں ۔ اگر دیکھنے والے چند شخص ہوتے ہیں تو ہر شخص
جداگانہ تعبیر کرتا ہے ۔ یہی حال اور یہی کیفیت شروع میں بھی تھی انسان اسوقت
دنیا میں وجود پذیر ہوا جب سب اشیاء اور سب سامان اس کی پیشوائی اور
خیر مقدم کے واسطے پہلے ہی سے موجود تھے ۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی اپنے
ارد گرد ایک بچہ کی طرح اپنے تئیں مختلف اشیاء اور ایک وسیع ماحول میں پایا
سوائے اس کی فطرت اور فیضان قدرت کے اور کوئی اس کا استاد اور رہبر یا ہم نوا
نہیں تھا وہ اوّل تو خاموشی سے ارد گرد دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سوچتا
رہا کہ یہ کیا ہے سوچتے سوچتے وہ مختلف رنگوں میں ان کی تعبیریں کرنے
لگا انسان کی سرشت میں یہ داخل ہے کہ وہ جب کوئی شے کوئی جدید سمان

دیکھتا ہے تو اس کا نام رکھنے اور اس کی کیفیت دریافت کرنے پہ لگ جاتا ہے
حتی الامکان وہ نہیں چاہتا کہ کوئی شے کوئی سماں اسکی دریافت سے باہر رہے
اور اس کا وہ نام نہ رکھ دے۔ یہی بات یہی عادت تفحص اسے دور تک لئے جاتی اور
صدہا مراحل سے آشنا کرتی ہے۔ ہر ایک قسم کی ترقی اور زبانوں کی وسعت
اور اختراع کا موجب اور علت یہی جنون یا یہی خبط اور یہی قوت ہے۔ گو انسان
شروع میں فطرتاً گنگا بہرہ نہیں تھا۔ مگر اشیا اور کیفیات کے ناموں حقیقت اور
تعبیرات سے محض ناواقف تھا۔ اس کی فطرت نے زور مارا اور وہ تعبیرات پر کامیاب
ہو گی۔ وہی تعبیرات اب اسکی زبانیں اسکی بولیاں اس کے اجتہاد اور اس کا دماغی
نشو و نما ہے۔ جیسے شروع میں یہ قوت تھی۔ ویسے ہی اب بھی ہم میں وہی قوت
اور وہی ملکہ موجود ہے اب بھی ہم اس سے وہی کام لے سکتے ہیں جو پہلے لیتے
رہے ہیں۔ اور اسی طرح ہم اب بھی اس سے ایک حد تک کام لیتے ہیں وہ قوت
اور وہ ملکہ بیکار نہیں رہتا۔

جن زبانوں نے ترقی نہیں پائی اس کا یہ موجب نہیں کہ وہ ترقی نہیں
کر سکتیں یا ان کے بولنے والوں کے دل و دماغ ایسا ملکہ اور ایسی قوت نہیں
رکھتے۔ بلکہ یہ کہ وہ ایک ہی مرکز پر پہنچ کر چھوڑ دی گئیں اور اہل زبان وہیں
ٹھہر گئے۔ اور قوتوں اور ملکات سے کام نہ لیا گیا۔ ان کا تمدن اور ان کی
تہذیب جامد ہی رہی مختلف قوموں سے ان کا ملنا جلنا اور آمد و رفت
دن بدن محدود ہوتی گئی۔ اگر وہ اپنی قوتوں اپنے ملکات سے کام لیتے
اور علمی تمدنی و تہذیبی دائروں میں ان کی ترقی ہوتی رہتی اور انکی آمد
و رفت بھی دوسرے اقطاع دنیا میں جاری رہتی اور دوسری ترقی یافتہ
نسلوں سے ان کا سابقہ پڑتا تو ان کی زبانیں بھی ترقی پا جاتیں اور انہیں

انہیں بھی وہی وسعت نصیب ہوتی جو دوسری بعض زبانوں کے حصّہ میں آچکی ہے۔ قوتوں اور ملکات کا کچھ قصور نہیں انہیں بدقسمتی سے کام میں ہی نہیں لایا گیا۔ کمال زبان بھی انسان کے دوسرے کمالات کی طرح ایک ارتقائی کمال ہے اگر دوسرے کمالات ترقی پا سکتے ہیں تو اُسے بھی نشو و نما ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی ترقی پا سکتا ہے غیر ترقی یافتہ اور محدود زبانیں صرف اس وجہ سے محدود ہیں کہ ان کی ترقی کا سامان رایگان دیدیا گیا ہے۔

زبانوں کی اصلاح اور درستی کے واسطے بھی دوسرے سامان اور جد و جہد کی ضرورت ہے۔ جو انسان کی دوسری تمدنی علمی وغیرہ ضروریات کے واسطے لازمی ہے۔ دیکھو دنیا کے لباسوں میں کس کس قسم کی اب تک تراش خراش ہو چکی ہے اور رفتہ رفتہ کیا کچھ ہو رہی ہے۔ انسان ایک صورت پر رہنا پسند ہی نہیں کرتا۔ اور نہ ضرورتیں اسے ایک ڈھانچے پر رہنے ہی دیتی ہیں۔ خواص کا لباس جیسے عوام سے الگ ہوتا ہے اسی طرح اُنکی زبان بھی الگ ہوتی ہے پھر ان میں سے بھی پڑھے لکھوں کی زبان کچھ اور ہی رنگ رکھتی ہے اور ان پڑھوں کی کچھ اور شہریوں کی بولی کچھ۔ اور دیہات اور قصبات کی کچھ۔ یہ فرق صرف صحبت۔ تمدن اور ضروریات کے اعتبار ہی سے ہوتا ہی جو لوگ ہمیشہ جنگلوں میں ہی رہتے ہیں وہ ان اشیا سے کسطرح واقف ہو سکتے ہیں۔ جو قصبات اور شہروں میں پائی اور برتی جاتی ہیں۔ دیہاتی مدارس میں عموماً یا شروع میں وہ باتیں نہیں سکھائی جاتیں جو قصباتی اسکولوں اور کالجوں میں سکھاتے ہیں۔ جب انسان کی صحبت اور تمدن ترقی پذیر ہوتا ہے تو اس کی بولی اور زبان بھی رفتہ رفتہ منجتی جاتی ہے۔ مہذب لڑکوں اور لڑکیوں کی زبان پر جو الفاظ اور جو فقرات آتے ہیں وہ گنوار لڑکوں

اور لڑکیوں کی زبان پر نہیں آ سکتے جب ایک پھوہڑ اور گنوار لڑکی خادمہ کے طور
پر کسی پڑھے لکھے خاندان میں جاتی ہے تو چند ہی دنوں میں اس کی زبان سے بھی
وہ الفاظ نکلنے لگتے ہیں جو اس کے ماں باپ کی زبان سے بھی کبھی نہیں نکلے تھے
وہ زبانیں جو محدود اور ناکامل شمار ہوتی ہیں اُن میں بھی ترقی کا مادہ موجود ہے
لیکن انہیں بدقسمتی سے کوئی موقعہ نہیں ملا میرا اپنا مذہب یہ ہے کہ۔
زبانیں اس قدرتی فیضان اور وہبی ملکہ کے ماتحت ہستی پذیر ہوئی اور
ہوتی ہیں۔ جو قدرت نے ہمیں دے رکھا ہے۔

جتنی زبانیں اس وقت دنیا کے پردہ پر موجود ہیں اور جو بولی جاتی
ہیں یہ سب فطرتی رنگ میں طبعی ہیں اور عملی رنگ میں خود ساختہ اور خود
پیدا کردہ۔

جتنے الفاظ ان زبانوں میں متلفظہ ہیں وہ سب کسی نہ کسی زمانہ
میں بنے اور بنائے گئے ہیں۔ یا کسی دوسری زبان سے منتقل ہو کر آئے

ہم خود الفاظ اور معانی کے موجد اور مخترع ہیں۔
اب بھی ہم ایسا ایجاد اور اختراع کر سکتے ہیں۔

جدید زبان

۲۲ جولائی ۱۹۱۶ء

جسطرح جدید الفاظ بن سکتے یا ہم بنا سکتے ہیں اسی طرح اگر کوئی
قوم اس وقت بھی باوجود کسی پہلی زبان رکھنے کے بھی کوئی جدید
زبان بنانا چاہے تو کسی نہ کسی حد تک بن سکتی ہے یا اپنی پہلی زبان میں
جدید الفاظ ملا سکتی اور بہت کچھ اضافہ کر سکتی ہے۔
بے شک اس میں بہت کچھ مشکلات حائل ہونگی لیکن یہ مشکلات اُن

مشکلات سے کم ہی رہیں گی جو شروع شروع میں ہر ایک زبان کے بنانے کے
وقت ہمارے اسلاف کو عاید ہوتی رہی ہیں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں اُن
سب کے الفاظ اور فقرات بھی رفتہ رفتہ ہی ہماری زبانوں پر چڑھے اور مانوس
ہوئے ہیں جس طرح ہم ان سے رفتہ رفتہ مانوس ہوتے گئے ہیں۔ اور ہماری
زبانیں اُن سے آشنا ہو کر ان کا استعمال کرنے لگی ہیں اسی طرح اور جدید
الفاظ بھی رفتہ رفتہ کام میں آنے لگیں گے۔ جس طرح پہلی زبانوں میں
دوسری ہمسایہ زبانوں سے کے الفاظ نقل ہوتے آئے ہیں اسی طرح اب بھی
ہو سکتے ہیں کچھ اصلاً کچھ نقلاً۔ کچھ لفظاً۔ کچھ معناً۔ کچھ لہجتاً۔ کچھ قیاساً
کچھ طرزاً۔ کیونکہ جب مختلف زبانوں کے ہوتے اور بولتے ہم ایک
جدید زبان بناتے اور اُسے استعمال بھی کرتے ہیں۔ تو وہ نئی زبان ہمسایہ
زبانوں سے بھی کچھ نہ کچھ لیتی ہی ہے جیسے کہ عموماً زبانوں کا دستور ہے۔ اہم
سوال یہ ہے کہ اب کسی جدید زبان کے بنانے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں
کیونکہ بہت سی زبانیں تدوین پا چکی ہیں۔ اگرچہ موجودہ حالات اور ضروریات
کے اعتبار سے کوئی ایسی ضرورت نہیں معلوم ہوتی لیکن پھر بھی بعض ضروریات
کے وجہ سے جدت پسندی متروک نہیں ہو سکتی۔

دیکھو ہندوستان میں حرفت کاروں کی زبانیں بزرزری سری
اور مرمزی کچھ نہ کچھ بولی ہی جاتی ہیں۔ اور کسی وقت ان کا کوئی نام بھی نہیں
جانتا تھا اسی طرح یورپ میں (اسپرنٹو) زبان کی بنیاد ڈلی جاتی
ہے۔ سیاسی اور تجارتی معاملات میں مرموزہ الفاظ میں بھی بات چیت
کی جاتی ہے وہ اگرچہ کچھ اشارات ہی سے ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی انہیں
ایک زبان ہی کہا جائے گا۔ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں جدید ضروریات کسی

جدید مشترکہ زبان کی ضرورت پر زور دیں کیونکہ واقعی وحدت زبان کی ایک اشد ضرورت ہے۔ اگر ساری دنیا یا کم سے کم بر اعظموں کی ایک ہی زبان ہوتی تو تمدن تجارت لٹریچر اور سیاست میں کس قدر سہولتیں ہوتیں۔ اس وقت ساری دنیا کے ذخائر علوم و فنون اور کمالات کا جلوہ ایک ہی سٹیج پر اور ایک ہی منزل پر ہو سکتا۔ اگرچہ اس صورت میں بوقلمونی کا تماشہ باقی نہ رہتا اور خوش آیند اختلاف کا نظارہ ایک حد تک اٹھ جاتا۔ مگر جس قسم کی یکسانیت اور ایک سو تی ہوتی وہ بھی کم لطف خیز نہ ہوتی وحدت کے اندر بھی دلچسپیاں اور وہ مزے ہوتے جو اختلاف میں نہ ہوتے تماشائے وحدت میں وہ خوبیاں اور وہ عجائبات نظر آتی کہ لطف کثرت بھول جاتا۔ دائرہ وحدت کے اندر ہی ہر ایک قسم کی بوقلمونی پیش نظر ہو کر ناظرین کو محو تماشا بناتی۔

ہم جدید زبان بنا سکتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ ترقی بھی پا سکتی ہے لیکن موجودہ زبانوں کے ہوتے یہ معاملہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن کا ہے اس سے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی موجودہ زبانوں کو ترقی دیں اور یہ سوچیں کہ کس طرح یا کن کن وسائل کے ماتحت انہیں ترقی ہو سکتی ہے۔ پہلی زبانوں ہی کے اندر چند الفاظ جدید محاورات جدید تعبیرات کا اضافہ ہو سکتا ہے دوسری زبانوں کے خوش آیند جامع الفاظ معانی الفاظ اصطلاحات کو بھی ضرورتاً ایک خوش اسلوبی سے لیا جا سکتا ہے۔ اور ان کے طرز پر خود اپنی ہی زبان کے بھی اندر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بڑی پیچیدہ بحث ہے کہ ...... آیا دوسری زبانوں کے الفاظ۔ اصطلاحات محاورات اور فقرات کو بھی دوسری زبان میں لیا جائے یا نہیں۔

ضرورتاً تو کوئی قید روا نہیں رکھی اندر پائندہ ترقی ہے۔ اور ہم

کوئی ایسی زبان سنتے اور دیکھتے بھی نہیں جس نے دوسری زبانوں سے کچھ نہ کچھ نہ کیا ہوتا جس میں دوسری زبانوں کے الفاظ نہ ملے ہوں۔ خواہ ارادتاً خواہ اتفاقاً ملاوٹ ضرور ہے۔ ایک بر اعظم کی زبانیں تو بالخصوص اس سے خالی اور محفوظ نہیں رہتیں۔ یورپ اور ایشیا کی زبانوں میں ایک خاص مقدار میں ایسا اختلاف اور انتقال پایا جاتا ہے۔ انگریزی زبان جو بہت کچھ جوبن اور رونق اور وسعت رکھتی ہے وہ گویا مختلف زبانوں کا ست ناچہ ہے۔ فرنچ زبان بھی اس زد سے محفوظ نہ رہی ایشیائی زبانوں میں عربی اور سنسکرت زبانیں قدیمی اور سچا ہے خود جامع زبانیں ہیں مسئے میل جول نے ان میں بھی بہت کچھ اضافہ کر دیا۔ یہ بھی باوجود اسقدر اجنبیت کے اختلاط سے خالی نہ رہیں شام اور مصر کی عربی اس پر شاہد ہے۔ صدہا الفاظ توڑ مروڑ کر شامل کئے گئے ہیں۔ ذرا دمشق اور قاہرہ میں جا کر دیکھو کہ کیسی گڑبڑ ہو رہی ہے۔ قاہرہ میں تو دن بدن الفاظ السنہ غیر کا اضافہ ہو رہا ہے۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ بھی اس سے نہ بچے۔ مکہ والوں کو بولتے سنو تو تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ کس قدر الفاظ خلط ملط ہو چکے ہیں۔ اور دن بدن ہو رہے ہیں ایران کی زبان بھی محفوظ نہ رہی یہ رو اب رک نہیں سکتی۔ کیونکہ باہر کے لوگوں کی آمد و رفت یہ رستہ ہمیشہ جاری رہے گی۔ ہاں بدوؤں کی زبان ابھی کسی حد تک پاک صاف و خالی ہے۔ مگر یہ بھی کب تک رہ سکتی ہے۔ اگر مکہ و مدینہ و جدہ کے مابین ریل جاری ہو گئی تو پھر جس طرح مکہ و مدینہ دن بدن اپنی زبان میں اضافہ کر رہا ہے اسی طرح مضافات کی زبان بھی خالی نہ رہے گی۔ جب سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کا دور دورہ ہے۔ تب سے انگریزی کے بعض الفاظ ہندوستانی زبانوں کا طوعاً کرھاً ضمیمہ ہوتے جاتے ہیں۔ عوام کی زبان میں بھی ایسے الفاظ

کا اضافہ نہیں ہو رہا ۔ پڑھے لکھے لوگوں اور تصنیف و تالیف میں بھی گھر کر رہے ہیں ۔ اردو میں بھی صدہا الفاظ دوسری زبانوں کے کھپ رہے ہیں ۔ اور ابھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا ہے ۔ پنجابی ۔ گجراتی ۔ بنگالی ۔ ملتانی ۔ سندھی اور دکھنی زبانوں کا بھی یہی حال ہے ۔ بعض اردو بولنے والے کبھی کبھی آپے سے باہر ہو کر کہتے ہیں کہ کیوں اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ آتے جاتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہی بجا اور یہ سلسلہ ہی بند نہیں ہو سکتا ۔ دامن زبان اردو وسعت چاہتا ہے اور اردو پاؤں پھیلا رہی ہے ۔ اگر دامن چھوٹا ہے تو پاؤں پھاڑ کر بھی باہر نکلیں گے اب کوئی روک نہیں سکتا یا تو اردو بولنے والے خانہ ساز الفاظ اور اصطلاحات سے کام لیں یا باہر سے مانگ کر گذارہ کریں نہ خود بنائیں اور نہ باہر کی منت اٹھاویں ۔ پھر گزارہ کیسے چلے چاروں طرف کے تمدن اور چاروں طرف کی تہذیب رواجات ۔ رسوم اور سلسلہ آمد و رفت منزل اردو میں امنڈا آ رہا ہے ۔ اردو چپکے چپکے دونوں ہاتھوں سے خیر مقدم کر رہی ہے کون بڑھتی دولت کا خواہاں نہیں اگر اپنے گھر میں کچھ نہیں تو کیوں بازار سے نہ لیں ان حالات میں برائی ہی کیا ۔ کیوں نہ سہولت کے ساتھ دوسری زبانوں سے مانگ تانگ کر گذارہ کر لیں ضرورت کا سلسلہ رک تو سکتا نہیں دو ہی صورتیں ہیں ۔

(الف) یا تو خانہ ساز سامان سے گذارہ کریں ۔

(ب) یا مناسب امداد باہر سے لیں ۔

خود ساختہ یا خانہ ساز سامان کا تیہ بے شک مشکلات رکھتا ہے ۔ مگر بمصداق "الضرورت ام الایجاد" آخر کچھ کرنا ہی پڑے گا ۔ اگر ایک کمیٹی یہ کام اپنے ہاتھ میں لے تو کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا ۔ یا کچھ نہ کچھ ہو سکتا ہے یا فرداً فرداً مشاہیر قوم جنہیں زبان اور فلسفہ زبان سے خصوصاً دلچسپی ہو

اپنے اپنے مبلغ علم اور مذاق کے مطابق الفاظ اور اصطلاحات وضع کریں۔ اور پھر انہیں کمیٹی ترقی اردو میں بھیجدیں وہاں سے ان کی تنقید ہو کر فیصلہ کیا جائے اس وقت انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن میں ایک بڑی حد تک کام کر رہی ہے وہی اس کام کو بھی اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ اگرچہ یہ خیال ایک خیال ہی سمجھا جائے گا لیکن یہ اس کا مانع تو نہیں کہ اس پر غور ہی کیا جائے ممکن ہے کہ اس سے کوئی راہ نکلے۔ اور یہی شگوفہ پھوٹے۔

اور اگر یہ نہیں ہو سکتا اور پھر دوسری طرف ہم اردو کی ضروریات سے بھی انکار نہیں کر سکتے تو پھر دوسری زبانوں سے مدد لینے کے قواعد وضع ہو کر کوئی اور راہ نکالی جائے جنہیں یہ دکھایا جائے کہ کن کن صورتوں اور کن کن حالتوں میں دوسری زبانوں سے الفاظ لینے چاہیئے یا لئے جا سکتی ہیں یا کس طرح انہیں اردو میں کھپایا جا سکتا ہے۔ کوئی چاہے اقرار کرے چاہے انکار چاہے خوش ہو اور چاہے ناخوش اردو اب کسی حالت میں بھی دوسری زبانوں کے امداد سے انکار نہیں کر سکتی۔ ہندی۔ بھاشا۔ فارسی۔ عربی تو اس کی منہ بولی مائیں ہیں۔ اب انگریزی بھی چوتھی ماں بننا چاہتی ہے۔ چاہے لفظی پہلو سے اسکی پرورش کرے اور چاہے معنوی پہلو سے کیا اردو دان اس واقعہ سے انکار کر سکتے ہیں کہ اب تک انشائی رنگ میں اردو نے ایک حد تک انگریزی لٹریچر کی نقل اتارنے میں کمی نہیں کی ہے اور دن بدن اس کا اردو پر کیسا گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ رفتہ رفتہ انگریزی کے الفاظ بھی تحریر اور تقریر میں کھپتے جاتے ہیں اب تو عوام بھی بولنے لگے ہیں۔ نمبر۔ کلاس کالج۔ سمن۔ وارنٹ۔ ڈگری۔ جج۔ ڈویژنل جج۔ جیکٹ۔ کوٹ آوٹ کورٹ۔ ایڈیٹر۔ ٹکٹ۔ ٹرین۔ کورٹ۔ پلیڈر۔ موٹر۔ بائیسکل

پلیٹ فارم - انجن سگنیلر - سیگرٹ - مسٹر - مس - وغیرہ - وغیرہ اسما کون نہیں بول سکتا اور کون نہیں بولتا - اب یہ زبانوں سے نہیں اتر نے کے اس طرح اور بھی وردِ زبان ہوتے جائینگے خط و کتابت کا فریبا رنگ ڈھنگ ہی بدل گیا - انگریزیت دن بدن غلبہ پاتی جاتی ہے - باوجود ایک قسم کی اجنبیت اور باوجود کراہت اور نفرت کے شاعری بھی انگریزی پٹہ پہنتی جاتی ہے گل و بلبل زلف و خال کی .... کہانیاں بدل بدل علمی قومی اور نیچرل مضامین کا رنگ اختیار کرتی جاتی ہیں تذکرے اور کہانیاں ناولوں کے رنگ میں آگئیں قومی ضروریات کے ماتحت سمان ہی کچھ اور ہوگیا - اور لٹریچر کا وہ رنگ اور وہ طرز ہی نہ رہا جو پہلے تھا جسطرح فارسی اور عربی نے اثر کیا تھا - اور جس طرح گذشتہ ہندی اور فارسی عہد میں کایا پلٹ ہوئی تھی - وہی صورت اب بھی حائل ہو رہی ہے - میرے اور کسی اور کے انکار سے ہونا ہی کیا ہے - کون چاہتا ہے کہ کسی دوسرے کا دست نگر ہو - لیکن جب ضرورت ستا رہی ہے اور سامنے بازار کھلا نظر آتا ہے اور چوکھا اور سستا مال ملتا ہے - تو پھر کوئی خالی کیوں رہے ہم تو چاہتے ہیں کہ گھر کا ذخیرہ بھی کام آئے اور کسی سے مانگنے تانگنے کی نوبت نہ پہنچے - مگر جب گھر میں وافر سامان نہیں اور افراد کنبہ کو ادہر توجہ بھی نہیں تو پھر اس میں عیب ہی کیا - کہ دوسری زبانوں سے لفظی اور معنوی رنگ میں ضروری مدد لی جائے اگر اب تک ہندی زبان سے جو اردو کی حقیقی ماں ہے - پوری مدد لینے کا موقعہ نہیں ملا تو اب مناسب مدد لینے میں کوئی حرج نہیں - ہندی بھاشا - سنسکرت میں صدہا الفاظ ایسے مل سکتے ہیں جن کی ملاوٹ اردو میں بوجہ احسن ہو سکتی ہے - کسی زبان اور کسی زبان کی عبارتوں میں دوسری زبان یا اسی زبان کے الفاظ کا کھپانا

ایسا ہی ہے۔ جیسے کہ کسی عمارت میں اینٹوں اور پتھروں کا جمانا اور لگانا مقدم
ضرورت خوبصورتی اور موزونیت کی ہے۔ جو الفاظ دوسری زبانوں کے
موزونیت صوری اور مناسبت معنوی کے اعتبار سے اردو زبان میں کھپ
سکتے اور پھب سکتے ہیں انہیں کھپایا اور پھبایا جائے اور اسی طرح رفتہ
رفتہ خود ساختہ یا خانہ ساز الفاظ سے بھی کام لیا جائے ان دونوں طریقوں
سے اردو زبان ہو یا کوئی دیگر ترقی اور وسعت پا سکتی ہے۔ صرف زبانی گفت
وشنود سے کوئی زبان ترقی نہیں پا سکتی اور نہ اُسے وسعت علمی کا دعوے
ہو سکتا ہے۔

اظہار خیالات کے متفرق طریقے

ایک وہ زمانہ تھا کہ انسان اپنے خیالات کا اظہار حرکات اور سکنات کے
ذریعے سے کرتا تھا رفتہ رفتہ جذبات کے نمو سے اور ضرورت کے پیدا ہونے
سے صوتی رنگ میں اظہار مطالب ہونے لگا۔ کبھی اشاروں و کنایوں سے
کام لیا گیا۔ اور کبھی مختلف نقوش اور نشانات سے۔ یہانتک کہ صوتی
عمل میں ترقی ہوتی گئی اور منہہ سے رک رک کے الفاظ نکلنے لگے۔ حرکات اور
سکنات نقوش نشانات اور اشارات و کنایات کی جگہ ان سے کام لیا
شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ یہہ بات سمجھ میں آ گئی کہ مناسب اور عملی طریقہ اظہار
مطالب کا یہی ہے یہہ تو اس وقت کی باتیں ہیں جب انسان کے پلے میں
سوائے آں آؤں کے اور کچھ بھی نہیں تھا تو اب تو خدا کے فضل و کرم سے
بفحوائے عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا حضرت انسان کی جھولی میں بہت کچھ ہے
جب اس کی بے سروسامانی میں انسان بہت کچھ کر چکا ہے۔ تو اس موجودہ

حالات میں وہ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ کیا گیا اور بہت کچھ کیا جا سکتا ہے اور بہت کچھ ہو سکتا ہے ہم خود بھی جدید الفاظ جدید اصطلاحات وضع کر سکتے ہیں اور دوسری زبانوں سے بھی مناسب مناسب امداد لی جا سکتی ہے میری سمجھ میں ابتک یہ بات نہیں آئی کہ کیوں غیر زبانوں کی امداد مناسبے ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ یہ روڑ گننے کی نہیں دن بدن ایک نامکمل زبان کا دوسری زبان کا دست نگر ہونا ایک اضطراری عمل ہے اور اس سے اُس وقت تک گریز نہیں کہ یا تو اس زبان کے بولنے والوں کی تمدنی اور اقتصادی ضروریات کا خاتمہ ہو جائے اور یا خود اپنا سرمایہ مہیا کیا جائے ایسا ہونا قدرت یا قانون قدرت کے خلاف نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کوئی قوم صرف اپنے ہی زور بازو پر گزارہ نہیں کر سکتی ایک آدمی دوسرے کو مختلف رنگوں میں مدد دے رہا ہے کسی حد تک یہی حالت زبانوں کی بھی ہے اگرچہ بعض زبانیں محض اپنے ہی زور بازو پہ چلتی اور کام دیتی ہیں۔ مگر پھر بھی نہیں کسی نہ کسی رنگ میں دوسری السنہ سے کچھ نہ کچھ لینا ہی پڑتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ بعض زبانیں افلاس کی حالت میں لیتی ہیں اور بعض محض جدت کے اعتبار سے یا کسی حسن لفظی اور حسن معانی کی وجہ سے دیکھو اچھی اچھی عمارتوں میں دور دور کے خوش نما پتھر اور خوش نما اینٹیں کس عمدگی سے لگائی جاتی ہیں۔ صرف اس وجہ سے نہیں کہ اور پتھر اور اینٹیں ملتی نہیں بلکہ اس لئے کہ خوب صورت خوش آیند خوشنما اور نئے نمونہ کے پتھر اور اینٹیں لگانا موزون معلوم دیتا ہے اور یہ ایک حسن انتخاب ہے اور حسن تعمیر ہے۔

جو لوگ اس کوشش میں ہیں کہ ان کی زبان میں کوئی لفظ بھی غیر

زبان کا دخل نہ پائے ان کے واسطے یہ کوشش مبارک ہے۔ لیکن یہ سو ولینی کوشش
بظاہر حالت مشکور ہوتی نظر نہیں آتی۔ عربی زبان ایشیائی زبانوں میں سے
شروع ہی سے ایک وسیع الظرف زبان چلی آئی ہے۔ زبان دانوں کا یہ متفقہ
قول ہے کہ عربی زبان میں جس قدر ذخیرہ اسمار اور افعال کا پایا جاتا ہے خصوصاً
اسمار کا اس قدرت یہ ہی کسی اور دوسری ایشیائی زبان میں ہو۔ ایک ہی
لفظ بیسیوں معانی رکھتا ہے اور بیسیوں طرح پر اس کا استعمال کیا جا سکتا
ہے۔ لیکن اس پر بھی زمانہ کی ضرورتوں کی وجہ سے اس میں بیسیوں الفاظ
اس وقت دوسری زبانوں کے بولے جاتے ہیں اور دن بدن یہ ذخیرہ بڑھ
رہا ہے۔ مصر۔ شام۔ یروشلیم۔ دمشق۔ مکہ مدینہ۔ حلب۔ موصل۔ بغداد
و بصرہ میں جا کر دیکھو کہ کس قدر افراط سے غیر زبانوں کے الفاظ داخل
ہو رہے ہیں۔ اور کس شان سے لوگوں کی زبان پر اُن کا اطلاق ہو رہا
ہے۔

ایسے الفاظ ضرورتاً خواہ مخواہ ہی زبان سے نکلتے اور اطلاق پاتے ہیں۔
اپنی زبان میں جب ایک عام آدمی کو بھی پلیٹ فارم کا کوئی دوسرا مرادف
موزوں لفظ نہیں ملتا تو کیوں نہ اس سے کام لیا جائے۔ موٹر۔ بائیسکل
... اور ٹکٹ کا مفہوم جب ہم ایک سہولت اور موزونیت کے ساتھ
اپنی زبان کے کسی لفظ میں ادا نہیں کر سکتے اور ہمیں ایک مشکل کا سامنا
ہوتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم یہی الفاظ نہ بولیں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے
اگر ہم اپنا سکہ نہیں رکھتے اور نہ رائج کر سکتے ہیں تو دوسرا سکہ کیوں نہ
برتیں۔ اور کیوں اس سے کام کاج نہ چلائیں۔ تمدنی ضرورتیں تہذیبی
کاروبار اور اقتصادی اثر وہ ہیں جو دن بدن وسعت الفاظ وسعت خیالی

کی منادی کر رہے ہیں۔ قدم قدم پر نئی نئی کیفیتیں پیش آتی ہیں گھر کا سرمایہ اسقدر نہیں کہ ضروریات کا حامل ہو سکے اور نہ ہم سرمایہ کے اضافہ میں اپنے طور پر زور دیتے ہیں اس صورت میں (۳) تین ہی علاج ہیں۔

(الف) یا تو جدید الفاظ بنائیں

(ب) یا جدید اصطلاحات کی بنیاد ڈالیں

(ج) یا جدید توڑ پھوڑ کریں۔

اور اگر ہم یہ نہیں کر سکتے (کسی وقت ہمیں یہ کرنا ہی پڑے گا اور اب بھی خیال کرتے ہیں) تو پھر ضرورت کے مطابق کیوں نہ دوسری زبانوں سے مناسب اور موزون حالات میں امداد لیں اور ایسی امداد خواہ مخواہ نہ لی جائے بلکہ ضرورتاً جبکہ کوئی چارہ باقی نہ رہے۔

یہ مطلب نہیں کہ خواہ مخواہ ہی نمائیشی طور پر یا فیشن کے خیال سے کسی دوسری زبان سے مدد لی جائے اور خواہ مخواہ ہی غیر زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں ٹھونس دیئے جائیں جیسے کہ بعض شوقین اسکے عادی ہیں جب یہ کہا جاتا ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ لیئے جا سکتے ہیں تو اس کا مطلب ہمیشہ یہ ہوگا۔ کہ ضرورتاً ایسا کیا جائے۔ مثلاً ہماری زبان میں کوئی اصطلاح یا کوئی لفظ نہیں ملتا تو کوئی عیب نہیں کہ دوسری زبان سے مدد لی جائے ہمارے سامنے فارسی اور عربی و ہندی کی صدہا انتقالی مثالیں موجود ہیں ان ہی کے مطابق انگریزی زبان یا کسی دوسری علمی زبان سے بھی مدد لیجا سکتی ہے۔ بعض وقت ہم ایسے الفاظ بھی داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے مرادف خود ہماری زبان میں اچھا موجود ہوتے ہیں۔ اور بعض حالات میں وہ کافی جامع اور خوش آئند بھی ہوتے ہیں ان حالات میں خواہ مخواہ دوسری زبانوں کے

الفاظ کا بھرتی کرنا موزون طریقہ نہیں ہے۔ اور نہ قواعد لٹریچر کے ماتحت ایسی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اور نہ وہ مفید ہے۔ اگر کوئی شخص خواہ مخواہ ایسی ٹھونس ٹھانس کرتا ہے۔ تو وہ اپنی زبان کو جامع اور وسیع نہیں بنا رہا بلکہ اوسے مفلس محض ثابت کرتا ہے۔ وہ باوجود اپنے گھر کے سرمایہ ہونے کے بھی دوسروں سے ایک شرم ناک مدد لیتا ہے۔ لسانی تعمیر میں اوس جگہ دوسروں کی تعمیر سے اینٹ لیکر لگاؤ۔ جو جگہ یا جو کونہ خالی ہے۔ جس کونہ میں اپنی ہی اینٹ پہلے سے لگی ہوئی ہے یا لگ سکتی ہے۔ اوس میں وہی اپنی اینٹ لگی رہنے یا لگائی جائے۔

جب بعض مبصرین لسانی یا ماہرین علم اللسان دوسری السنہ کے الفاظ کے داخلہ کو برُا مناتے یا مکروہ سمجھتے ہیں۔ تو وہ بھی اس وجہ سے کڑھتے ہیں۔ کہ بعض لوگ خواہ مخواہ ہی الفاظ غیر زبان بھرتی کئے جاتے ہیں۔ نہ جوڑ دیکھتے ہیں نہ میل نہ مناسبت نہ موزونیت نہ ضرورت جو زبان پر آیا ٹھونس دیا۔ جو دل میں آیا بول دیا۔ جوڑ ایسا بے جوڑ لگاتے ہیں۔ جو کسی طرح موزون ہی نہیں اُترتا۔ بولنے اور سیکھنے ہی مکروہ معلوم دیتا اور ناموزون سُنائی دیتا ہے طبیعت اکتاتی اور دماغ چکراتا ہے۔ جس طرح ایک خوبصورت عمارت میں بے جوڑ اینٹ اور ناتراشا پتھر لگایا جانا بُرا لگتا ہے۔ اسی طرح فضول اور نمائش الفاظ کی بھرتی بھی بُری معلوم دیتی ہے۔ نہ سننے والے خوش ہوتے ہیں۔ اور نہ پڑھنے والے نہ بولنے والے اور نہ لکھنے والے اپنی زبان میں الفاظ ملنے پر بھی خواہ مخواہ دوسری زبانوں کے الفاظ بولنا اور لکھنا وہ غلطی ہے جو قانون لٹریچر کسی صورت میں معاف نہیں کرتا۔ اور نہ ضابطہ ادب میں اُس کا کوئی جواب ہے

صورِ انتقال الفاظ السنہ غیر

دوسری زبان کے الفاظ کن صورتوں میں دوسری زبان میں داخل کرنے چاہیئے۔ یا داخل ہو سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل صورتیں ایسی ہیں کہ جن میں ایک خوبی کے ساتھ الفاظ زبان غیر کا داخلہ ہو سکتا ہے۔

(۱) جب اپنی زبان میں کوئی جدید المفہوم لفظ نہ ملتا ہو۔ یا جب نقادان زبان خود ایسا لفظ بنا نہ سکیں۔)

(۲) اور اُسکے مقابلہ میں اُن معانی کے واسطے دوسری زبان میں کوئی لفظ موجود ہو

(۳) کوئی لفظ باعتبار حسن معانی وسعت مفہوم حسن صورت دوسری زبان میں جامعیت کے ساتھ موجود ہو۔ اور لیا جا سکتا ہو۔

(۴) کوئی لفظ زبان غیر عام طور پر صحیح معانی صحیح رنگ میں اپنی زبان میں رفتہ رفتہ جگہ پا چکا ہو۔ اور وہ ایسا ہی طبائع اور زبان سے مانوس ہو چکا ہو جیسے کہ اپنی زبان کا کوئی لفظ

(۵) کوئی علمی اصطلاح جو اپنی زبان میں میسر نہ ہو۔

(۶) کوئی مفرد لفظ جامع معانی کثیرہ دوسری زبان میں ہو۔ اور اپنی زبان میں نہ ہو۔

(۷) بعض تمدنی۔ سیاسی اور تجارتی الفاظ جو اپنی زبان میں نہ پائے جاتے ہوں۔ اور ضروریات کے اعتبار سے اُن کے سوا گزران ہی نہ ہو سکے۔

(۸) کسی فن کی اصطلاحات اور اسماء جن کا اپنی زبان میں بسہولیت

تہبیہ اور اضافہ نہ ہو سکے۔

(۹) کوئی ایسا لفظ جو کسی دوسری زبان میں جدید اجتہادات کے تحت نو مخترعہ اور نو ساختہ ہو جس کا قائمقام کوئی لفظ اپنی زبان میں نہ مل سکے یہ ایک استقرائی اندازہ یا ضابطہ ہے۔ ممکن ہے کہ ان ضروریات کے سوا اور باتیں بھی داخلہ کی موید ہوں۔ ایسی اجازت مشروط بہ شرائط اور مقید بہ قیود ہونی چاہیئے۔ شرطوں اور قیود سے آزاد ہو کر کسی شخص کا یہ حق نہیں ہے۔ کہ وہ سرمایہ زبان میں غلط شلط دوسری زبانوں کے لفظ داخل کرتا جائے۔ زبان ایک قومی سرمایہ ہے۔ اگرچہ عوام اُس کی قیمت اور اُس کی حرمت وعظمت سے ایک حد تک ناآشنا ہوتے ہیں۔ لیکن اہل زبان جو واقعی رنگ میں اہل ہیں اور مشاہیر زبان اُسکے محافظ اور خبرگیر ہیں۔ اُن کا عمل اور اُن کا طرز ایسے امور میں ایک ضابطہ اور اجازت ہے۔ اُس سے ہم اور تم کوئی بھی باہر نہیں جا سکتے۔

سرمایۂ الفاظ

۲۳ جولائی ۱۶ء

جب زبان کی بحث میں سرمایہ الفاظ کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُس وقت تین قسم کے سرمائے متصور ہوتے ہیں۔

(الف) ذہنی سرمایہ۔

(ب) مجتمعہ سرمایہ۔

(ج) سرمایہ غیر۔

سب سے وسیع اور سب سے اہم سرمایۂ ذہنی سرمایہ ہے۔ جس سے کوئی

قوم کوئی ملک کوئی فرد کوئی شخصیت خالی نہیں ہے۔ یہ گویا ہمارا جدّی
اور آبائی سرمایہ ہے۔ پیدا ہونے کے ساتھہ ہی مادر قدرت نے
یہ سرمایہ ہماری گھُٹّی میں رکھدیا ہے۔ اور ہمیں اس اجازت اور شرط کے
ساتھ سونپا گیا ہے کہ جسقدر اس میں سے خرچ کر سکتے ہو۔ کرو۔ مگر سوچ اور سمجھہ
کر۔ اس میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ جتنا خرچ کرو گے۔ اتنا ہی اور بڑھ
جائے گا۔ جسقدر اس سے کام لو گے۔ اتنا ہی اس میں اضافہ ہوتا
جائے گا۔ اگر سمجھہ بوجھہ کر اس سے کام لیا گیا۔ تو ایک فرد کا سرمایہ
ہی ایک خاصا سرمایہ ہو گا۔ نہ کسی اُستاد کی ضرورت ہوگی۔ اور نہ کسی
ماسٹر کی۔ خود بہ خود توجہ کرنے سے یہ سرمایہ کام دینے لگے گا۔ شروع میں
کوئی بیرونی سرمایہ اور خارجی سرمایہ نہ تھا۔ اوس وقت اسی سرمایہ کی
مدد سے حرکات سکنات اشارات کنایات اور نقوش و نشانات کی
کی منزلوں سے گزرتے گزرتے ان منازل موجودہ تک پہنچے۔ گو
شروع شروع میں انسان کی طبیعت سے ایک گھبراہٹ میں پڑ کر رُک
رُک کر الفاظ نکلتے ہوں گے۔ لیکن رفتہ رفتہ آسانی ہوتی گئی۔ بعض
وقت تو صرف صداؤں پہ ہی بس ہو جاتی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ ذہن کھلتا
گیا۔ اور زبان جاری ہوگئی۔ قوت طلاقت کام دینے لگی۔ اب تک دُنیا
کی عمر چاہے لاکھوں سال کہو۔ اور چاہے ہزاروں برس اس سرمایہ میں
کمی بیشی نہیں ہوئی۔ اسی آب و تاب سے موجود اور کام دے رہا ہے۔ ذرا کسی وقت
اناب شناب ہی کچھہ بول کر دیکھو۔ تمہاری طبیعت تمہیں جتا دے گی
کہ اندر کیا کچھ بھرا ہے۔ اور پھر اناب شناب چھوڑ تم کام کی باتوں پر
بھی آ کر دیکھہ سکتے ہو۔ کہ کتنی کام کی باتیں اس اندرونہ میں سے نکلتی اور

زبان پر آتی ہیں۔ یہاں بحث صرف سرمایہ کی ہے۔ یہ بحث نہیں کہ
اُس میں سے کام کا کتنا حصہ ہے۔ اور فضول کتنا۔ یہ تنقید تو بعد میں ہونی
چاہیئے اول سوال یہ ہے کہ انسان کا اندرونہ کیا کچھ اپنے اندر رکھتا ہے۔ کسی
انسان کے بچہ کو سارا دن بلواتے رہو۔ وہ کچھ نہ کچھ بولتا ہی جائے گا
یہ جدا بات ہے۔ کہ وہ تھک کر رہ جائے۔ لیکن اوسکے اندرونہ میں سے
مختلف رنگ و روپ کی آوازیں اور الفاظ نکلنے بند نہ ہوں گے۔ کیا یہ
سرمایہ قابل فخر نہیں ہے۔ اور کیا ہم اس سے کام نہیں لے سکتے۔ لے
سکتے ہیں۔ اور لے رہے ہیں۔ یہ جتنی زبانیں اور زبانوں کے لاکھوں الفاظ
ہماری زبان سے مانوس اور ہمارے لغات میں درج اور زبان سے وابستہ
ہیں۔ یہ سرمایہ وہی کا اثر اور نتیجہ ہیں کیا ہمیں قدرت کا شکر گزار نہیں ہونا چاہیے
جن زبانوں جن لغات جس لٹریچر جس ادب جس انشا پر ہمیں فخر ہے۔ وہ
صرف ہمارے اندرونی سرمایہ ہی کا کرشمہ ہے۔ اور پھر یہ بھی دیکھو۔ کہ کسقدر سہولت
سے انسان اس سرمایہ کے اظہار سے کام لیتا ہے۔ نہ کوئی تکلیف ہوئی ہے
اور نہ کوئی وقت چاہا۔ اور زبان سے بول کر کام لے لیا۔ عجیب طلسم اور عجیب
راز ہے۔ کہ باوجود صاف اور کھلے ہونے کے بھی بند اور سربستہ ہے۔ ہم روز لیتے ہیں
لیکن جب سوچتے ہیں۔ کہ یہ کیا راز اور کیا طلسم ہے۔ تو حیرت کے سوائے اور
کوئی جواب نہیں ملتا۔ کبھی بولتے ہوئے یہ بھی سوچتے جاؤ یا یہ بھی سوچا۔ کہ یہ
اندر سے کیا نکل رہا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ کوئی صعوبت پیش نہیں
آتی کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اور کوئی گھاٹا نہیں پڑتا۔ ہاں کبھی کبھی منہ حلق اور
زبان شاید تھک جائے۔ لیکن اس سے اندرونہ پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ کیا یہ طلسم
نہیں ہے۔ اللہ اکبر۔ (خدا کی باتیں خدا ہی جانے)

یہ مجتمعہ سرمایہ کیا ہے۔ وہی جو ہمارے اندر و نہ سے نکل کر مختلف شکلیں اور صورتیں اختیار کرتا ہے۔ اس میں ہماری کتر بیونت ہی کچھ نہ کچھ شامل ہوتی ہے۔ ہم اسماء کی ترتیب افعال کی گردان سے وہ شکلیں نکالتے ہیں۔ جو طبعی سرمایہ سے کسی حد تک مغایر ہوتی ہیں۔ لیکن باوجود اسکے بھی جو نسبت ان دونوں میں ہوتی ہے۔ وہ ظاہر کرتی ہے۔ کہ بات پھر بھی ایک ہی ہے۔ محض تعبیر کا ہیر پھیر ہے۔ یا اجتہاد کا کرشمہ اس سرمایہ مجتمعہ میں بھی بہت کچھ ہمارا طبعی سرمایہ ہوتا ہے۔ اور اسی کا دست نگر۔

یہ سرمایہ غیر بھی کوئی غیر نہیں ہے۔ صرف نسبتاً غیر ہے۔ گیہوں کی روٹی بہرحال گیہوں کی روٹی ہوگی۔ اگرچہ پکائی کسی ہی نے ہو۔ یا کسی گھر میں ہی پکی ہو جسے ہم غیر کا کہتے ہیں۔ وہ کسی دوسرے خانہ میں جاکر اپنا بن جاتا ہے۔ ہم نے کسی اور طرح پر سرمایہ طبعی سے کام لیا۔ اور دوسروں نے کسی اور صورت سے نتیجہ ایک ہی ہے۔ ہندیوں نے پانی کو پانی کہا۔ اور فارسیوں نے آب عربوں نے ماء انگریزوں نے واٹر کہکر کام چلالیا۔ بولیاں مختلف ہیں لیکن شے ایک ہی شے اور مفہوم بھی سب کا ایک ہی ہے بولیوں کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اختلاف ہے۔ ورنہ اشیاء کی حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں۔ ہندی پانی کہہ کر مانگتا ہے۔ فارسی آب کہہ کر عربی ماء کہہ کر انگریز واٹر کہہ کر جب تک پانی سامنے نہ آئے۔ تب تک سب میں اختلاف ہوگا یہ سب لوگ دلوں میں کہتے ہوں گے۔ کہ معلوم نہیں ہر شخص کیا کچھ مانگتا ہے۔ لیکن سب کے سب پانی دیکھ کر مطمئن ہوگئے۔ تو یہ بات سمجھ میں آگئی۔ کہ سب کا مطلب پانی ہی تھا

بولیوں اور زبانوں میں اختلاف ہو تو ہو۔ حقائق اشیاء میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ جب سب زبانیں ایک ہی سرمایہ اور ایک ہی ضابطے کے ماتحت نشو و نما

پاتی ہیں - اورسب کا مخزن ایک ہی ہے - تو کہا جائے گا - کہ صرف برنگ اجتہادی اون میں اختلاف ہے - اوراصولی اعتبار سے اون سب میں ایک الحاق اورایک نسبت موجود ہے اور اون کی مختلف صورتیں ایک دوسری سے ملتی جلتی ہیں - مختلف زبانوں کے الفاظ کا مقابلہ کرنے سے تم پر کھل جائے گا - کہ صدہا الفاظ ایک زبان کے دوسری زبان سے ملتے جلتے ہیں - اور اُون کا مشتق اوراصل ایک ہی معلوم دیتی ہے - جب اسقدر نسبت وحدت حاصل ہے - اور سرمایہ اسقدر وسعت رکھتا ہے - تو دُنیا کی کوئی زبان بھی نشوونما پانے اور ترقی کرنے سے محروم نہیں رہ سکتی - صرف اون قواعد کی پابندی لازمی ہے - جو ارتقائے السنہ کے واسطے لازمی اور موزون ہیں یہ کاہلیت ہمتی اور بزدلی ہے کہ ہم زبان کی ترقی اور عروج کے خواب دیکھنے سے بھی ڈرتے ہیں - اور اسے ایک لاینحل قضیہ جانتے ہیں -

الفاظ کی استقرائی قسمیں

الفاظ کی استقرائی قسمیں ہر زبان میں حسب ذیل ہوسکتی ہیں -

(الف) طبعی

(ب) اجتہادی

(ج) نسبتی -

پہلی قسم کے وہ الفاظ ہیں - جن کی نسبت انسان کو کسی اجتہاد کی ضرورت نہیں پڑتی - بہت سی قسمیں لفظوں کی جو . . . اوسکے اندرونہ میں سے نکلتی ہیں - اون کی نسبت اوسے کسی اجتہاد کی ضرورت نہ تھی - جو اون میں سے متلفظہ ہوتی رہیں - وہ اوسکی یادداشت میں باقی رہیں - اور رفتہ رفتہ اونکی بہت

ڈھانچے ۔ صورت اور خاکہ اوسکے ذہن میں مترسم ہوتا گیا۔ کسی آواز یا لفظ کو اوس
نے کسی معنے پر محمول کیا۔ اور کسی کو کسی پر کسی کی کچھہ تعبیر کی اور کسی کی کچھہ دوسرے
حصہ میں اوسے اپنے اردگرد سے ہی ایسی آوازیں سنائی پڑیں۔ جن کے تعبیر
کسی نہ کسی رنگ میں اوسے کرنی پڑی۔ مثلاً جانوروں ۔ وغیرہ کی آوازوں سے
اوسے بہت کچھہ قیاس کرنا پڑا ۔ اور اون کے مختلف ڈھانچے بنائے گئے
اسی طرح جو آوازیں اشیائے کے تقارب اور تصادم سے اوسکے کان میں پڑتی
رہیں۔ اون سے ہی اوس نے بہتیرے الفاظ کی بنیاد رکھی۔ اس قسم کی مختلف
آوازوں سے وہ نہ صرف بعض اشیاء اور بعض جانوروں ہی سے آشنا ہوا
بلکہ اونکی بولیوں اور اون کے صدائی تاثرات سے ہی واقف ہوتا گیا۔ ہر آواز
کے مفہوم اور نام کے معلوم کرنے میں اوسے کوشش کرنی پڑی۔ اور وہ اس
میں بہت کچھہ کامیاب ہی ہوا۔ جب اوس کے کان میں کتے کے بھونکنے اور
بلی کے میاؤں میاؤں کرنے کی آواز پڑی ۔ تو وہ فوراً تاڑ گیا۔ کہ کتا بھونکتا
اور بلی میانک رہی ہے۔ اگر ان آوازوں اور اون کی نوعیت سے وہ واقف
نہ ہوتا۔ تو وہ ایسا قیاس نہ کرسکتا۔ دیکھو جب کوئی اجنبی جانور بولتا ہے
تو ہم اوس کی نوعیت نہیں جانچ سکتے۔ کوئل اور کوا کی آوازوں میں تمیز کرتے
بھی کئی وجہہ سے ہم جان جاتے ہیں۔ کہ کوئل یا کوا بول رہا ہے۔
ایسی آوازوں کے تمیز کرنے میں صرف اس قدر اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے
کہ ایک دفعہ اونہیں سمجھہ کر یاد رکھا۔ اور اون کے سننے پر تمیز کرلی۔ اجتہادی
وہ الفاظ ہیں ۔ جن میں ایک حد تک غور تدبر اور دخل کی ضرورت پڑتی ہی مثلاً
اپنے خورد و نوش کے واسطے انسان کو چند اشیاء کا انتخاب کرنا پڑا۔ یا چند
چیزیں اوسکے پیش ہوئیں۔ اون کے نام تو صحیفہ قدرت پر لکھے نہیں تھے۔ اور

نہ اوسے کوئی دوسرا بتانے والا تھا۔ اس حالت میں اجتہاد کی ضرورت پڑی۔ دماغ کو تکلیف دینے سے کچھہ اسما القا ہوئے۔ کسی قدر گھبراہٹ کسی قدر سوچ بچار کے بعد شکل وشباہت مزہ اور لذت وغیرہ امور کو مدنظر رکھ کر تمام اشیا کے مختلف نام رکھدیئے گئے۔ مثلاً حنطہ۔ ویٹ۔ گیہوں۔ نخود۔ گرام۔ بارے۔ جو۔ گوبھی مولی۔ گاجر۔ گنا۔ آم۔ لیموں۔ چلم۔ آلوچہ۔ آلو۔ سیب۔ بیر۔ بیری۔ یہ اجتہاد ہر قوم اور ہر ملک کا جداگانہ رنگ رکھتا ہے کسی نے گیہوں دیکھہ ویٹ نام رکھا۔ کسی نے حنطہ۔ اور کسی نے گیہوں نہ لفظ ویٹ میں گندمیت ہے۔ اور نہ لفظ حنطہ اور گندم وگیہوں میں وہ کچھہ اور ہی شے ہے۔ گیہوں کو نخود سے اور نخود کو گیہوں سے یہ اعتباری الفاظ تمیز نہیں دیتے۔ بلکہ گیہوں کی اصلیت۔ مزہ۔ رنگ۔ جوہر اور عنصر نخود سے تمیز دیتا ہے۔ اور اسی طرح نخود کا مزہ۔ رنگ۔ جوہر اصلیت اور عنصر۔ اوسکو گیہوں سے ممتاز کرتا ہے۔ موٹی مثال میں یوں سمجھیے زید میں۔ میں کونسی ایسی بات ہے جسکی وجہ سے اُسے زید کہا جاتا ہے۔ کچھہ بھی نہیں۔ زید بکر سے صرف بوجہ زید نام ہونے کے ممتاز نہیں بلکہ اون باتوں کی وجہ سے جو زید کی ذات میں وجوداً یا ذہناً پائی جاتی ہیں۔ زید ایک اعتباری نام ہے۔ جو اوس کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے۔ اور یہ صرف ایک نام ہے۔ کیا صرف ایک تمیزی اجتہادی علامت یا نشان ذات کہا جاسکتا ہے۔ اگر کسی دوسرے شہر میں جاکر زید اپنا نام بدل دے۔ تو اوسکی کوئی ذاتی خصوصیت اس کا فرق نہیں کرسکتی تمیزی یا اجتہادی ناموں اور اجتہادی الفاظ میں سے بہت سے ایسے الفاظ بھی نکلیں گے۔ جنکی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ ہوگی۔ لیکن بہت سے نام ایسے بھی ہوں گے جن کی اب تک کوئی وجہ تسمیہ نہیں معلوم ہوسکی۔ یا معلوم نہیں ہوسکتی۔ انسان یا تو فوراً ہی اشیا کے نام رکھدینا اور الفاظ کی تعیر

کرلیتا ہے ۔اور یا کسی قدر سوچ بچار کے بعد ایک دفعہ اوسکے منہ سے یوں ہی کوئی نام یا کوئی لفظ نکل جاتا ہے ۔اور رفتہ رفتہ وہی کسی نہ کسی مفہوم کے تابع سمجھا جانے لگتا ہے ۔یہ ایک فطرتی بات ہے ۔کہ جب کوئی شے انسان کے سامنے آتی ہے ۔تو انسان دل میں سوچنے لگتا ہے ۔کہ یا تو اس کا کوئی نام پہلے سے ہے ۔اور اگر نہیں ہے ۔تو رکھنا چاہیئے ۔ایسی حیص بیص میں اوسکے منہ اور زبان سے بہ تبعیت خیالات کوئی نہ کوئی لفظ نکل جاتا ہے اور رفتہ رفتہ وہی لفظ دیگر سلسلہ الفاظ میں جاگزیں ہوکر ایک نیا نام پاتا ہے ۔اور چند دنوں کے بعد بولنے والے اوسے ایک ٹکسالی نام یا اصلی نام سمجھنے لگ جاتے ہیں ۔اگر سب لفظ اپنی تہ میں کوئی حقیقت ہی رکھتے ہوتے ۔تو پھر ہماری ڈکشنریوں میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہونا چاہیئے ۔جسکی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ نہ ہو ۔نہیں ہم دیکھتے ہیں ۔کہ زبانوں کی ڈکشنریوں میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن کی وجہ تسمیہ اب تک نہیں ملی ۔ممکن ہے کہ کوئی نہ کوئی اونکی وجہ تسمیہ ہو ۔مگر جب تک نہ ملے یہی کہا جائے گا ۔کہ اب تک معرض دریافت میں نہیں آئی ہے ۔آؤ ہم الفاظ کنک ۔جو ۔مسور ۔آم ۔کیلہ ۔وغیرہ اشیاء کی وجہ تسمیہ دریافت کریں ۔

شاید ہم مزید غور کے بعد ایسے الفاظ یا ایسے اسماء کی وجوہ تسمیہ سے واقف ہوسکیں ۔لیکن سرسری نگاہ میں مشکل ہے ۔

نسبتی وہ الفاظ ہیں ۔جو محض کسی نسبت کی وجہ سے بنائے گئے ۔یا متلفظ ہیں ۔جیسے رنگ ترہ یا سنگ ترہ وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ دو لفظوں سے ایک ہوتے ہیں ۔چونکہ اس پھل میں (ترپوں کے) ساتھ ایک خوش رنگ رنگت بھی ہوتی ہے ۔اسواسطے اس کا نام رنگ ترہ رکھا گیا ۔رنگ ترہ کا نام سنگ ترہ بھی ہے ۔

زبان فارسی میں سنگ پتھر کا نام ہے۔ اور پنجابی زبان میں سنگ سے مراد رشتہ اور لگاوٹ کے ہیں۔ چونکہ اس پھل کی تریان ایک ہی سلسلہ سے مربوط ہوتی ہیں۔ اس واسطے اس کا نام سنگ ترہ رکھا گیا۔

اُردو میں آم۔ پنجابی میں انب۔ فارسی میں انبہ۔ عربی میں نغذک اور انگریزی میں مینگو کہتے ہیں۔ بعض لوگ ان الفاظ کی کچھہ نہ کچھہ تاویل اور تعبیر کرتے ہیں مگر کوئی حکمی تاویل نہیں ملتی ہے۔ آم اور انب یا انبہ میں ایک نسبت موجود ہے ان کی جڑہ ایک ہی ہے۔ نغذک اور مینگو میں کوئی نسبت نہیں۔ چونکہ آم ایک لذیذ پھل ہوتا ہے۔ اور خوش مزا بھی ہے اسواسطے اوسے نغذک یعنی عجیب کہا گیا۔ یہ ایک وصفی نام ہوگا۔ یعنی ایک نسبت کے تابع کوہ مری کے پہاڑ میں ایک بوٹی مشک بالا کے نام سے مشہور ہے۔ لوگ اوسے کپڑوں میں رکھتے ہیں پہلے پہل جب وہ دریافت ہوئی۔ تو اوس کا نام کچھہ نہیں تھا۔ کیونکہ اوس میں خوشبو تھی۔ اس واسطے اوس کا نام اس نسبت سے مشک بالا رکھ دیا گیا۔ مشک بو اور بالا نہایت خوشبودار ہے عشق پیچہ ایک بیل کا نام ہے۔ چونکہ وہ بہت پیچیدہ ہوتی ہے۔ اور عشق و محبت میں بھی بہت کچھہ پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ اس واسطے اُس کا نام عشق پیچہ پڑ گیا۔ اگاس بیل وہ بیل ہے۔ جو ہمیشہ اوپر ہی کو چڑھتی ہے۔ اگاس کے معنے آسمان یا علو کے ہیں۔ اس لیئے اوسکا نام اگاس بیل رکھا گیا۔ فرش اوس حالت یا اوس کیفیت کا نام ہے۔ جو سطح اور ہموار اور ملحق بہ زمین ہو۔ چونکہ دریاں اور چٹایاں زمین سے ملحق اور مسطح ہوتی ہیں اس واسطے اوس کا دوسرا نام فرش رکھا گیا۔ آسمان جب بادی النظر میں آسیا نما پایا گیا۔ تو اوس کا نام آسمان پڑ گیا۔ اور یہ کہ عربی زبان میں سمار کے معنے بلندی کے ہیں۔ زبان عربی میں لفظ ارض کے معنے گھومنے اور حرکت کے

ہیں۔ اس واسطے اوسے ارض کہا گیا۔ کیونکہ زمین متحرک ہے۔ لفظ آفتاب کے
معنے درخشندگی اور چمکارے کے ہیں۔ سورج چمکتا اور درخشاں ہے۔ اسواسطے
اوسے آفتاب کے نام سے موسوم کیا گیا۔ چاند کی تبدیلی اور ضیائی تموّج
ماہوار گھٹتا اور بڑھتا ہے۔ اس واسطے اوسے ماہتاب کہا گیا۔ چونکہ ستارہ
دن میں بھی موجود ہوکر رات کے وقت نکلتا ہے۔ اس واسطے اوسے ستارہ
کہا گیا۔ سیّارہ پھرتا ہے۔ اس لیئے اوس کا نام سیّارہ ہوا۔ پانی چونکہ زمین
میں سے نکلتا۔ اور نشیب ہی کی طرف جاتا ہے۔ یا برس کر زمین ہی میں سما
جاتا ہے۔ یا کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس واسطے اوس کا نام پانی رکھا گیا۔ ہوا کے
معنے یا ہوا سے مراد وہ کیفیت ہے۔ جو حد تمسک یا حد نافذ سے باہر ہو۔ چونکہ اس عنصر کی
کیفیت ہی کچھ ایسی ہی ہے۔ اُس واسطے اوسکی تعبیر ہوا سے کی گئی آتش
کے معنے تیزی اور حدت کے ہیں۔ اس واسطے اوسے آتش کہا گیا۔ لفظ ہاتھ
کے معنے حد اور اندازہ کے ہیں۔ چونکہ ہاتھی بعض دیگر جانوروں سے قدامت میں
کسی حد تک زیادہ ہوتا ہے۔ اسواسطے اوسے ہاتھی کہا گیا۔ یعنی ایک ایسا جانور
جو ایک خاص حد و اندازہ رکھتا ہے۔ کتاب کے معنے لکھنے کے ہیں۔ چونکہ کتاب
میں تحریریں ہوتی ہیں۔ اس واسطے کتاب کے نام سے موسوم ہے۔ پھول کے
معنے تخلخل کے ہیں۔ چونکہ پھول کے اندر تخلخل ...... ہوتا ہے۔ اس واسطے اوس
کا نام پھول پڑ گیا۔ اردو میں سوزن کا نام سوئی ہے۔ سُو کے معنے ایک طرف کے ہیں
چونکہ سیتے ہوئے سوزن کا رخ قریبًا ایک ہی طرف ہوتا ہے۔ اس واسطے اوسے
سوئی کہتے ہیں۔ قینچی اردو اور پنجابی میں مقراض کا نام ہے۔ مقراض کے چلنے
سے قینچ قینچ کی آواز نکلتی ہے۔ اس واسطے اوس کا ہندی میں نام قینچی ہوا۔ اور
مقراض کے معنے کاٹنے کے ہیں۔ فارسی والوں نے ان معنوں سے اوسے مقراض

کہا۔ پنجابی میں قینچ ایک طرف کو بھی کہتے ہیں۔ چونکہ مقراض کی دو طرفیں ہوتی ہیں۔ اس واسطے اوس کا نام قینچی رکھا گیا۔ چاکو کا نام چاک یا چاک کرنے سے رکھا گیا۔ شمشیر اوس واسطے کہ وہ شیر کے ناخن کی مانند شکل رکھتی ہے۔ تلوار اس واسطے کہتے ہیں۔ کہ لفظ تل کے معنے تلے کے ہیں۔ یعنی نہہ کسی چیز کی اور وار کے معنے ضرب یا حملہ کے ہیں۔ چونکہ شمشیر کی ضرب ہمیشہ نہہ پر لگنی۔ یا لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس واسطے اوس کا نام یہ رکھا گیا۔ نام نمو سے ہے۔ چونکہ نام میں بھی ایک قسم کی خبر اور اطلاع اور مزید کیفیت ہوتی ہے۔ اسواسطے یہ کہا جاتا ہے۔ کہ فلاں شئے کا یہ نام ہے۔ شجر کے معنے پھوٹنے کے ہیں۔ چونکہ درخت پھوٹتے اور شاخیں مارتے ہیں۔ اس لئے عربی میں مجازاً شجر کہا گیا۔

برتن اس واسطے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ برتنے میں آتا ہے۔ عربی میں ظرف اس واسطے کہتے ہیں۔ کہ ظرف کے معنے عربی میں ایک قسم کی گنجائش کے ہیں۔ چونکہ ظرف میں بعض اشیا ایک حد تک سما جاتی ہیں۔ اس لئے اوس کا نام مجازاً ظرف رکھا گیا۔ گھر کے معنے ٹھہرنے اور اقامت کے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے۔ کہ یہہ بات میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔ یا گھر کر گئی ہے۔ چونکہ انسان کا یہہ مستقل مسکن اور بسیرا ہوتا ہے۔ اس واسطے اوس کا نام گھر رکھا گیا۔ گھر بار۔ بہ معنے اثاثہ بوجھ وغیرہ کے ہیں۔ چونکہ یہہ باتیں گھر کا لازمہ ہوتی ہیں۔ اس واسطے کبھی کبھی گھر بار ہی بولتے ہیں۔ در کے معنے شگافتہ یا پھٹے ہوئے کے ہیں۔ چونکہ دروازہ پھٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس واسطے در کہا جاتا ہے۔ چوکھٹ میں چونکہ چار چیزیں تحت۔ فوق۔ یمین ویسار ہوتی ہیں۔ اسواسطے اوس کا یہہ نام رکھ دیا گیا۔ بعض ملکوں میں چونکہ چارپائی کا کچھہ حصہ لکڑی کا ہوتا ہے۔ اور کاٹھہ لکڑی کا نام بھی ہے۔ اس لئے بھی اوسے چوکھٹ کہا جاتا ہے۔ یا کھاٹ یعنی وہ چیز

جسکے چاروں طرف لکڑی ہو۔ ایسے ہی اور الفاظ بھی ہیں۔ جنہیں نسبت کے لحاظ
سے خاص معنوں میں لیا گیا ہے۔ لیکن ایسے الفاظ کی بھی کمی نہیں ہے۔ جو محض
ایک اجتہاد کے اعتبار سے ایک خاص معنے رکھتے ہیں۔ اور بعض خاص معانی میں
تو مستعمل ہیں۔ لیکن کوئی وجہ تسمیہ اون کی اب تک معلوم نہیں کی گئی۔ اوپر
جو الفاظ لکھے گئے ہیں۔ اونکی وجہ تسمیہ استقرائی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ کوئی اور وجہ تسمیہ
بھی ہو۔ بعض الفاظ ذو معنے بھی ہیں۔ بلکہ بہت سے معانی رکھتے ہیں۔ اور وہ معانی
موقعہ موقعہ پر چسپاں ہوتے ہیں۔ اور ایسے الفاظ ہر زبان میں پائے جاتے ہیں
ربط عبارت۔ ربط ذکر۔ ربط بیان کے ساتھ ہی اون کے معانی سمجھ لئے جاتے ہیں
مثلاً عربی میں نظر کے معنے بصارت اور دیکھنے کے بھی ہیں۔ اور فکر و غور کے بھی ہیں۔ اور
بعض وقت نظر کا مفہوم بُرے معنوں میں بھی لیا جاتا ہے۔ جیسے نظر لگ گئی۔ یا
چشم بد دور یا چشم زخم۔ اس طرح لفظ بد کے بھی کئی ایک معنے ہیں۔

الفاظ کی دیگر قسمیں

ان ہر سہ اقسام کے سوائے الفاظ کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں۔ مثلاً۔

(الف) الفاظ جامع۔

(ب) الفاظ غیر جامع

(ج) الفاظ مفرد المعانی۔

(د) الفاظ کثیر المعانی۔

(ھ) الفاظ مرادف۔

(د) الفاظ غیر مرادف۔

(۱) جامع الفاظ وہ ہیں۔ جو اپنے معانی کے اعتبار سے اپنی ہی ذات میں جامع ہوں

اون کے معانی بذاتہ ایسے ہوں۔ کہ جو محض اپنے ہی اندر ایک پوری تفصیل رکھتے ہوں۔ یہ ضرورت نہ ہو۔ کہ کسی دوسرے لفظ کے ملنے سے اونکی تعبیر ہوسکے۔

مثلاً اردو میں۔

چلو۔ دیکھو۔ سنو۔ آؤ۔ جاؤ۔ بیٹھو۔ اوٹھو۔ لیٹو۔ ٹھیرو۔ وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں۔ کہ صرف ان ہی کے اطلاق سے سننے والا سارا مطلب سمجھہ جاتا ہے۔ کسی دوسرے لفظ کے ملانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۲) الفاظ غیر جامع وہ ہیں۔ جو ایسی جامعیت نہ رکھتے ہوں۔ مثلاً۔ تم۔ ہم۔ اس جس۔ کام۔ انجام۔ اختتام۔ شروع۔ کون۔ مت۔ ہرگز۔

جب تک ان الفاظ کے ساتھہ کوئی دوسرا لفظ نہ لگایا جائے۔ تب تک تکمیل مفہوم کے واسطے ان کی تعبیر مشکل سے ہوسکے گی۔

(۳) مفرد المعانی وہ الفاظ ہیں۔

جنکے معنے ایک ہی ہوں۔ یا جو ایک ہی معنوں پر اطلاق پاسکیں۔ مثلاً۔

ہم۔ تم۔ وہ۔ یہہ۔ بس۔ جیسے۔ ویسے۔ جانب۔ بہتر۔

ان الفاظ یا ایسے ہی دیگر الفاظ کے معانی صرف ایک ہی تعبیر رکھتے ہیں۔ اون سے متعدد صورتیں نہیں نکل سکتیں۔ اور نہ متعدد اشکال اور کیفیات پر اون کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

(۴) کثیر المعانی وہ الفاظ ہیں۔ جو بہت سے معانی رکھتے ہوں۔ مثلاً۔

حسن۔ زیبائش۔ زینت۔ عمدگی۔ کبر۔ قامت۔ شہادت۔ علی۔ ید۔ ہاتھہ۔ ہوا۔ کام۔ نام۔ یہہ یا اسی کے اور الفاظ بھی بہت سے معنے رکھتے ہیں۔ اور موقعہ و محل کے اعتبار سے مختلف رنگوں میں اون کا اطلاق ہوتا ہے۔

مرادف الفاظ

(۸) یہہ ایک دلچسپ سوال ہے۔کہ
ہر زبان میں جسقدر الفاظ پائے۔یا بولے اور لکھے جاتے ہیں۔اون میں سے بعض الفاظ مترادف المعانی ہی ہوتے ہیں۔یعنی ایک ہی معنوں والے ہر زبان میں بہت سے الفاظ ہوتے ہیں۔اون میں سے جو لفظ چاہیں کسی ایک معنے میں استعمال کریں۔
اِس بحث کے متعلق مندرجہ ذیل سوالات قابل بحث ہیں۔

(۱) کیا ہر زبان کے الفاظ ایک ہی وقت وضع ہوئے ہیں۔

(۲) کیا ہر ایک زبان کے الفاظ مستعملہ صرف اوسی زبان والوں کا بلاشرکت غیری ورثہ ہیں۔

(۳) کیا ہر زبان کے الفاظ کا واضع ایک ہی شخص تھا۔یا مختلف اشخاص۔

(۴) کیا ایک ہی معنوں کے واسطے مختلف اشکال الفاظ کا ہونا۔اوس زبان کی وسعت کا موجب یا دلیل ہے۔

(۵) مترادف کی صحیح تعریف کیا ہے۔

یہہ کہ ہر زبان کے الفاظ اور معانی ایک ہی وقت میں وضع ہوئے۔یا کہے گئے ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی یہہ کہے۔کہ سب انسان اور انسانوں کی سب ذریات کی ہر ایک قسم کی ترقی و عروج اور کمال ایک ہی وقت اور ایک ہی کوشش اور زمانہ کا اثر ہے۔زبان یا زبانوں نے بھی اوسی طرح رفتہ رفتہ ترقی پائی ہے جسطرح انسان کی نسل اور کوششوں میں ترقی ہوتی ہے۔زبانیں انسان سے وابستہ اور اونکی طبعی کیفیات اور مقتضیات کا اثر ہیں۔یہہ نہیں کہا جا سکتا۔کہ وہ ایک ہی وقت میں بن کر بولی جانے لگی ہیں۔جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا۔ووں ووں زبانیں

بھی اوسکی کوششوں اور تصرفات کے ماتحت ترقی پاتی گئیں کبھی کوئی لفظ بن گیا۔ اور کبھی کوئی۔ اسکے ساتھہ ہی معانی الفاظ بھی مقرر اور مشخص ہوتے گئے ممکن ہے۔ کہ بعض الفاظ کے معانی یا مفہوم ایک زمانہ میں کچھہ اور ہوں۔ اور کسی دوسرے زمانہ میں جاکر اون میں کوئی تبدیلی واقعہ ہوگئی ہو۔ لغات کے دیکھنے سے پتہ چل سکتا ہے۔

مختلف الفاظ کے جو مختلف معانی مقرر ہیں۔ وہ مختلف کیفیات اور حالات کے تابع ہیں۔ بعض لغت کی کتابوں میں شاذ ونادر یہہ بھی لکھا جاتا ہے۔ کہ اس لفظ کے اصلی معنے کیا ہیں۔ اور مجازی کیا اس سے پتہ چل سکتا ہے۔ کہ رفتہ رفتہ معانی الفاظ میں بھی تبدیلی ہوتی گئی ہے۔ اگرچہ وہ باعتبار حقیقت اور مجاز ہی کے کیوں نہ ہو۔ پہلے پہل ہر لفظ غالبًا ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہوگا۔ رفتہ رفتہ ضرورت پر اوسکے معانی میں اضافہ ہوتا گیا۔

ہر زبان میں جسقدر الفاظ مستعمل ہیں۔ وہ صرف اوسی زبان سے وابستہ اور متعلق نہیں ہوتے۔ اون میں سے اکثر کی دوسری زبانوں سے بھی ایک حدتک تعلق اور درستگی ہوتی ہے۔ کبھی اس وجہ سے کہ ایسی دوسری زبانیں اوس زبان سے ایک قسم کا الحاق اور تعلق رکھتی ہیں۔ اور کبھی اس وجہ سے کہ ایک زبان کے بعض الفاظ بذریعہ انتقال اتفاقیہ یا انتقال ارادیہ ضروریہ کسی دوسری زبان میں آگئے ہیں ہر زبان اور ہر زبان کے الفاظ کا واضع ایک ہی شخص نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ایک ہی کنبہ یا خاندان اور نہ ایک ہی قوم کے چند افراد مختلف زبانوں کی بنیاد مختلف ہاتھوں سے پڑتی ہے۔

جسطرح انسان کی ساری ذریات (سوائے اسکے کہ اوس کا شروع ایک ہی انسان یا ایک ہی جوڑہ سے نہ ہوا ہو) مابعدی سلسلوں میں ایک ہی

انسان کی ضروریات نہیں ہے۔ اسی طرح زبانوں اور زبانوں کے الفاظ کا حال اور کیفیت بھی ہے۔

شروع میں یہ سلسلہ زبان ایک ہی ممبر خاندان انسان سے شروع ہوا اور پھر رفتہ رفتہ اوس میں ترقی ہوتی گئی۔ جوں جوں نسلیں بڑھتی گئیں۔ اور ایک دوسرے سے جدا ہو کر دوسرے اقطاع میں بستی گئیں۔ ویسی طرح اور اوسی نسبت سے زبانوں میں بھی اختلاف اور ترقی ہوتی گئی۔ ہر شخص اور ہر فرقہ کی ضروریات کے اختلاف اور آب و ہوا کے تقاضے نے زبانوں کے مختلف بنانے میں بھی کمی نہیں کی

بیشک ایک ہی معنوں کے واسطے مختلف الفاظ کا ہونا وسعت بیان کے لیئے ایک ضرورت ادبی ہے۔ لیکن پھر بھی یہہ کہا ہی جاوے گا۔ کہ

چونکہ تجدید اور توضیع کے بانی مختلف اشخاص ہوتے ہیں۔ اسواسطے یہہ قیاس بیجا نہ ہوگا۔ کہ دو مختلف صورت و شکل کے الفاظ کے معانی میں کچھہ نہ کچھہ فرق ہوگا۔ یا ہوتا ہے۔ یا ہونا چاہیئے۔ بات تو یہ اچھی ہے۔ کہ ایک ہی معنوں کیلیئے ایک ہی زبان میں بہت سے الفاظ مل سکیں لیکن جب ہم قواعد اور ضوابط فصاحت اور قانون بلاغت پر نظر کرتے ہیں۔ تو ہمیں یہہ مشکل پڑتی ہے۔ کہ میزان حسن بیان میں وہی الفاظ پورے اترتے ہیں۔ جو مضمون۔ واقعہ حقیقت اثر اور جذبہ کے اعتبار سے موزون ہوں۔ اس توازن سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ الفاظ کی نشست اور اثر کیا کچھہ کیفیت اور حقیقت رکھتا ہے۔ کچھہ شک نہیں۔ کہ بہت سے الفاظ مترادف خیال کیے جا کر کبھی کبھی ایک ہی سلسلہ میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور بعض دفعہ یہہ رنگ بھی ایک فصیح و بلیغ خیال کیا جاتا ہے۔ اور اون میں بلحاظ نشست اور معانی کے کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ لیکن یہہ ایک غلطی ہے۔ اون الفاظ میں بھی کچھہ

نہ کچھہ فرق ہوتا ہے۔ جنہیں ہم مترادف خیال کئے ہوئے ہیں۔ کبھی ایسا فرق کسی قدر واضح ہوتا ہے۔ اور کبھی ایک شائبہ کی مانند۔

بجائے اسکے کہ ہم ایک گہرے مترادف کے قائل ہوں۔ اگر یہہ کہیں تو شاید زیادہ تر موزون ہو گا۔ کہ

،، بعض زبانوں کے اندر اس خوبی اور اوس عمدگی سے زبان کی توضیح عمل میں آئی ہے۔ کہ ایک ہی معنوں کے الفاظ ہیں۔

تحت۔ ضابط فصاحت و بلاغت مختلف مضامین کے ادا کرنے کے واسطے ایک خوش آیند طریق سے لائے جا سکتے ہیں یہہ ایک حسن بیان ہوگا۔ مثلاً مترادف۔ کامل۔

گو بعض وقت بعض الفاظ دو متفاوت الاشکال کو ایک ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے معانی میں ضرور کچھہ نہ کچھہ فرق ہوتا ہے۔ مثلاً

طریق اور طرز گو کبھی ایک ہی معنوں میں استعمال پاتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے معانی میں فرق ہے۔ طریق سے مراد طور۔ راہ۔ خیال اور چلن وغیرہ ہے اور طرز سے مراد عمل نقشہ۔ انداز۔ ہے۔

اسی طرح بیان اور تقریر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بیان سے مراد صرف کچھہ کہنے کے ہیں۔ اور تقریر سے مراد وہ کہنا ہے۔ جس میں ایک قسم کی خصوصیت اور ایک خاص ارادی کیفیت پائی جائے۔ تغیر اور تبدل میں بھی فرق ہے

تغیر سے مراد کسی شے کی حیثیت۔ کیفیت اور حالت کا بدلنا ہے۔ اور تبدل سے مراد صرف تبادلہ ہے۔ چاہے بذاتہ اوس قسم کی شئے سے ہو۔ اور چاہے کسی دوسری قسم سے شک اور وہم میں بھی فرق ہے۔

شک وہ ہے۔ جو کسی شئے کسی کیفیت اور کسی واقعہ کے حدوث اور وقوع کے

بعد پیدا ہو اور وہم وہ ہے۔ جو اس شرط سے مشروط نہ ہو۔ وہم ہر ایک حالت میں پیدا ہو سکتا ہے۔

دلیل اور برہان میں بھی فرق ہے۔

دلیل وہ ہے جس سے کوئی واقعہ ثابت تو ہو سکے۔ یا ثابت تو کیا جا سکے۔ لیکن کسی دوسری دلیل سے باطل بھی ہو سکتا ہو۔ یا اوسکی تصدیق معرض بحث میں آ سکے۔

برہان وہ ہے۔ جو قطعی ہو۔ اور جو کسی اور دلیل سے ٹوٹ نہ سکے۔ دوسرے الفاظ میں دلیل قاطع نہیں ہوتی۔ اور برہان قاطع ہوتی ہے۔ وجود آفتاب دلیل سے نہیں۔ بلکہ برہان سے ثابت کرتے ہیں۔ اسی طرح دلیل اور حجت میں بھی فرق ہے۔ دلیل میں ایک واقعہ کے صحیح یا غلط ہونے پر وجوہ پائے جاتے ہیں لیکن حجت میں وجوہ پیش کردہ کے ابطال سے کسی واقعہ کو ثابت یا باطل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ضمیر اور قلب میں بھی فرق ہے۔

ضمیر سے مراد وہ قوت خاصہ ہے۔ جو ایک قانون ضابطہ اور شرع کے رنگ میں محاکمہ اور فیصلہ کے واسطے انسان کو دی گئی ہے۔ اور قلب وہ ہے۔ جو فیصلہ شدہ واقعات اور کیفیات کے مطابق مختلف تاثرات سے متاثر ہو کر عمل پذیر ہوتا ہے

عدل اور انصاف میں بھی فرق ہے۔

عدل سے مراد محض پورا کرنا ہے۔ نہ کسی طرف کمی ہو اور نہ بیشی انصاف سے مراد دو چیزوں میں یہہ فیصلہ کرنا ہے۔ کہ شے زیر بحث کیا حیثیت اور کیا وقعت رکھتی ہے۔ اور کون شخص واقعاتی رنگ میں کس مقدار سے اور کن حدود میں اوس کا مستحق ہے۔

امر اور حکم میں بھی فرق ہے۔

امر میں اعلان اور تحکم دونوں ہوتے ہیں۔ اور حکم میں صرف تحکم اور کبھی کبھی اوس میں واقفیت نہیں ہوتی۔ حکم میں فوری جواب دہی ہوتی ہے۔ اور امر میں موقتہً جواب دہی۔

فرق اور اختلاف میں بھی فرق ہوتا ہے۔

فرق سے مراد صرف جدائی یا تمیز ہے۔ اور اختلاف سے مراد بعض حقائق۔ بعض کیفیات۔ بعض اجتہادات۔ بعض عقاید۔ نفی و اثبات میں تضاد خیالات کا ہونا ہے۔ جو کسی نہ کسی حد تک یا کسی نہ کسی قسم کی دلائل کے تابع ہو۔ اور فرق بہ معنے سِر کے بھی ہے۔

اتحاد اور اتفاق میں بھی فرق ہے۔

اتفاق کے معنے محض مل جانے یا اکٹھے ہو جانے کے ہیں۔ یا پیش آجانے کے چاہے خلوص ہو یا نہ ہو۔ اتفاق ضرورتاً بھی رفع خلجان کے واسطے کیا جاتا ہے۔ لازمی نہیں کہ اوس میں خلوص ہی ہو۔ اتحاد میں خلوص شرط ہے۔

محبت اور الفت میں بھی فرق ہے۔

محبت بلا واسطہ پورے خلوص سے ہوتی ہے۔ جو دل سے اٹھتی اور دل ہی کے ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہے۔ اغراض اور نفسانیت کے کلیتاً تابع نہیں ہوتی۔

لیکن رسم الفت میں ان شرطوں کا ہونا شرط نہیں محض ایک جوڑ میل ہوتا ہے اگرچہ دل میں نہ ہو۔ مگر نمائشی رنگ میں ہو۔ وہ بعض اغراض اور عوارض کے تابع ہوتی ہے۔ جب وہ کبھی اوٹھ جاتے ہیں۔ تو وہ بھی باقی نہیں رہتی۔

مصیبت اور تکلیف میں بھی فرق ہے۔

تکلیف میں لازمی نہیں۔ کہ وہ عارضی نہ ہو۔ یا اوس میں دل و دماغ پوری طرح سے

مالوف نہ ہو۔ مصیبت میں عموماً یہ باتیں ایک حد تک لازمی ہیں۔

بہجت اور مسرت میں بھی گونہ فرق ہے۔

بہجت مسرت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور اکثر وہ عوارض سے وابستہ نہیں ہوتی لیکن عموماً عارضی ہوتی ہے۔ پھول کے سونگھنے سے بہجت نہیں ہوسکتی۔ مسرت ہوسکتی ہے۔ مسرت تبسم ہے۔ اور بہجت ہنسی۔

فرحت اور مسرت میں بھی فرق ہے۔

فرحت عموماً دل سے اٹھتی اور کسی ایسے امر سے ظہور پذیر ہوتی ہے۔ جو کسی سابق ارادہ یا خیال کے پورا ہونے پر وجود پذیر ہوتا ہے۔ خلاف اسکے مسرت کبھی ناگہانی اور معمولی بات کے انکشاف یا ظہور سے بھی ہو جاتی ہے۔ اور اوس کا اثر محض معمولی ہوتا ہے مترادف سے مراد یہہ لی جاتی ہے۔ کہ شکل اور ترکیب الفاظ کچھہ اور ہو۔ اور معانی سب کے ایک ہی ہوں۔ اون ہی معنوں میں ہر لفظ استعمال کیا جا سکے۔ اور ایسے استعمال سے مفہوم میں فرق نہ آئے۔ مترادفات کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

(الف) مترادفات اندرونی۔

(ب) مترادفات بیرونی۔

اندرونی مترادفات وہ ہیں۔ جو ایک ہی زبان کے اندر ہوں۔ جیسے وہ الفاظ جو اوپر مختصراً... لکھے گئے ہیں۔ بیرونی مترادفات وہ ہیں۔ جو کسی دوسری زبان کے بالمقابل ہوں۔ جیسے۔

فارسی میں آسمان۔ اور انگریزی میں سکائی۔ فارسی میں آفتاب و ماہتاب اور انگریزی میں سن اور مون۔ فارسی میں روز۔ ہندی میں دن اور انگریزی میں ڈے) وغیرہ وغیرہ۔ (مترادفات کی صحت)

میری رائے میں مترادف صحیح معنوں میں بھی بیرونی مترادف تسلیم کیا جاسکتا ہے

اندرونی مترادف محض ایک تشابہت ہے۔ جسقدر الفاظ۔ عربی۔ فارسی اور اردو میں اس وقت مرادف کہے جاتے ہیں۔ وہ ایک غلطی ہے۔ ایک ہی زبان کے اندر ہر لفظ بجائے خود اپنی ضرورت اور اپنے مفہوم کے ماتحت وضع ہوا ہے۔ اوسکے معنے اور محل ہمیشہ جداگانہ ہوتے ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ کوئی کوئی لفظ مرادف بھی ہو۔ مگر جس کثرت سے اس وقت مرادفات بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ صحیح نہیں۔ ہر زمانہ میں الفاظ کسی زبان کے اندر خاص ضرورت اور خاص محل کے خیال سے وضع ہوتے رہے ہیں۔ چونکہ عام طور پر لوگ ایک لفظ دوسرے لفظ کی جگہ بول دیتے ہیں۔ اسواسطے رفتہ رفتہ اونہیں مرادف کہا جاتا ہے۔ اور اوسکے ساتھ ہی لفظ مرادف کے معانی کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ اگر الفاظ میں ایک ہی زبان کے اندر کوئی مترادف ہے۔ تو یہ ہے کہ بوجہ ایک قسم کی تشابہت اور تناسب کے ایک لفظ دوسرے لفظ کا ہم ردیف ہے۔ یا ہم ردیف شمار ہو سکتا ہے۔ مثلاً عام طور پر لفظ تحقیق۔ تفتیش کو ایک ہی معنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان دونوں الفاظ کا مفہوم ایک دوسرے سے الگ ہے۔ چنانچہ انگریزی قانون میں بھی یہ دونوں لفظ جداگانہ معانی کے تحت استعمال پاتے ہیں جب پولیس کسی مقدمہ کی دریافت کرتی ہے۔ تو اوس وقت تفتیش بولا جاتا ہے۔ اور جب کوئی مجسٹریٹ یا کوئی اور شخص مجاز مقررہ عدالت میں دریافت کرتا ہے۔ تو اوس کا نام تحقیقات ہوتا ہے۔

بعض وقت مدعی اور مستغیث ایک ہی معنوں میں استعمال پاتے ہیں۔ مگر انگریزی قانون میں مدعی کا لفظ مقدمات مال جوڈیشل اور دیوانی میں اطلاق پاتا ہے۔ اور لفظ مستغیث فوجداری مقدمات میں اور یہ تاویل یا التعبیر بالکل درست ہے۔

لفظ دعوے میں وہ صورت اور کیفیت نہیں پائی جاتی۔ جو لفظ مستغیث میں پائی جاتی ہے جو لفظ استغاثہ میں ایک قسم کا تحکم اور جبر کی کیفیت پائی جاتی ہے جو لفظ دعوے میں نہیں ہے۔

ملزم اور مجرم کو بعض لوگ مرادف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ان دونوں کے مفہوم میں فرق ہے۔ ملزم وہ ہے جس پر محض الزام عاید کیا جاتا ہے۔ لیکن اوس کی قانونی تصدیق ابھی نہیں ہو چکی۔ اور مجرم وہ ہے جس پر ایک ثبوت گزرنے اور تحقیقات کے بعد الزام ثابت قرار دیا جاتا ہے۔ تدبیر اور تجویز میں بھی فرق ہے۔

تدبیر میں اختتامی صورت نہیں ہوتی۔ صرف ایک ڈھانچ یا کوشش ہوتی ہے اور تجویز وہ ہے۔ جسکے مطابق کوئی حکم دیا گیا ہو۔ یا کوئی صورت عمل میں لائی گئی ہو۔ موزون اور مناسب میں بھی فرق ہے۔ موزون تو وہ ہے۔ جو تو زیبا مفید سمجھا جاتا ہے۔ اور مناسب وہ ہے۔ جو ایک نسبت کی حیثیت سے مقدم رکھا جاتا ہے۔ دونوں کے اطلاق کا جداگانہ موقعہ و محل ہے۔ یہہ کہنا درست نہیں۔ کہ۔

"زید کے بدن پر یہہ کپڑا مناسب ہے۔

یا یہ کہنا چاہئے۔ یہہ کپڑا موزون ہے۔

لفظ موزون ایک وسعت رکھتا ہے۔ جو لفظ مناسب میں نہیں ہے۔

تنقید اور تدقیق بھی مرادف نہیں ہیں۔ جو مفہوم اور جو وسعت لفظ تنقید رکھتا ہے۔ وہ تدقیق نہیں رکھتا جب کوئی شخص کسی کتاب کی تنقید کرتا ہے۔ تو اوس پر لفظ تدقیق کا اطلاق نہیں پا سکتا۔ تدقیق میں صرف چند باریکیوں اور نزاکتوں کا اظہار اور تلاش ہوتی ہے۔ خلاف اوسکے تنقید میں ایک شے یا خیال اور ایک بحث پر ہر پہلو سے نظر ہوتی ہے۔ نقاد کے اور فرائض ہیں۔ اور مدقق کے اور مدقق کا کام اور درجہ نقاد سے کم ذمہ داری رکھتا ہے۔ مدقق ایک امر کی وضاحت اور دریافت کے بعد فارغ ہو جاتا ہے۔ اور اوسکی غلطی اور حجت وہیں ختم ہو جاتی ہے اور اوسپر چنداں الزام نہیں ہوتا۔ لیکن ایک نقاد کی ذمہ داری اخیر تک اسی پر

رہتی ہے۔ اور وہ ہر پہلو سے اپنی رائے کا جواب دیہہ ہے۔ اور اوس کا یہہ فرض ہے۔ کہ ہر پہلو سے ایسی تنقید کرے کہ شئے یا مضمون زیر تنقید سے ہی اوسکے خیالات اور الفاظ میں درخشانی۔ وضاحت زور اور وجاہت ہو۔ تحکم اور جبر بہی مرادف نہیں ہیں تحکم میں باوجود درشتی اور مجبوری کے کبھی کبھی ایک قسم کا حق اور دعوی بہی ہوتا ہے۔ جبر میں ایک محض جبر ہوتا ہے۔ بعض وقت ایک حاکم کسی کو ایک حکم ذرا سختی سے دیتا ہے۔ اور محکوم کو مجبور کرتا ہے۔ باوجود اوسکے اوس تحکم میں ایک حق حاکمیت بہی ہوتا ہے۔ لیکن ایک جابر کے فعل میں یہہ کیفیت نہیں ہوتی

رجا اور تمنّا میں بھی فرق ہے۔
رجا کہا ہے ایک کام کرکے نتیجہ کی خواہش کرنا تمنّا بغیر کسی تردد اور کام کرنے کے کوئی خواہش کرنا۔
ایک شخص نے زمین جوت کر بوئی اور غلّہ کی امید کی تو وہ ایک رجا ہے۔
دوسرا بغیر اس تردد اور محنت کے یوں ہی غلّہ کی امید رکھتا ہو تو وہ ایک تمنا ہے۔

غور اور تعمق میں بہی فرق ہے۔
غور کے معنے عمق اور قعر کے ہیں۔ اور کسی امر کو بہ توجہ تمام سوچنے کے بہی۔
تعمق کے معنے بہی غور کرنے کے ہیں۔ لیکن ساتھہ ہی اوسکے یہہ بہی کہ کسی چیز کی کنہہ دریافت کی جائے۔ جب یہہ کہا جاتا ہے۔ کہ غور سے جواب دو۔ تو اوس کا مطلب یہہ ہوتا ہے۔ کہ ذرا پوری توجہ سے جواب دو۔ اور جب یہہ کہا جاتا ہے۔ کہ بہ تعمق جواب دو۔ تو منشا یہہ ہوتا ہے۔ کہ ایسے غور کے بعد جواب دو۔ جو ہر پہلوئے خصوصیت بہی رکہتا ہو۔

عزم اور ارادہ میں بھی فرق ہے۔ گو یہ دونوں لفظ بجائے ایک دوسرے کے بول دیتے ہیں۔ مگر ان کے مفہوم اور معانی میں فرق ہے۔

عزم وہ ارادہ ہے جس میں مکمل ارادہ کا بالخصوص خیال ہوتا ہے۔ اور عازم جان جوکھوں لڑا کر بھی کوئی کام کرتا ہے۔ اور باوجود شکست اور ناکامی کے بھی لگا رہتا ہے ارادہ میں یہہ بات نہیں ہوتی۔ ارادہ صرف ایک ایسا خیال ہے۔ جسکے ساتھہ ساتھہ ایک آنیوالی صورت شامل ہوتی ہے۔ لیکن اوس میں وہ زور اور وہ ہمت اور استقلال نہیں ہوتا۔ جو عزم میں ہوتا ہے۔ جب ویسا استقلال اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ تو وہی ارادہ عزم بن جاتا ہے۔

حزم و احتیاط میں بھی فرق ہے۔

حزم کے معنے اندیشہ کردن در عاقبت انجام امر موہوم اور بقدر امکان خلل اور زلل بعض امور سے محترز رہنا۔ و نیز بہ معنے استواری و آگاہی کے بھی ہے۔

لفظ احتیاط کے معنے محض نظر بہ حفظ ما تقدم بعض امور کی نسبت خیال رکھنے کے ہیں جب حزم [illegible] جاتا ہے۔ تو اس کا منشاء یہہ ہوتا ہے۔ کہ امکانی کوشش سے فلان امر کی [illegible] سے محترز رہو۔

اور جب یہ کہا جاتا ہے۔ کہ احتیاط کرو۔ تو اوس کا مطلب یہہ نہیں ہوتا۔ کہ فلان فعل سے بچو۔ بلکہ یہ کہ اوسکی نسبت باعتبار اپنے ذاتی مفاد اور مضار کے خیال رکھو۔

رحیم اور رحمان میں بھی فرق ہے۔

رحم خدا اور انسان دونوں سے وابستہ ہے۔ اور رحمان صرف خدا ہے۔ یہ تو کہہ سکتے ہیں۔ کہ فلان انسان رحیم ہے۔ یہہ نہیں کہہ سکتے۔ کہ زید رحمان ہے۔ رحیم کا رحم عموماً تابع درخواست اور دعا ہوتا ہے۔ اور رحمان بلا درخواست اور بلا استدعا بھی رحم کرتا ہے۔ فقط اردو زبان میں بھی بعض ایسے الفاظ ہیں۔ جنہیں مرادف کہا

جاتا ہے۔ جیسے بہتر اور اچھا وغیرہ وغیرہ میری رائے میں اردو کے مرادفات
میں بھی محض ایک متناسب مترادف ہوتا ہے۔ اصلی معنوں میں نہیں پایا جاتا۔
جب ہم یہہ کہتے ہیں۔ کہ

" بہتر "

تو اوس کا منشا یہ نہیں ہوتا۔ کہ (اچھا) کیونکہ بہتر اور اچھا کے مفہوم میں فرق ہے
بہتر کا اطلاق جہاں جہاں ہو سکتا ہے۔ وہاں اچھا کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا
اسطرح جہاں اچھا کا اطلاق کر سکتے ہیں۔ وہاں بہتر کا نہیں کر سکتے۔ مثلاً

" بہتر کا تو یہہ ہے۔ کہ یہہ کام ہو جائے۔

" اچھا تو یہ ہے۔ کہ یہ کام ہو جائے۔

بہتر والے فقرہ میں ایک خاص زور ہے۔ جو اچھا والے فقرہ میں نہیں۔
جب کوئی سلسلہ کلام میں یہ کہتا ہے۔ کہ

" بہت بہتر "

تو اوس کا زور بہ مقابلہ بہت اچھا کے زیادہ ہوتا ہے۔ چونکہ ہم اس بحث پر انشاءاللہ
ایک جداگانہ رسالہ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسواسطے اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔

(۶) جب بحث بالا کے مطابق مرادفات کا صیغہ ثابت نہیں یا بہت ہی کم ثابت ہے۔ تو کہنا پڑے گا۔ کہ غیرت مرادف الفاظ کی ہے۔ اور توضیعی نقطہ خیال سے بھی غیر مرادف الفاظ ہی کی زیادہ تر ضرورت ہے۔

(۷) میری رائے میں دو متفاوت الشکل والترکیب الفاظ کے معانی میں کچھہ نہ کچھہ فرق ہوتا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ بعض الفاظ متحد المعانی ہی ہوں۔ اور اون کے معانی میں کچھہ بھی فرق نہ ہو۔ لیکن عموماً ایسا نہیں ہے۔ الفاظ کی ایک ہی قسم مثل ایک ہی قسم کے کپڑوں کے تھانوں کے نہیں ہوتی۔ کہ اون کی کیفیت میں

کوئی فرق نہ ہو۔ الفاظ مختلف ترکیب مختلف تلفظ اور مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ اون میں ترکیباً۔ تلفظاً۔ قسماً۔ اور معناً فرق ہوتا ہے۔ اگر کبھی بعض الفاظ کے معانی میں فرق نہیں ہوتا۔ تو وہ یا تو شاذ و نادر ہے اور یا توارد۔

البتہ دو زبانوں کے الفاظ میں مترادف ہوتا ہے۔ مثلاً۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی اور سنسکرت۔ کے اون الفاظ میں جو ایک دوسری زبان کے مقابلہ میں ایک ہی قسم کے معنے رکھتے ہیں۔ مثلاً انگریزی میں۔ مینگو ایپل اورنج اور فارسی میں۔ انبہ۔ سیب۔ اور رنگترہ۔ آپس میں مترادف ہیں۔ ایسے الفاظ میں صرف ترکیب حروفی کا ہی فرق ہوتا ہے۔ معانی تقریباً ایک ہی ہوتے ہیں۔ ایسے مترادف کا نام مترادف فی الفاظ الالسنہ ہو سکتا ہے۔

۷۸۶

(اطلاق الفاظ)

(ترکیبی)

بعض الفاظ بولنے میں ایک ہی معلوم ہوتے ہیں۔ یا ایک ہی معنوں میں اون کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن وہ دراصل دو یا دو سے زیادہ لفظ ہوتے ہیں۔ اور وہ نہیں کبھی کبھی ایک ہی موقعہ پر اور ایک ہی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو وہ مختلف موقعہ و محل پر اطلاق پاتے ہیں۔ اور جدا ہو کر بھی اون کے معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک ہی لفظ توڑا جا کر کوئی معنے نہیں دیتا

لیکن ایسے ترکیبی الفاظ لوٹ کر بھی مصنے دے جاتے ہیں۔ یہہ جداگانہ صورت ہیں گو طبعی اور بلکہ تکوینی کی ذریات ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی ترکیب کی حالت ہیں اونکی ایسی ترکیب ایک ضیعی ہیئت رکھتی ہے۔ مثلاً۔

کام گار۔ نام ور۔ نام دار۔ ناکام۔ ناخوش۔ مہربان۔ پائیدار۔ ناہنجار ناگفتہ بہہ۔ نامراد۔ نیم جان۔ کامند۔ ہوشیار۔ بیدار۔ ناراض۔ ناگاہ تابع دار۔ فرمانبردار۔ خشم گیں۔ اندوہ ناک۔ افسوس ناک۔ بے رخ۔ بدمزاج۔ بدبخت۔ بدقماش۔ بداندیش۔ بدنما۔ ہول ناک۔ حیرت خیز بے طرح۔ بے بس۔ بے کس۔ بدقسمت۔ بدنصیب۔ بے چگون بے طور۔ بے ڈھنگ۔ رحم دلی۔ یک دم۔ یک مشت۔ یک دلی۔ یک سو۔ قلم تراش۔ قلم کش۔ بدسلوک۔ بے صبر۔ بے عقل بے سمجھ۔ آسمان۔ نیلگون۔

ہر زبان ہیں صدہا الفاظ اس قسم کے مستعمل ہیں جب کوئی مفرد جامع لفظ نہیں ملتا۔ تو اس قسم کی ترکیبوں دو لفظی یا سہ لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ عموماً دو لفظی ترکیبیں ہوتی ہیں۔ ایسے ترکیبی الفاظ ہیں عموماً یہہ نہیں دیکھا جاتا۔ کہ شروع اور اخیر کے لفظ کس کس زبان سے لے گئے ہیں۔ مثلاً۔

لفظ نامراد ہیں نا فارسی اور مراد عربی ہے۔ ناراض ہیں نا فارسی راضی عربی تابع دار ہیں تابع عربی اور دار فارسی بدمزاج ہیں مزاج عربی اور بد فارسی بدبخت ہیں بد فارسی اور بخت عربی ہے۔ بدقماش۔ ہولناک۔ حیرت خیز۔ بے طرح۔ بدقسمت۔ بدنصیب ہیں بد فارسی اور اگلے الفاظ عربی ہیں۔

ایسی ترکیبات کی صورت میں اصلی زبان میں ایسے الفاظ جن معانی میں استعمال پاتے ہیں۔ وہ معنے باقی نہیں رہتے۔ بلکہ ان کی لغوی زندگی شروع ہوتی ہے۔ مثلاً نامراد کے معنوں میں عربی زبان کے اندر مراد کبھی استعمال نہیں ہوگا ایسی ترکیبات کی صورت میں گویا ایسے الفاظ ایک ہی کیفیت کے تابع ہو کر استعمال پاتے ہیں۔ ایسے ترکیبی الفاظ ہمیشہ ترکیب دئے جاتے ہیں۔ ان کی ترکیب میں وہ دقتیں کسی وقت پیش نہیں آتیں۔ جو مفرد الفاظ کی صورت میں آتی ہیں۔ یا اسلاف کو ہو چکی ہیں۔ اگرچہ ایسی ترکیبیں اضافی رنگ میں دو مختلف زبانوں کی صورت میں برنگ ادبی جائز نہیں سمجھی جاتیں۔ مگر اضافتی حدود سے باہر ہو کر جائز ہی سمجھی جاتی ہیں۔ اور بعض دفعہ ایک حد تک جائز ہی رکھی جاتی ہیں۔ مثلاً عام طور پر لوگ نصیب دشمنان۔ حکم جناب۔ ارشاد جناب۔ نام مولے۔ نام حق۔ زبان خلق۔ وغیرہ وغیرہ بولتے ہی رہتے ہیں۔ مگر ادبی حسن کے اعتبار سے ایسی ترکیب کوئی حسن نہیں رکھتی۔ یا حدود حسن ادبیہ سے اجنبی ہوتی ہے۔

جوں جوں زبانوں میں اختلاط زیادہ ہوتا جائے گا۔ دون دون اس قسم کی تراکیب میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔ اور اس قسم کی نامناسبتین صرف تحریری سلسلون میں ہی ملحوظ رہ سکیں گی۔ گفتگو اور تقریر میں کوئی لحاظ نہیں رکھا جائے گا۔ جہاں دو زبانوں کے الفاظ کی ایک دوسرے سے مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ وہاں اسی قسم کی صورتیں پیش آتی ہیں۔

۶۸۶

(بچون کی زبان سے)

(استدلال)

بچے جو کچھہ بولتے یا اون آن غون غان کرتے ہیں - وہ ہی چند آوازین اور چند الفاظ ہی ہوتے ہیں - گوکہ اون آوازون اور اون الفاظ کے ہماری رائے مین معانی کچھہ نہیں ہوتے یا یہہ کہ ہم اون کے مفہوم سے ناآشنا ہوتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بچون کے ذہن میں اون کا کچھہ نہ کچھہ مفہوم ضرور ہوتا ہے - گو کہ وہ کیسا ہی ناقص ہو - اور اس بات سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے - کہ ایسی آوازین کسی نہ کسی حد تک لفظی ترکیب رکھتی ہیں جب بچے اشارات کرتے ہیں - تو وہ ہی مقدمہ الفاظ ہی کا ہوتے ہیں - چونکہ بچون کی قوت بیانی اور قوت طلاقت اتنی مضبوط اور پختہ نہیں ہوتی - اسواسطے اون سے پورے زور کیساتھہ یا بہ صحت الفاظ اطلاق نہیں ہو سکتا -

ایک نوزائیندہ بچہ کا اون آن کرنا الفاظ کا مقدمہ ہی تو ہوتا ہے - جب بچہ دا ناں کہکر پانی مانگتا ہے - تو دراصل اوس کا مدعا پانی ہی ہوتا ہے - بچہ جب پیاس کا احساس کرتا ہے - تو اوسکے منہ سے بیساختہ پانی کے مفہوم میں کوئی لفظ نکل جاتا ہے - جب ماں پانی پلاتی ہے - تو بچہ سمجھتا ہے - کہ اوس نے جو کچھہ کہا تھا - وہ درست تھا - اس سے یہہ ثابت ہوا کہ اوس فطرتی اقتضا سے جو ہر ایک انسان کی طبیعت میں پایا جاتا ہے - ہر بچہ کی طبیعت

میں پایا جاتا ہے۔ ہر بچہ کی طبیعت میں ہی تکوین الفاظ کا مادہ اور ملکہ موجود ہوتا ہے۔ وہ تکمیل طلاقت سے پہلے کوئی نہ کوئی لفظ منہ سے نکالتا رہتا ہے۔ اور اپنی دانست میں وہ ضرورت کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ لیکن چونکہ اعتباری اور عرفی زبان کے الفاظ سے ایسے الفاظ متغایر ہوتے ہیں۔ اسواسطے یہہ سمجھا جاتا ہے۔ کہ بچہ جن الفاظ میں بول رہا ہے۔ وہ بے معنے ہیں بشروع شروع میں ایسے ہی الفاظ ایک پختہ کار انسان کے منہ سے بھی نکلے ہوں گے۔ جو رفتہ رفتہ خاص اشکال اور خاص معانی کے تحت تاویل پاکر صحیح اور فصیح الفاظ سمجھے جانے لگے۔ بچے ہمیشہ اون ہی الفاظ میں گفتگو کرنے کے عادی ہیں۔ جو اون کی الہٰی طبیعت اونہیں سکھاتی ہے۔ اور اکثر اوقات والدین اون ہی خام الفاظ سے ایک پختہ اور صحیح نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ شروع شروع میں بھی اسی طرح الفاظ سے استدلال کیا جاتا تھا۔ اور رفتہ رفتہ وہی شروع کے الفاظ صحیح معانی میں منتقل ہوکر ایک صحیح اور مستقل ذخیرہ بنتے گئے۔ جب پہلی دفعہ انسان کے منہ سے (لفظ روٹی) نکلا ہوگا۔ تو اوسوقت وہ بھی ایک مہمل لفظ ہی کی شان رکھتا ہوگا۔ رفتہ رفتہ وہی لفظ ایک صحیح اور مستقل لفظ سمجھا گیا۔ اور اوس سے کام لیتے لیتے اوسے ایک بامعنے اور صحیح لغت قرار دیا گیا۔

اگر روٹی کے بجائے کوئی اور لفظ مثلاً (نان اور بریڈ) سرزمین ہندوستان کے کسی انسان کے منہ سے نکل جاتا۔ تو آج وہی روٹی کی طرح معقول اور صحیح سمجھا جاتا۔ جیسے کہ اب فارس اور انگلستان میں یہہ دونوں لفظ صحیح معنوں میں استعمال پاتے ہیں۔

اوراب اون کی بابت کسی کو شبہ بھی نہیں ہوتا۔

(زبان مختلف خیالات کا)
(ایک نادر مجموعہ ہے)

جیسے مواد قدرت یا مواد کائنات کے بغیر کوئی تعبیر اور کوئی تشبیہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے ہی یہہ بھی کہا جائے گا۔ کہ سوائے خیالات یا تخیل کے کوئی زبان بھی نشو ونما نہیں پاسکتی۔ سب سے پہلے ایک یا چند صورتیں خیالی پیرایہ میں مشتمل ہوتی ہیں۔ اور پھر اون کی مختلف رنگوں میں بذریعہ آلہ زبان کے متلفظانہ پہلو سے تعبیر کی جاتی ہے۔ قوت متخیلہ دوسری طرف اون اعضا یا اون اجزا کی بھی محتاج ہے۔ جو حواس ظاہری سے تعبیر پاتے ہیں۔ اگر آنکھیں نہ ہوں۔ تو۔

بہت سا حصہ مناظر قدرت کا ادراک اور مشاہدہ سے باقی رہ جائے جو شخص کسی منظر۔ کسی شے اور کسی سماں کو دیکھتا نہیں۔ یا دیکھہ نہیں سکتا۔ وہ اوسکی تعبیر کن الفاظ میں یا کس طرح کرسکتا ہے۔ جب ہم پھول کی شکل ہی سے آشنا نہیں۔ تو اوس کا تخیل کیسے ہوسکتا ہے جس نے کبھی اونٹ دیکھا ہی نہیں۔ وہ اوس کی نسبت کیا کچھہ خیال کرسکتا ہے۔

کرسکتا ہے اسطرح قوت سامعہ سے اگر کوئی عاری ہو۔ تو وہ اشیاء جو قوت
سامعہ کی تفویض میں دی گئی ہیں۔ کس طرح اوسے اون کا علم ہو سکتا ہے
اور وہ اون کی تعبیر کیسے کرسکتا ہے۔ اس طرح ذائقہ سمجھو۔ ظاہری حواس
کے بغیر اندرونی حواس یا اندرونی قوتیں نصف رہ جاتی ہیں۔ بے شک
ہماری اندرونی قوتیں اور اندرونی حاشیے ہی ایک حد تک مدرک اور
حساس ہیں۔ مگر اون کے ادراکات اور حسیات کا بہت سا حصہ بیرونی قوتوں
کے سہارے پر ہی ہوتا ہے۔

خیالات کی تقلید اور تحدید بہت کچھہ مشکلات اور بوقلمونیت رکھتی ہے
خیالات کا نشو ونما اور حدوث ہر ایک انسان کی طبیعت میں مختلف
رنگون سے ہوتا ہے۔ اور انسانون کے خیالات آپس میں بہت کچھہ مختلف
ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ یہانتک اختلاف ہوتا ہے۔ کہ ایک کو دوسرے
سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوتی۔ ہر انسان اپنے اندرونہ اور باطن پر غور کرنے
کے بعد یہہ اندازہ لگا سکتا۔ اور فیصلہ کرسکتا ہے۔ کہ شروع شروع
میں خیالات کے رو اور تموّج کی کیا کچھہ صورت اور کیفیت تھی۔ گفت و
شنود اور سلسلہ طلاقت کے ساتھہ ہی اضطراب اور گھبراہٹ کا بھی
بہت کچھہ زور ہوگا۔ ایک طرف انسان کے سامنے عام کائنات اور بہانت
بہانت کی ذریات قدرت موجود تھی۔ اور دوسری طرف وہ نہیں جان سکتا
تھا۔ کہ اس ہمسایہ کائنات کا کیا کچھہ مدعا اور کیا کچھہ مطلب ہے۔ اور
اس کائنات کو مخاطب کیونکر کرنا ہے۔

ایسی حالت میں ایسے شخص کے منہ اور زبان سے مجبوراً اون خیالات یا
اون توہمات کا اطلاق اور حدوث بعید نہیں تھا۔ جو اوسکے دل و دماغ میں

متموج تھے۔ ہم قیاس کر سکتے ہیں۔ کہ ایسے خیالات کی صورت میں ژولیدگی اور پریشانی اور تسلسل کس حد تک ہوگا۔ یہی صورت بدو خلقت میں تکوین زبان اور تفہیم زبان کی بھی تھی۔ مجبوراً اور ضرورتاً الفاظ کے لباس میں خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ اور اوس قوت طلاقت اور ملکہ تکوین کے زور سے جو نسلاً بعد نسلاً قدرت نے اپنے فیضان عام کے تحت اوسکی طبیعت یا اوسکی فطرت میں ودیعت کر رکھا تھا۔ اور جس پر اوسکے کمال نطق اور کمال طلاقت کا مدار تھا۔ اور جو صرف اوسکے فضل و برکت کا ہی باعث نہیں تھا۔ بلکہ مخلوقات اور دیگر کائنات کے مقابلہ میں ایک برہان ناطق بھی تھی۔ اور جس سے کوئی دوسری خلقت مفتخر اور ممتاز نہ تھی۔ خود بخود بیساختہ الفاظ نکلتے جاتے ہیں جس طرح بچہ کے پیدا ہونے کے ساتھ ہی اوسکا کوئی نہ کوئی نام رکھا جاتا ہے حالانکہ اوسکے پیدا ہونے کے پہلے اوس نام کا خیال تک نہیں ہوتا۔ اوسی طرح ہر چیز کے سامنے آنے پر اوس کا کوئی نہ کوئی نام رکھا جاتا ہے .... یا کسی نہ کسی نہج پر اوسکی تعبیر کی جاتی ہے۔ یا یہ کہ ہر شئے کو اپنی ضرورت اور اپنے مذاق کے مطابق ایک نام دیا جاتا ہے۔

جسطرح رفتہ رفتہ اشیائے نوشیدنی اور خوردنی کا تہیہ ہوتا۔ اور پتہ لگتا گیا اوسی طرح بولیوں اور اسمار کا ذخیرہ بھی۔ رفتہ رفتہ مہیا ہوتا گیا۔ مثلاً جب انسان نے فرش زمیں اپنے پاؤں کے تلے۔ اور آسمان کو اپنے سر پر دیکھا۔ اور ان دونوں کا نہ تو کہیں کوئی نام لکھا پایا۔ اور نہ اونکی کوئی کیفیت دیکھی۔ تو حیران ہوکر یا کچھ غور کرنے کے بعد اوس نے اون دونوں کو اپنے خیالات یا سمجھ کے مطابق نامزد اور تعبیر کیا۔ یا یہ کہ اون کے تخاطب یا اشارہ کیلئے اون کا کوئی نہ کوئی نام رکھ لیا۔

رفتہ رفتہ وہی نام یا وہی تعبیر تسلیم کی گئی ۔ اگر یہہ کہا جاوے ۔ کہ ایسا نہیں ہوا ہے ۔ تو معترض کو دو باتیں پیش کرنی چاہئیں ۔

(الف) اول یہہ کہ خود قدرت کی جانب ہی سے اشیاء اور مناظر قدرت کے نام تجویز شدہ تھے ۔

(ب) یا یہہ کہ انسان کو کسی اور طاقت نے ان ناموں اور ان کیفیات سے آگاہ کیا ۔

سب سے اول اسپر یہہ اعتراض ہوگا ۔ کہ اگر فی الواقعہ ایسی ہی صورت تھی ۔ تو چاہیئے تھا ۔ کہ کل دنیا میں اور کل کائنات کے اندر تمام اجزائے کائنات کا ایک ایک ہی نام ہوتا ۔ کیونکہ قدرت تو انسانی گروہوں کی طرح مختلف نہیں تھی ۔ اوسکی زبان تو ایک ہی ہونی چاہیئے ۔ لیکن ہم اس کے خلاف پاتے ہیں ۔ اس سے ثابت ہے ۔ کہ یہہ سب کچھہ ہمارے تخیلات اور تصرفات کا ہی اثر ہے ۔ دوسری توجہہ کی نسبت یہہ کہا جائے گا ۔ کہ حضرت انسان کے سوائے کوئی دوسری ایسی ہستی تسلیم نہیں کی گئی ہے ۔ جو ایسا خلق اور ایسا ملکہ تکوین رکہہ کر تسمیہ اشیاء کی بانی ہو ۔ اور ادہر نہ تو زمین اپنا نام بتاتی ہے ۔ اور نہ آسمان اسکی بابت کچھہ کہتا ہے ۔ بچہ پیدا ہوکر نہ تو اپنا نام بتاتا ہے ۔ اور نہ خود کوئی نام رکہتا ہے ۔ ہمیشہ دوسرے انسان ہی نام رکھتے اور تعبیر کرتے ہیں ۔ اسی طرح قدرت کو بھی کچھہ ضرورت نہ تھی ۔ کہ اپنی کائنات کو انسان کی خاطر چند مختلف ناموں سے موسوم کرتی ۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے ۔ کہ قدرت کے دفاتر میں اس کائنات اور اجزائے کائنات کے نام کیا کیا ہیں ۔ یا قدرت کس رنگ اور کس پیرایہ میں اونکی تعبیر کرتی ہے ۔ بلکہ الہامی کتابوں میں خدا وہی نام لیتا ہے

جو انسانون کے رکھے ہوتے ہیں۔ اس ساری بحث کا لب لباب اور نتیجہ یہہ ہوگا۔ کہ اس کائنات میں جو کچھہ تعبیرات کی گئی ہیں۔ وہ سب انسانی ذہن اور انسانی تصرفات ہی کا نتیجہ ہیں۔ قدرت کو ایسے بکھیڑون میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ قدرت نے انسانی طبائع میں مختلف قوتیں اور ملکہ تکوین رکھہ کر اوسکے سامنے اور اردگرد بوقلمون بساط بچھادی۔ اور خود یہ فرض ادا کرکے خاموش ہوگئی۔ اور یہہ تماشا دیکھنے لگ گئی۔ کہ اون نادر قوتوں پُرزور جذبات اور ملکات تکوینی سے انسان اس بساط بوقلمون کی تعبیر کن کن الفاظ اور کس کس پیرایہ میں کرتا ہے۔ اور انسانی خیالات اور تصرفات کی رو کس کس طرف جاتی ہے۔

۸۶

علمی رنگ میں زبان

علمی رنگ میں زبان صرف بول چال کا ذریعہ اور مطلب فہمی کا جوہی آلہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک مستند تاریخ اور وسیع الظرف نظم یا شاعری بھی ہے۔ شاعری اور نظم میں کیا ہوتا ہے۔ بعض مضامین اور مناظرہ کا خلاصہ ایک ایسی خوش آیند ترکیب سے۔ کہ سننے والون کے دل و دماغ پر ایک خوش اسلوبی کے ساتھہ اثر کرے۔ اور اوس میں ایک جذب اور قدرت پیدا کیجائے

جو کہی ایک طرح سے مطبوع طبائع اور مرغوب قلوب ہو۔ یہ باتیں اور یہ تاثرات زبان میں ہی پائے جاتے ہیں۔ کوئی زبان بھی کسی حد تک ان فضائل اور ان جذبات سے خالی نہیں ہوتی۔ بے شک بعض زبانوں کو یہہ بات پورے طور پر حاصل نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی زبان خالی ہی نہیں ہوتی ہے۔ جب کوئی انسان دوسرے انسان سے گفتگو کرتا ہے۔ تو اوس کے پانچ پہلو ہوتے ہیں۔

(الف) دوسرے اوس سے کچھہ حاصل کرتے ہیں۔

(ب) دوسرے اوس سے متاثر ہوتے ہیں۔

(ج) چند واقعات کا اظہار ہوتا ہے۔

(د) چند واقعات اور کیفیات کی تنقید ہوتی ہے۔

(س) دونوں کے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہی باتیں ہیں۔ جو ایک شاعر یا ایک ناظم نظم کرتا ہے۔ اور یہی تاثرات ہیں جو کہ کسی ناظم اور شاعر کے مزعوم ...... ہوتے ہیں۔ اگر زبان یا زبانوں کی اس طرح پر بندش نہ ہوتی۔ تو واقعات کیفیات و معلومات کا ایک قیمتی اور حصہ کثیر رائگان جاتا یاد کرنے سے ہی یاد نہ آتے۔ زبان یا زبانوں کے جملے۔ فقرات۔ کیا ہیں۔ ایک منتشر نظم کے حصے اور بکھرے ایک پریشان شاعری کے ریزے ٹکڑے اور اجزا گو ایسے حصے اور ایسے ٹکڑے ردیف۔ قافیہ کے پابند اور کسی وزن کے رہین نہیں ہوتے۔ مگر پھر بھی اون میں ایک صورت نظم بندش اور موزون سلاست ایک ...... بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ اور وہ صدہا مطالب ہزاروں مقاصد اور لاکھوں مراحل کے حامل اور معنوی ہوتے ہیں۔ ایک ایک جملہ اور ایک ایک

فقرہ پر بڑی بڑی مبسوط کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ ہرایک زبان کی کہاوتیں اور ضرب الامثال اقوال مختلف واقعات کا نچوڑ اور خلاصہ ہیں جسطرح ایک شعر کی شرح کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح زبان کے جملوں اور فقرات کی بھی شرحیں ہوسکتی ہیں۔

ہم اپنے گرد وپیش دو قسم کی کائنات اور موجودات پاتے ہیں۔

(الف) کائنات صامتہ۔

(ب) کائنات ناطقہ۔

زبان یا زبانیں کائنات منطوقہ ہے۔ جسطرح دوسری کائنات کے ایک ایک فرد میں طرح طرح کی حکمتیں اور رموز مخفی ہیں۔ اسی طرح زبان کے حروف۔ الفاظ۔ فقرات اور جملوں میں بھی ہزاروں خوبیاں اور عمدگیاں مودعہ ہیں۔ یہہ وہ سرمایہ ہے جس پر انسان کو فخر ہو اور انسانی نسلوں کو ناز ہے۔ یہ وہ ورثہ ہے۔ جسکے مقابلہ میں کسی اور مخلوق کو ورثہ نہیں ملا ہے۔ یہہ وہ جائداد ہے جس کی قیمت ہی نہیں پڑ سکتی۔ یہہ وہ رشتہ اور وہ نسبت ہے۔ جو دنیا کی ساری انسانی نسلوں کو ایک دوسرے سے ملاتی اور پورانی قرابتیں یاد دلاتی ہے۔ اگرچہ اس کا شروع بہت ہی محدود تھا۔ لیکن انسان کی ذاتی قابلیت اور ضروریات نے اوسکی طنابیں اسقدر مضبوط اور دراز کردی ہیں۔ کہ اب اسکے سوائے دنیا کا کوئی مرحلہ دنیا کی کوئی منزل خالی ہی نہیں۔ اگر آج اسکی طنابیں توڑ دی جائیں۔ اور اگر آج یہہ سلسلہ منقطع کردیا جائے۔ تو دنیا کی ساری منڈیاں ہی برباد ہوجائیں۔ انسان کے سر پہ جو طرہ فضیلت رکھا گیا ہے۔ وہ اسی کی بدولت ہے۔ انسان جو اپنے ہمعصروں میں گوئے سبقت لے جارہا ہے۔ اسی زبان کی بدولت ہے۔ اسے وہ فضیلت

ہے۔ کہ کلام الٰہی بھی اسی میں اترا۔

۷۸۶

(زبان بھی ایک شاعری ہے)
(یا ایک فن)

زبان کیا ہے۔ ایک شاعری یا ایک فن جسطرح شاعری یا ایک فن میں منتشر اور مختلف خیالات اور مواد کی تالیف اور ترکیب موزونہ سے ایک جدید کیفیت جدید سماں اور ایک دلاویز صورت پیدا کرکے سننے والوں کو محو حسن بیان اور محو حیرت بنایا جاتا ہے۔ اسی طرح زبان کی ترکیب اور تالیف سے ہی کاروبار ہی زندگی اور ادبی منازل و معاملات معادی و معاشری ہیں چند دل چسپیاں و دلاویزیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ ایک طرف انسانی خیالات پریشان و منتشر تھے۔ اور انسان بجائے خود مضطرب اور دوسری جانب کائنات اور کیفیات کائنات کی دلاویز بساط بچھی تھی۔ ان دو متضاد حالتوں میں انسان بجائے خود حیران و پریشان تھا۔ ایسی پریشانی کی صورت میں وہ ٹھیک ایک بچہ کی طرح اپنے حالات کو ایک مرکز پر لانے کی کوششوں میں سرگردان تھا۔ آخر اوسکی فطرت اور

قوتوں نے زور مارا۔ اور وہ رفتہ رفتہ منتشر افراد کے جوڑنے اور اونکی تعبیر میں کامیاب ہوا
اور اوس نے اپنے مجتجمہ خیالات کے بموجب ہر ایک شے اور ہر ایک فرد کائنات
کے ترتیب دینے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ اور اجزائے کائنات
کے نام رکھنے اور مخاطب کرنے کے مختلف طریقے نکالے۔

جسطرح ایک شاعر ہر لفظ اور ہر جملہ شعر میں ایک غور اور انتخاب کے بعد
رکھتا۔ اور انتخاب اور پس و پیش لگانے میں اپنی قوت مجتجمہ سے کام لیتا
ہے۔ اسی طرح زبان کے ترتیب دینے والون نے بہی شروع شروع میں
ایسا ہی کیا۔ اور رفتہ رفتہ اوس میں اور بہی اصلاحیں ہوتی گئیں۔ دیکھو ایک شاعر
کے دل و دماغ میں جب مختلف خیالات کا حدوث اور تموّج ہوتا ہے۔ تو وہ
کیسی گھبراہٹ میں پڑجاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اوسکی طبیعت اور اوس کا ذہن
اوسے کن کن منازل سے لے جاتا ہے۔ اور اخیر پر اوسکے قلم سے کیا کچھہ صفحہ
قرطاس پر نقش ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح شروع شروع میں لسانی مراحل
کا بہی فاصلہ طے ہوتا گیا۔ اور رفتہ رفتہ اوسکی صحیح بنیاد پڑتی گئی۔ پہلے اوسکے
دل و دماغ میں آسمان زمین وغیرہ اشیاء کی بابت خیال پیدا ہوا۔ کہ یہہ
چیزیں کیا ہیں۔ مختلف کروں میں رہ کر انسان نے ان کے مختلف نام رکھے
پھر ان کے متجزیات ساتھہ کے ساتھہ پیدا ہوتے گئے۔ اور زبانوں کی ڈکشنریوں
اور حافظوں میں اونہیں جگہ ملتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک مدت کے بعد ایک
اچھا ذخیرہ بن گیا۔ اور جسطرح شاعری کے متعلق مختلف قواعد بنائے گئے
اور فن عروض وضع کیا گیا۔ اسی طرح زبان کے متعلق بہی مختلف قواعد بنائے
گئے۔ شاعر کے واسطے تو قواعد شاعری اور عروض کا بنانا کسی قدر سہل تھا۔
کیونکہ اوس سے اول اوسکے سامنے لسانی قواعد موجود تھے۔ لیکن زبان داؤن

کے واسطے مشکلات تھیں - کیونکہ اونکے سامنے کوئی قواعد موجود نہیں تھے -
دوسری طرف انسانی نسلیں سہولت زندگی کی خاطر رفتہ رفتہ جدا جدا ہوتی گئیں - اور خیالات کا موج بھی مختلف صورتیں اختیار کرتا گیا - اس واسطے زبانوں میں بھی اختلاف ہوتا گیا - اگرچہ تسمیہ اشیا اور تعبیر مناظر کائنات میں مطلب سب کا قریباً ایک ہی تھا - لیکن قیاس اور اجتہاد میں فرق ہوتا گیا - ایک کہانی بیان کی جاتی ہے - کہ اتفاقاً چار شخص ایک جگہ یا ایک سفر میں اکٹھے ہو گئے چاروں کی زبانیں جدا جدا تھیں - ایک نے اون میں سے کہا - کہ میں انگور خریدنا چاہتا ہوں - دوسرے نے کہا - کہ میں عنب لوں گا - تیسرے نے کہا - کہ میں گریپ پسند کرتا ہوں - چوتھے نے کہا - میں داکھ لوں گا - چاروں میں جھگڑا پڑ گیا - اتفاقاً ایک انگور فروش آنکلا سب نے اوسے دیکھ کر بالاتفاق کہا - کہ بس ہمیں یہی میوہ چاہیئے - اور جھگڑا چک گیا - دیکھو شئے ایک ہی تھی - اور اوس کا نام اور تعبیرات جدا جدا ہیں -

کائنات اور اجزائے کائنات کی کیفیات اور تعبیرات ایک ہی ہوتی ہیں - اور قدرت کے دفتروں میں بہ لہجہ انسانی کوئی نام نہیں رکھا گیا - یا اوس کے مطابق جیسے انسان اونہیں نامزد کرتا ہے - انسانوں نے اپنی اپنی ضروریات اور مذاق اور اجتہاد کے مطابق اونکی نامزدگیاں کی ہیں - مختلف تعبیرات میں جو فرق ہے - اوسکا اکثر حصہ محض اجتہادی ہوتا ہے - نہ کہ احتسابی اور واقعی کاغذ پیپر اور قرطاس تینوں ایک ہی شئے ہیں - اگرچہ تہانام کاغذ کا ساگز - اور پیپر رکھا جائے - تو اوس کے قبول کرنے میں بہی سوائے اسکے اور کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا - کہ یہہ لفظ ہماری ڈکشنریوں اور ہمارے حافظوں میں نہیں پائے جاتے -

اس سے یہہ تو لازم نہیں آتا۔ کہ یہہ اجتہاد قابل ماننے کے نہیں ہے۔ ہان یہہ کہا جائے گا۔ کہ مسلمات جمہور کے خلاف ہے۔ اگر پہلے پہل یہی لفظ وضع کیا جاتا۔ یا پیش ہوتا۔ تو دیگر الفاظ کی طرح یہہ بہی مقبول عام ہوتا۔ اور بجاے ان کے لفظ کاغذ اور پیپر قبول نہ کیا جاتا۔ یہہ تسلیم کر لینا چاہئے۔ کہ انسان کی طبیعت ایک بڑی حد تک مجتہد واقعہ ہوئی ہے۔ ماوہ اور اکی کے ساتھہ ہی مادہ اجتہادی اور قیاس ہی اوسکی طبیعت میں مودعہ ہے۔ جو چیز اوسکے سامنے آتی ہے۔ اوسکی وہ کچھہ نہ کچھہ تعبیر کرتا ہے۔ شاعری بھی ایک اجتہاد ہی ہے۔ دیکھو دو نازک خیال ایک ہی واقعہ کس خوبصورتی کے ساتھہ دو جداگانہ رنگوں میں پیش کرتے۔ اور اپنے اپنے جداگانہ اجتہادات اور مقالات کے محاسن اور خوبیاں دکھانے میں زور طبیعت لگاتے ہیں۔ سعدی اور حافظ کے بعض اجتہادات اور مقالات شاعری میں الیسا لطیف فرق ہے۔ کہ ایک غور کرنے والے اور نزاکت پسند انسان پر اون دونون کے وسعت خیال کا پہلو بہ خوبی روشن ہو سکتا ہے۔

مختلف زبانیں کیا ہیں۔

- " جداگانہ اجتہاد۔
- " جداگانہ قیاس۔
- " جداگانہ تعبیرات۔
- " جداگانہ اندوختہ۔
- " جداگانہ مجموعہ خیالات۔

حقایق اشیاء ایک ہی ہیں۔ اشیاء کی نوعی فطرتون کا رنگ بہی ایک ہی ہے۔ لیکن انسانون کے اجتہاد۔ قیاس اور مذاق کا رنگ

اور پیمانہ جدا جدا ہے۔ اس کائنات میں جو چیز اور جو وجود پایا جاتا ہے۔ وہ صرف اپنی ہی حدود اور اپنے ہی رنگ میں شناخت کیا جاتا ہے۔ لیکن ذرائع شناخت اور وسائل تعارف جدا جدا ہوتے ہیں۔ ہم کہہ چکے ہیں۔ کہ

"زبان ایک فن ہے۔

فن کیا ہے۔

نیچر نے جو چیزیں پیدا کی ہیں۔ اور جو قدرت کے مختلف مناظر ہمارے اردگرد پائے جاتے ہیں۔ اون کو بہ ذیل ترکیب۔ ترتیب اور اجتہاد خود لاکر اور اون میں ایک ایسی جدت پیدا کرکے جو اون میں نہیں پائی جاتی۔ یا اون سے متغائر ہے۔ اپنے رنگ میں دکھانا۔ اور انسانی آسائش اور سہولت کے واسطے اون کا استعمال اور برتاؤ۔

"دوسرے الفاظ میں فن کیا ہے۔

"ایک ترکیبہ اور ایک تہذیب۔

جو انسان مناظر قدرت اور سامان قدرت میں اپنے مذاق اور اپنے اجتہاد کے مطابق ایک جدت پیدا کرکے اونہیں ایک بڑی حد تک اپنے مطلب اور اپنے کام کے مطابق بناتا یا مطابق بنانے کی کوشش میں رہتا ہے۔ وہ ایک فن رکھتا ہے۔

قدرت کی جانب سے ہوا۔ پانی۔ مٹی۔ آگ۔ درخت۔ پتھر۔ سونا چاندی۔ تانبہ۔ پیتل۔ لوہا۔ وغیرہ وغیرہ عناصر پیدا کرکے ایک معمولی حالت میں انسان کی تفویض کردے یا انسان کے سامنے رکھدیئے گئے اور دوسری طرف انسان کی طبیعت میں وہ ملکہ بھی رکھدیا گیا۔ جسے ملکہ تکوین کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ قدرت کی جانب سے یہہ تمام اشیاء

اور تمام سامان ایک مجہولی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ گو اس مجہولی رنگ میں عرفی صورتیں ہی جلوہ افزا ہیں۔ لیکن مناظر قدرت کی اکثر کیفیتیں مجہولی اور مخفی بھی ہیں۔ اس میں بھید یہہ تہا۔ کہ انسان اپنی قولتوں اور اپنے مذاق اور صحیح جذبات کے مطابق انکشاف حقائق اور انتخاب کیفیات میں حصہ لے اور اوہیں رائگان نہ دے۔ اگر قدرت آنکھیں دیکے مناظر قدرت کی بساط نہ بچھاتی۔ تو یقیناً آنکھوں کی قیمتی اور روشن ہستی کوئی وقعت اور کوئی قیمت نہ رکہتی۔ اور اون کا عدم وجود برابر ہوتا۔

قدرت کی طرف سے جو یہہ بوقلموں بساط بچھائی گئی ہے۔ اوسکی تفصیل باطنی رنگ میں تو کر دی گئی ہے۔ لیکن ظاہر میں وہ تفصیل نہیں کی گئی ہے جو انسان چاہتا۔ یا جسکی انسان کو ضرورت ہے۔ قدرت کے خزانہ میں سے نہ تو کوئی الماری ملتی ہے۔ نہ میز نہ کرسی اور نہ کوئی ٹرنک نہ گھڑی اور نہ ٹرین اور نہ تار نہ موٹر کار نہ گاڑیاں نہ جہاز نہ سکول نہ مدرسے نہ کالج نہ یونیورسٹیاں نہ کارخانے نہ فیکٹریاں نہ بجلی کی مکسوبہ روشنی اور نہ گیس۔ اگر غور سے دیکھو گے۔ تو ان تناسبات یا ان عرضی اشیاء کا قدرتی سامان میں کوئی پتہ نہیں ملتا ہے۔ گویا صفحہ قدرت پر یہہ اشیاء لکھی ہی نہیں ہیں۔ اون کا نام ونشان بھی نہیں۔ پھر یہہ سامان دنیا میں کہاں سے آیا۔ کیا فرشتے سکھا گئے ہیں۔ نہیں حضرت انسان ہی کے اجتہاد قیاس اور مذاق کا یہہ ثمرہ ہیں یہہ کیلے۔ ایک فن۔ اسی طرح زبان کے مختلف پرزے ہی ایک ترتیب اور ایک ترکیب میں لائے جاکر فن لسانی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس سے بوضاحت کلیہ استدلال ہو سکتا ہے۔ کہ جسطرح اور سامان یا ذخایر کائنات سے دیگر ضروریات زندگی کا تہیہ کیا گیا ہے۔ اوسی طرح سامان زبان کا بھی مختلف رنگوں اور مختلف

پیرایوں میں بہیہ کیا گیا ہے۔ خلقت انسان سے اول موجودہ زبانیں نہیں تھیں۔ ورنہ قدرت کے صحیفہ میں اون کا کوئی ذکر پایا جاتا ہے۔ صحیفہ قدرت کے ابتدائی صفحہ یا سرورق پر موٹے قلم سے یہہ فقرہ درج تہا۔

"اشیاء کے نام بتانے اور تعبیر کی کوئی ضرورت نہیں۔

"جو قوتیں اور جو ملکہ تکوین تمہیں دیا گیا ہے۔ یہہ اوس کا کام ہے۔

"اپنے اپنے اجتہاد اور اپنے اپنے قیاس سے اپنے اپنے مذاق اور اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اون سے کام لو۔ اور اونکا تجزیہ اور تفصیل کرو۔ اور ساتہہ ہی تشبیہہ بھی۔

"قدرت تمہیں ایسی تفصیلات اور ایسی تعبیرات اور ایسے تجزیہ کی بابت ایک حرف تک نہیں کہے گی۔

"قدرت کے اس قانون کا یہہ راز ہے۔ کہ قدرت تمہاری قوتوں اور تمہارے جذبات اور ملکات کو رائگان نہیں دینا چاہتی۔ انسان کی ہی یہہ ذہانت تہی۔ کہ اوس نے شروع میں ہی اس اعلان قدرت کا مطلب اور راز سمجھہ لیا۔ اور اپنے کام میں لگ گیا۔ اور ایک بڑی حدتک اس مہم میں تعریف کے ساتہہ کامیاب بہی ہوا۔

دیکھو ایک ذہین اور کارکن کارفہم نجار کس خوبصورتی سے لکڑی کے مختلف پرزے جوڑکر میز۔ کرسی۔ وغیرہ وغیرہ بناتا۔ اور ایک ہوشیار سنار کس دانائی اور کس نزاکت سے سونے اور چاندی کے زیور تیار کرتا۔ اور ایک مبصر مصور کس خوبی اور کس لطافت سے ہاتہہ سے مختلف مناظر کی تصویریں کھینچتا۔ اور ایک فوٹوگرافر کس کمال کے ساتہہ عکس لیتا ہے۔

اسی ملکہ کے ماتحت زبان کے مختلف پرزے ہی جوڑے گئے ہیں۔

یہہ زبان کے مختلف پرزے ہی قدرت ہی کا عطیہ ہیں۔ گو ان کی پیدائش اور
چیزون کی طرح نہیں۔ لیکن ہیں یہہ عطایت قدرت ہی جس ملکۂ تکوین کے
ماتحت ان کا نشو و نما ہوتا ہے۔ وہ قدرت ہی کا عطیہ ہے۔

اختلاف السنہ

چونکہ انسانی ذریات نے ضروریات زندگی کے تحت مختلف ملکون اور
مختلف قطعات ارضی میں جا جا کر بود و باش اختیار کی اور مختلف اقطاع کی
آب وہوا میں اون کی پرورش ہوئی۔ اور مختلف ضرورتیں اونہیں پیش آئیں
اور مختلف سامان قدرت سے اونہیں کام لینا پڑا۔ خیالات اور مذاق میں اختلاف
ہوکر زبانون میں بھی رفتہ رفتہ اختلاف ہوتا گیا۔ ورنہ ابتدائی انسانی زبان صرف
ایک ہی تھی۔ یہہ سب اوسکی شاخیں اور فروعات ہیں۔ اور اختلاف خیالات اور
متضاد مذاق کی وجہ سے اجتہادی رنگ میں ایک ہی شے یا ایک ہی کیفیت کی
مختلف تعبیرات کرنی پڑیں۔ کیسے لطف کی بات ہے۔ کہ مختلف زبان والے
ایک ہی حقیقت اور ایک ہی شے کی اپنے اپنے مذاق اور قیاس کے مطابق
مختلف الفاظ میں تعبیر کرتے ہیں۔ اور اس اختلاف سے بعض وقت مشکلات
میں بھی پڑ جاتے ہیں۔ شے اور حقیقت شے اس تلون پر قہقہہ لگاتی ہے۔ کہ ایک
ذات واحد کی تعبیرات کن کن مختلف رنگون میں کی جاتی ہیں۔ انسانی اجتہادات
اور قیاسات میں کیسا لطیف دیہہ اور تعجب خیز اختلاف ہے۔

زبان اور حسن بیان

جسطرح ایک شاعر یا شاعری کے واسطے جو زبان کی ذہنیات میں سے ہی ہے

لطافت۔ نزاکت۔ اور حسن بیان کی ضرورت ہے۔ اوسی طرح زبان کے واسطے
بھی ان اوصاف کی ضرورت ہے۔ اگر شاعری کی لطافت اور نزاکت چند قواعد
اور حسن انتخاب و حسن بیان شاعر کے تابع ہے۔ تو زبان کی لطافت نزاکت اور حسن
بیان بھی اوس فطرتی حسن اور فطرتی انتخاب کے تابع ہے۔ جو ہر انسان کو طبعاً حاصل
ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے قواعد ادبی بعد میں بنے ہیں۔ شروع
میں اون ہی قواعد فصاحت اور بلاغت پر مدار رہتا۔ جو ہر انسان اپنی طبیعت ہی میں
رکھتا ہے۔ انسان طبعاً حسن پسند اور خوبی کا دلدادہ ہے۔ جو کسی قاعدہ اور کسی
قانون کے تابع ہے۔ اگرچہ کوئی انسان کیسا ہی کثیف خیال ہو۔ پھر بھی اوس کی
طبیعت میں حسن پسندی اور لطافت کا ولولہ پایا جائے گا۔ کسی چھوٹے بچے کو
گود میں لیکر کسی بازار یا باغ میں سے گزرو۔ تم دیکھو گے۔ کہ بچہ فطرتاً اون ہی چیزون
کی طرف کھینچتا چلا جائے گا۔ جن میں کوئی خوبی اور کوئی حسن ہے۔ اون
اشیائ سے نفرت کرے گا۔ اور اون چیزون سے خوف کھائے گا۔ جو بدصورت
کریہہ المنظر اور بدوضع ہون گی۔ پھولون اور تصویرون میں سے چھوٹے بچے اون ہی پھولون اور
اون ہی تصویرون کا انتخاب کریں گے۔ جو دلاویز اور خوب صورت ہیں۔ بدنما
پھولوں اور تصویروں کا اول تو انتخاب ہی نہیں کریں گے۔ اور اگر کوئی ہاتھ میں
لے بھی لے گا۔ تو فوراً ہی پھینک دے گا۔ اسی طرح ہر انسان خواہ خواندہ ہو اور خواہ
ناخواندہ انتخاب کلام میں بھی حسن خوبی اور اثر ہی کا جویان رہتا ہے۔ ایک مقرر ایک
لیکچرار کی تقریر سننے کے واسطے جب ان پڑھ جاہل بھی آجاتے ہیں۔ تو وہ بھی
اچھے تاثرات سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہتے۔ گو وہ قواعد فصاحت و بلاغت
اور استدلالی کلام سے واقف نہیں ہوتے۔ مگر لیکچرار کا طرز موثر اور حسن بیان
اثر کے بغیر نہیں رہتا۔ ہر انسان جب کسی دوسرے سے گفتگو کرتا ہے۔ تو وہ اپنا

پہلا فرض یہہ خیال کرنا ہے۔ کہ اوس کا کلام مؤثر ہو۔ جاہل بھی جب ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہیں۔ تو نرم کلامی اور سخت کلامی میں تمیز کرتے ہیں۔ اثر ہونے پر فوراً اعتراف کرکے داد دیتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک جاہل اور ان پڑھ کی باتیں اور بول چال بہ نسبت ایک ماہر فن اور خواندہ کے زیادہ تر صاف اور مؤثر ہوتی ہے بعض عام گیتوں اور عام اشعار کے اندر ایسا اثر اور ایسا جذب پیدا ہوتا ہے۔ کہ بڑے بڑے کویوں اور شاعروں کے کلام میں بھی ایسا نہیں ہوتا حسن بیان عموماً قواعد کے تابع نہیں ہے۔ یہہ بھی طبعی خاصہ اور طبعی فیضان ہوتا ہے۔ گو ایک ایسا شخص جس نے عرفی مراحل طے کرکے فلسفہ نہیں پڑھا۔ اور وہ فلسفہ کے نام سے علمی رنگ میں واقف ہی نہیں۔ لیکن اگر وہ طبیعت اور دل و دماغ فلسفیانہ رکھتا ہے۔ تو اوس کا کلام اور اوس کا استدلال ضرور فلسفیانہ ہوگا۔ اور ہم اوسے طبعی رنگ میں ایک وہبی فلاسفر کے نام سے نامزد کرتے ہیں۔ شاید غلطی پر نہ ہوں۔

ہماری رائے میں قطع نظر قیود فصاحت اور قواعد بلاغت کے عام طور پر زبانوں میں ایک حسن بیان پایا جاتا ہے۔ اور یہہ حسن انتخاب مدتوں کے تجربہ اور مشق کے بعد خود بہ خود پیدا ہوتا گیا ہے۔ اور اس سے تمام زبانوں کی فصاحت اور بلاغت یا قواعد فصاحت و بلاغت کی بنیاد پڑتی ہے۔ زبانوں کے قواعد فصاحت و بلاغت محتاج ہیں۔ اس حسن بیان اور حسن استدلال کے جو کسی زبان کے عام بولنے والوں میں پایا جاتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کیا ہے۔ اوس حسن بیان اور اوس حسن استدلال کا نچوڑ جو قواعد فصاحت و بلاغت کی تدوین سے پہلے ایک خاص گروہ میں معمول تھے۔

(مخرج زبان اور مخرج

حسن بیان)

زبانوں کو زبان اس واسطے کہا جاتا ہے ۔کہ اوسکے بولنے میں اوس عضو دہان کا استعمال ہوتا ہے ۔کہ جس کا نام زبان ہے ۔اس عضو دہانی کے بغیر چونکہ انسان بول نہیں سکتا ۔اور یہی ایک آلہ طلاقت کلام کے واسطے قدرت کی طرف سے مخصوص ہے ۔اسواسطے مجازاً فارسی اور اردو میں تکلم وطلاقت کلام کو زبان کہا جاتا ہے ۔اگرچہ عضو زبان طلاقت کا ایک آلہ اور ذریعہ ہے ۔لیکن اوسے مجازاً مخرج کلام و مصدر زبان کہا جاسکتا ہے ۔دراصل مخرج زبان وہی ملکہ تکوین ہے ۔جو قدرت کی جانب سے انسان کو عطا ہوچکا ہے ۔ہمارے اندرونہ ہی سے حروف نکلتے ہیں ۔اور اندرونہ ہی سے الفاظ ۔فقرات ۔اور جملے بھی اطلاق پاتے ہیں ۔یہہ عضو زبان صرف اون کے اظہار کی مشین یا ذریعہ ہے ۔جس مخزن میں سے یہہ الفاظ ۔یہہ فقرات نکلتے ہیں ۔وہ ایک ایسا مخزن عامرہ ہے ۔کہ جس میں آج تک کوئی کمی نہیں آئی ۔دن بدن اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے ۔اور انسان باوجود اس صرف کے بھی یہہ نہیں معلوم کرسکتا ۔کہ یہہ خزانہ کہاں سے آتا ۔اور کس طرح اس میں کمی نہیں آتی ۔جب مخرج زبان یہہ عضو زبان نہیں ۔تو یہہ بھی تسلیم کرلیا جائے گا ۔کہ

حسن بیان یا حسن کلام کا مخرج اور ذریعہ بھی یہہ عضو زبان نہیں ہے ۔بلکہ وہی ملکہ تکوین اور قوت انتخاب طبعی ہے ۔جو ہر انسان اپنے اپنے بشری حدود کے

مطابق اپنے اندر رہنہ ہیں رکھتا ہے ۔ بے شک بعد میں بہت سے قواعد اور روابط انسان کی جانب سے حسن بیان اور حسن کلام کے متعلق بنائے گئے ہیں ۔ لیکن ان کی بنیاد وہی اوس طبعی ملکہ کا ظہور ہے ۔ جو انسان کی طینت میں بھی مودعہ ہے ۔ جب انسان منہ سے کوئی بات نکالتا ۔ اور کوئی کلام کرتا ہے ۔ تو وہ خود بخود وہی اوس ملکہ انتخاب کے ذریعہ سے یہہ جانچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ کہ ان الفاظ اور ان فقرات میں سے کون سے لفظ اور کون سے فقرہ جامع ۔ موزون اور موثر ہے ۔ بعض طبائع ایک خصوصیت سے یہہ انتخابی قوت استعمال میں لاتی ہیں ۔ اور بعض اس طرف توجیہ نہیں کرتیں ۔ جو طبائع اس طرف لگ جاتی ہیں ۔ اون کی بدولت ہی یہہ قواعد فصاحت اور قوانین بلاغت وجود پذیر ہوئے ہیں ۔ ورنہ حسن بیان اور حسن کلام کا مواد انسان کی اپنی طبیعت میں ہی پایا جاتا ہے ۔

یہہ انتخاب موقوف ہے ۔ مضمون کی عمدگی ۔ برجستگی اور موثرانہ کیفیت پر اور مضمون کی موزونیت اور غیر موزونیت کے انتخاب پر تعریف سے انسان خوش ہوتا ۔ اور مذمت سے کھڑ ستا ہے ۔ یہہ دلیل ہے ۔ اسبابت کی کہ

انسان عمدہ الفاظ اور موثر فقرات سے متاثر ہوتا ۔ اور خراب الفاظ اور برے فقرات سے کھڑتا اور گھبراتا ہے ۔ چونکہ انسان کی طبیعت قدرتاً ہی ایسی واقعہ ہوئی ہے ۔ اسواسطے لازماً اوسے اون قواعد طبعی کو ترتیب دینا پڑا ۔ جو انتخاب مضامین اور حسن بیان و حسن کلام کے واسطے ایک قانونی اور ایک ادبی ضابطہ کا کلام دیں ۔ ایسی کوشش ہی ایک طبعی کوشش ہوگی ۔ اور کہا جائے گا ۔

مخرج حسن بیان اور حسن کلام ایک طبعی میلان کا خواستہ اور طبعی میلان کا اثر ہے ۔ اور تمام قواعد فصاحت و بلاغت اوس کا عکس اور ظل ہیں

(مخرج زبان کی بابت) ١٦ اگست ۲۲ء

(ایک دوسرے رنگ میں)

(بحث)

پہلے یہہ بحث ہونی چاہئے۔ کہ زبان کا نشو ونما کن دیگر ذرائع سے ہوا ہے۔ سب سے پہلا ذریعہ زبان کا آواز یا آوازیں ہیں۔ اور آوازیا آوازون کا ذریعہ ہوا یا ہوائیں۔ اگر آواز یا آوازین نہ ہوتیں۔ تو ہوا کی ہستی بھی مفید ثابت نہ ہوتی بولی یا زبان نے آوازون اور ہواہی کی بدولت یہہ روپ دھارا۔ اور ہستی پکڑی ہے۔ آوازون کی ہستی میں ناطقہ اور طلاقت ہے۔ اگر ہوا نہ ہوتی۔ تو آواز کی ہستی بھی یون ہستی پذیر نہ ہوتی۔ اگر ناطقہ نہ ہوتا۔ تو آواز نہ ہوتی۔ اور اگر طلاقت نہ ہوتی۔ تو آواز کا عدم وجود برابر ہوتا۔ طلاقت سے مراد علمی رنگ میں صرف انسانی بول چال ہی نہیں۔ بلکہ ہر قسم کی طلاقت جو دوسری ہستیان بھی اپنے اپنے رنگ رکھتی ہیں۔ ہر چیز چاہے بے جان ہو۔ اور چاہے جاندار برنگ خود بول رہی ہے۔ یا یہہ کہ ہر شئے اپنے اپنے رنگ میں آواز دے رہی ہے۔ آوازون کے یا تو کچھ معانی ہوتے ہیں۔ اور یا کچھہ اشارہ اور ایک مطلب خیز تصادم اور تقارب ہر آواز کا اپنے اپنے پیرایہ میں کچھہ نہ کچھہ تلفظ کیا جاسکتا ہے۔ جاندارون کے بولنے میں تو کوئی شک کیا ہی نہیں جاسکتا۔ دوسرے اشیاء اور دوسرے عناصر مادی بھی اپنے

اپنے رنگ میں آواز دے رہے ہیں۔

دیکھو جب لوہے پر لوہا یا کوئی اور شے ماری جاتی ہے۔ تو اوس میں سے بہی ایک آواز نکلتی ہے۔ آواز کے سنتے ہی اگر تم غور کروگے۔ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ ایسی آواز بہی کوئی نہ کوئی تلفظ رکھتی ہے۔ اور وہ بھی چند حروف اور چند لفظون سے مرکب ہے۔ تمہیں یہہ بہی غور کرنے پر معلوم ہو جائے گی۔ کہ وہ کچہہ نہ کچہہ اثر بہی رکہتی ہے۔ کیا جب کبھی بجلی کوندتی اور بارش ہوتی ہے۔ تو ہم اندر بیٹھے ہوئے بہی یہہ نہیں سمجہہ جاتے۔ کہ بجلی کوندتی اور بارش ہوتی ہے۔

کیا ایسی آوازون کے سمجہنے کے واسطے تمہیں کسی ترجمان کی ضرورت پڑتی ہے۔ بانسری جب بجتی ہے۔ تو تمہارے دل و دماغ پر ایک عجیب قسم کا اثر ہوتا ہے۔ اوسکی آواز میں ایک جذب ہے۔ باجہ بولتا چالتا تو نہیں۔ پہر تم اوسکے سر تان پر کیون لٹو ہو۔ اور کیون وہ تمہیں بہاتا ہے۔ کیا اوسکی موثر صداؤن نے تمہیں اپنا نہیں کرلیا۔ دروازہ جب کوئی کہٹکہٹاتا ہے۔ تو کیا اندر ہی بیٹھے بیٹھے یہہ نہیں سمجہہ جاتے۔ کہ کوئی باہر ہے۔ کوٹھے پر کسی کے پھرنے۔ اور چلنے سے تم رات کو سوتے سوتے تاڑ جاتے ہو۔ کہ کوئی چھت پر پھر رہا ہے۔ حالانکہ تمہارے کانون میں کسی کی آواز تک نہیں پہنچی۔ گھڑی کی ٹک ٹک تمہیں ایک زندہ آواز سے ہی زیادہ تر یقین دلاتی ہے۔ تم اسکی رفتار اور آواز کے مقابلہ میں کسی اور کی بات پر یقین نہیں کرتے۔

دیکھو یہہ چیزین اگرچہ ناطق نہیں ہیں۔ مگر ان کا اثر ناطق ہستیون کی طرح ہوتا ہے۔ پس اس سوال کے جواب میں کہ زبان کا مخرج کیا ہے۔ یہہ کہا جائے گا۔ کہ اوسکا مخرج ہر ایک قسم کی آواز ہے۔ چاہے انسان کے منہ سے نکلے اور چاہے کسی اور جسم کے تصادم اور تضارب و تقارب سے بالخصوص

اون حرکات اور ان آوازون اور اون الفاظ پر اس کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ جو
انسان کے منہ سے نکلتے ہیں۔ اور جن کے معانی ہی ہون۔ گو الفاظ بے معنی بھی
زبان کی تعریف میں بلحاظ تلفظ کے آسکتے ہیں۔ مگر اصطلاحی پیرایہ میں
زبان وہی ہے۔ جو بامعنے ہو۔

اگرچہ حضرت انسان ہی کی بدولت زبان کی بنیاد پڑی ہے۔ مگر
دوسری کائنات کی بدولت بھی اس میں بہت کچھہ اضافہ ہوا ہے۔ اور ہماری
ہستی ایک بڑی حد تک اون دیگر ہستیون کی ہی محتاج ہے۔ جو ہماری
ہمسایہ ہیں غور کرنے پر تمہیں بوجوہ معلوم ہو سکے گا۔ کہ
دیگر ہستیون اور دیگر کائنات کی بدولت ہی ہماری زبان کسقدر مالا
مال ہو رہی ہے۔ اور اوس میں کسقدر اضافہ ہو چکا ہے۔

۷۸۶

نظم الفاظ

۱۲ اگست ۱۶ ء

ہر لفظ بجائے خود ایک مصرع یا ایک بیت ہے۔ اگر ایک مصرعہ
اور ایک بیت میں لطافت نظم اور خوبی ہائے شعر پائی جاتی ہیں۔ تو ایک
ایک لفظ میں ہی تقریباً وہی لطائف اور وہی خوبیان پائی جاتی ہیں۔ جب
سمندر میں عکس آفتاب کا ہوتا ہے۔ تو پھیلاؤ اور نظارہ وسعت سمندر
کے مطابق ہوگا۔ لیکن ایک قطرہ میں بھی آفتاب منعکس ہوتا ہے۔ انعکاس
میں کوئی فرق نہیں۔ صرف ظرف یا پیمانہ میں فرق ہوگا۔

ہم مصرعہ اور بیت اسواسطے ایک آسانی سے سمجھہ جاتے ہیں۔ کہ اوسے ہم نثر سے جدا خیال کرتے ہیں۔ اور بالخصوص اوسکے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن لفظی نظمون کے سمجھنے کی ہم کوشش نہیں کرتے۔ غالبًا اوسکی وجوہ حسب ذیل ہوسکتی ہیں۔

(الف) لفظی نظمیں ہمارے ساتھہ رفتہ رفتہ اسقدر مختلطہ ہوگئی ہیں۔ کہ ہم اون کے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ اور یہہ سمجھہ لیا گیا ہے کہ ان کی عمدگیان اور خوبیان بس وہی ہیں۔ جو کلام میں آجاتی ہیں۔

(ج) یا ہم اون نکات کے سمجھنے سے عاری ہیں۔ جو لفظی نظمون میں پائے جاتے ہیں۔

(د) یا ہمیں اسطرف توجیہ ہی نہیں ہوتی۔

شعر کے سمجھنے اور سننے کیواسطے ہم اسواسطے مستعد رہتے ہیں۔ کہ وہ کبھی کبھی سننے میں آتے ہیں۔ اور الفاظ ہم روز سنتے اور سناتے ہیں۔ ورنہ جو اشعار اور ابیات میں لطافت حسن اثر اور جذب ہے۔ وہی الفاظ کی نظمون میں بھی ہے۔ کیا آپ روز دیکھتے نہیں کہ بعض وقت ایک ایک لفظ کسطرح سامعین کے دل و دماغ پر اثر کرجاتا ہے۔ اور کس طرح ایک ہی لفظ ایک طویل تشریح اور تنقید کلخواہان ہوتا ہے۔ اگر ہم اشعار کے سمجھنے اور تنقید و تشریح سے بعض وقت محتاج ہوتے ہیں۔ اور ہمین مختلف پہلو اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ تو اسی طرح تفہیم الفاظ۔ تنقید الفاظ۔ اور تشریح الفاظ میں بھی دقت ہوتی ہے نظم شاعر کا کمال یہہ ہے۔ کہ کسی مضمون کے انتخاب کے ساتھہ ہی موزون اور جامع الفاظ کا ہی انتخاب کرے۔ جو مطلب خیز بھی ہو جسطرح بعض اشعار ایک دوسرے شعر سے مل کر معنے دیتے ہیں۔ اسطرح الفاظ بھی ایسے مختصر اشعار ہیں۔

کہ جب تک اون کا اکثر حصہ دوسرے الفاظ سے نہ ملے تب تک اون کا مطلب واضح نہیں ہوتا سب الفاظ کی یہ صورت نہیں بہت سے ایسے الفاظ بھی ہیں. کہ اون سے بذاتہ ہی مطلب نکل سکتا ہے۔ اور وہ بذاتہ تبلیغ کے لئے کافی اور جامع ہوتے ہیں۔ جب ایک لفظ دوسرے لفظوں سے جوڑ کر مطلب کی وضاحت یا تکمیل کرتے ہیں۔ تو گویا شعروں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں یا ریزوں سے ایک مطلب کی وضاحت کرتے ہیں جسطرح شعروں میں الفاظ کی بندش معانی کی خوبی اور جامعیت کا خیال رہتا ہے. اسی طرح لفظوں کے جوڑنے میں ہی خیال رہتا ہے۔

دیکھو شعر بھی تو اوسوقت تک نہیں بن سکتا جب تک چند الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے نہ جاویں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ نثر میں الفاظ کے جوڑنے سے ہم کوئی عرفی بحر نہیں پیدا کرتے۔ اور شعر کہنے میں ہم چند الفاظ کسی نہ کسی بحر کے تحت جوڑ دیتے ہیں. نثر اور نظم میں ایک موٹا فرق یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ ہم نثر کسی بحر اور قافیہ کے تحت نہیں رکھتے۔ اور شعر میں یہ خصوصیت رکھی جاتی ہے۔ ورنہ بلحاظ ترکیب الفاظ نثر بھی ایک شاعری ہی ہوتی ہے۔ یہ بھی فرق ہوتا ہے۔ کہ شعر میں نثر سے تلخیص زیادہ ہوتی ہے۔ اور نثر میں ایسی تلخیص سے کام نہیں لیا جاتا۔ یوں نظم اور نثر دونوں حسن ترکیب اور فن بندش الفاظ کے محتاج ہیں۔ دونوں میں اگر فن ترکیب اور فن بندش اور موزونیت الفاظ و موزونیت معانی نہ ہو۔ تو وہ لطف جو نظم کو ایک نظم اور نثر کو ایک نثر بناتا ہے۔ پیدا نہیں ہوسکتا۔ بعض کے خیال میں چونکہ نظم میں چند قالبوں اور چند پیمانوں کے مطابق ترکیب الفاظ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نثر میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسواسطے نثر کا عمدگی کے ساتھ لکھنا اور بنانا بہ نسبت نظم کے زیادہ تر مشکل ہے۔ ردیف اور قافیہ نثر میں بھی ہوتا ہے لیکن اسکا کثرت کے ساتھ پابند رہنا نثر کو ذرا بے لطف بنا دیتا ہے۔ نظم پابند اور مقید بحور اور قوافی ہے۔ نثر آزاد اور کشادہ ہے۔ نثر کی لطافت زیادہ تر اوسی

رنگ میں متصور ہے۔ جبکہ وہ اپنے ہی قواعد کے ماتحت لکھی جاتی ہے شاعری کا رنگ اس پر غالب آنا اچھا نہیں۔

گو نثر آزاد ہے۔ اور شاعری مقید اور پابند مگر شاعری کی تقید اور پابندی ایک شاعر کے واسطے ایک قانون اور ایک ضابطہ ہے۔ جو اسے بے راہ نہیں ہونے دیتا۔ جب کبھی بے راہ ہو۔ تو وہ جلد پکڑا جاتا ہے۔ نثر میں ایک ایسی آزادی ہے۔ جو اسے آزاد تو رکھتی ہے۔ مگر اس آزادی میں خود کو روک روک کر چلنا ایک مشق اور ایک فراست چاہتا ہے۔ اور ہر نثار اس میں خوبی اور عمدگی کے ساتھ بازی نہیں لے جاسکتا۔

۴۸۶

تلفظ سے مراد کیا ہے

تلفظ سے صرف یہی مراد نہیں۔ کہ وہ کوئی معنے ہی رکھتا ہو۔ کیونکہ بہت سے ایسے الفاظ بھی انسان بولتا۔ یا بول سکتا ہے۔ کہ جن کے معانی کچھ نہیں ہوئے تلفظ سے مراد یہ ہے۔ کہ وہ یا تو انسان کے منہ اور زبان سے نکلے۔ اور یا کسی تصادم اور تضارب اور تقارب کا اثر ہو۔

اگرچہ صرف و نحو میں تلفظ سے وہی صورت اور وہی کلمات مراد ہیں۔ جو انسان کے منہ سے خارج ہوں۔ لیکن تلفظ سے وہ تلفظ بھی۔۔۔۔ مراد ہے۔ جو دوسری اشیاء سے وابستہ ہے۔ یہ ایک مجازی اطلاق ہے۔ اس دوسری قسم کا نام بالفاظ دیگر صوت ہوگا۔ یا تلفظ صوتی۔ اور اس صورت میں انسانی تلفظ کا نام

تلفظ معنوی یا تلفظ کلامی کہا جائے گا۔

تلفظ کی مندرجہ ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں۔

" تلفظ معنوی یا تلفظ کلامی۔

" تلفظ صوتی۔

" تلفظ تخیلی۔

" تلفظ ترقیمی۔

" تلفظ اشاریہ۔

" تلفظ کنایہ۔

رفع وہم کیلئے ہم پھر کہنا چاہتے ہیں۔ کہ حقیقی معانی میں تو صرف ایک ہی تلفظ کلامی ہے۔ دوسری صورتوں پر اطلاق تلفظ صرف بطور ایک مجاز کے ہے۔ ورنہ اونہیں بالفاظ دیگر خیال صوت۔ اشارہ۔ کنایہ کہنا زیادہ ترموزون ہوگا۔ تلفظ کلامی کی تشریح اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اس تلفظ سے وہی تلفظ مراد ہے۔ جس سے ہر روز اور ہر گھڑی اور ہر لمحہ انسان کام لیتا ہے۔

اس تلفظ کی دو صورتیں ہیں۔

ایک وہ جو منہ اور حلقوم کے اندر رہتا ہے۔

دوسرے یہہ کہ منہ سے جو آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ اور جو ایک ترکیب پاکر نکلتی ہیں۔ دونوں صورتوں میں ان تلفظات کو انسان محسوس کرتا ہے۔ جب کوئی کلمہ یا کوئی لفظ منہ کے اندر ہی رہتا ہے۔ تو اوس حالت میں بھی گویا وہ ذہن ہی میں ہوتا ہے۔ گو کہ ایک حد تک منہ اور زبان بھی اوس سے آشنا ہو جاتی ہے۔

دوسرے یہ کہ جب وہ منہ اور زبان سے نکالا جاتا ہے۔ تو ہم اوس آواز کو خود بھی سنتے اور دوسروں کو بھی اوس سے آگاہ کرتے ہیں۔ چونکہ

تلفظ کا ذریعہ ہوتی ہے - دیکھو جب ہم لفظ (مہربان) بولتے ہیں - تو خود ہمیں
بھی یہہ لفظ سنائی دیتا ہے - اور دوسرے بھی سنتے ہیں - اگر ہم خواندہ ہیں -
تو اوس کی ترقیمی شکل بھی ہمارے مشاہدہ میں آجائے گی - اور اگر ہم ناخواندہ
ہیں - تو اوس کی آواز ہی ایک خاص پیرایہ میں متشکل ہوکر ہمیں اپنا احساس
کراتی ہے - اور ہم سمجھہ جاتے ہیں - کہ ہمارے منہ سے یہہ لفظ یا یہ کلمہ نکلا ہی
اب آپ سمجھہ گئے ہوں گے - کہ تلفظ سے مراد کیا ہے - یہہ نکتہ سمجھ
کر آپ کہہ سکتے ہیں - کہ زبان کس قسم کے "تلفظ کے" تابع ہے - اور کن کن ذرائع
سے زبان ترکیب پاتی ہے - اور حقیقی و مجازی رنگ میں "تلفظ کیا ہے -

---

۴۸۶

ہر آواز متلفظ ہوتی ہے

جس قدر مختلف ذرائع تضاربات تقاربات اور تصادمات سے آوازیں
نکلتی ہیں - خواہ اون کا مخرج زبان ہو - اور خواہ کوئی اور چیز وہ سب کی سب
متلفظ ہوتی ہیں - یا وہ کسی نہ کسی قالب یا ڈھانچہ لفظی میں منتقل ہوکر وجود پذیر
ہوتی ہیں - آوازوں کی دو قسمیں ہیں -

(الف) مفرد -

(ب) مرکب -

ہم بعض دفعہ اس رائے کے موید ہی ہوتے ہیں - کہ کوئی آواز مفرد ہوتی ہی
نہیں - جو آواز نکلتی اور صادر ہوتی ہے - وہ ہمیشہ مرکب ہی ہوتی ہے - دیکھو جب

کوئی بچہ باتیں کرتا اور غوں غوں کرتا ہو۔ تو اوسکی کوئی آواز ہی مفرد سنائی نہیں دیتی۔

اسیطرح جب کسی اور شئے سے آواز نکلتی ہے۔ تو وہ بھی مرکب ہی ہوتی ہے۔

اور بعض دفعہ یہ خیال بھی معقول معلوم ہوتا ہے۔ کہ آوازیں مفرد بھی ہوتی ہیں مثلاً جب انسان۔ آا۔ گا۔ وا۔ کہتا ہے۔ تو یہ آوازیں مفرد شمار ہونگی۔ گو جب اونکا صحیح تلفظ کیا جائے گا تو اوسوقت مرکب معلوم ہونگی۔ مگر دراصل متفردات ہی سے سمجھی جاتی ہیں۔ ایک یہ بھی خیال ہے کہ کوئی آواز بصورت آواز۔ ہونے کے مفرد نہیں ہوتی ہمیشہ کوئی نہ کوئی ترکیب رکھتی ہے۔ کوئی سی آواز لے لو مرکب ہی ہوگی۔ انسان پر ہی کیا موقوف ہے۔ اور بھی کسی جاندار یا بے جان کی آواز مفرد نہیں نکلے گی۔

دیکھو جب ایک لکڑی یا اینٹ پر دوسری لکڑی یا دوسری اینٹ ماری جاتی ہے۔ تو مرکب آواز نکلتی ہے۔ آواز خواہ مفرد ہو۔ خواہ مرکب متلفظ ضرور ہوتی ہے۔ مرکب کے معنے یا مطلب اس بحث میں یہ نہیں۔ کہ اگر ایسی آواز برنگ صوتیہ لکھی جائے۔ تو وہ ایک حرف سے نہیں لکھی جائیگی۔ بلکہ چند حروف سے دوسرے معنوں میں مفرد اور مرکب کی بحث ہماری اس بحث سے خارج ہے۔ ان اعتبارات سے تو آوازیں مفرد بھی ہوتی ہیں۔ اور مرکب بھی۔ اس بحث سے منشا صرف یہہ ہے۔ کہ ہر آواز متلفظ ہوتی ہے۔ یہہ نہیں کہ اوس کا تلفظ نہ ہو سکے۔

یہاں تلفظ سے یہ مراد ہوگی۔ کہ وہ چند حروف سے مرکب ہو۔ ایک حرف بھی متلفظ ہوتا ہے۔ کیونکہ جب ہم الف اور جیم کہتے ہیں۔ تو اون کا کوئی نہ کوئی تلفظ ہوتا ہے۔ اور الف اور جیم کے بولنے میں تلفظ مرکب ہوجاتا ہے۔ کیونکہ ہم (الف) اور (ج) کو جیم کی شکل میں منہ سے نکالتے ہیں۔ اگرچہ یہہ حروف مفردات میں سے ہیں۔ مگر بولنے میں ان کا تلفظ مرکب ہوتا ہے۔ گو کہ تحریر میں بہ صورت (ا) اور (ج) اونہیں بہ صورت مفرد یا بہ صورت خود لکھا جاوے۔ یہاں ہماری

بحث تحریر سے نہیں ہے۔ بلکہ نطق اور... بولنے سے۔

اصل سوال گویا یہہ تھا۔کہ بولنے کی صورت میں کوئی آواز تلفظ سے باہر نہیں ہوتی۔ اور کوئی تلفظ ترکیب حرفی سے خالی نہیں ہوتا۔ہر تلفظ میں چند حروف ہوں گے۔ اور اون ہی سے ترکیب اور تالیف تلفظ کی شکل اور صورت پیدا ہوگی۔

۷۸۶ ۱۵ اگست ۱۶ء

الفاظ باعتبار قبولیت و کراہت

چونکہ الفاظ کا بنانے والا اور ترتیب دہندہ انسان ہی ہے۔ اور اوسکے ملکات تکوین کے ماتحت الفاظ ترتیب پانے اور وضع ہوتے ہیں۔اس واسطے جس طرح اوسکے جذبات کا عمل باعتبار حرمت اور ذلت کے جداگانہ ہوتے ویسے ہی بعض الفاظ بھی ہیں۔ یا یہ کہ انسان کی علوی یا سفلی ملکات بھی قوتوں کے ماتحت الفاظ بھی بنتے بنائے جاتے ہیں۔ جس طرح انسان کی طبیعت میں نرمی۔ غصہ۔ بردباری۔ استقلال۔ درگذر۔ جلدبازی کراہت۔ نفرت۔ شفقت۔ مرحمت۔ محبت۔ بغض و حسد رشک و حقد۔ نیکی۔ برائی۔ غیظ و غضب وغیرہ وغیرہ جذبات ہیں اسی نمونے پر بعض الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ الفاظ کا واضع ترتیب دہندہ اپنے ملکات تکوینی کے تحت صرف انسان ہی ہے۔

اگر بعض الفاظ کمزور ہیں۔ تو بعض زور آور بھی ہیں۔ اگر بعض نرم اور ملائم ہیں۔ تو بعض سخت اور درشت بھی ہیں۔ اگر بعض میں مرحمت اور نفاست پائی جاتی ہے۔ تو بعض میں سختی اور کدورت بھی ہوتی ہے۔ الفاظ انسان کی قوتوں انسان کے جذبات اور انسان کے خیالات کے ترجمان ہیں۔ جو کچھہ اوسکے ذہن میں اور اوسکی طبیعت میں ہوتا ہے۔ الفاظ اوسکی ترجمانی کرتے ہیں۔ مہربانی اور رحم کے وقت اوسکے مطابق ترجمانی کی جاتی ہے سختی اور نفرت کے وقت بھی ویسے ہی اظہار ہوتا ہے۔ دوسروں پر بھی اون کا ویسے ہی اثر ہوتا ہے۔ بعض الفاظ کے منہ سے نکلتے ہی انسان خوش ہو جاتا اور اطمینان ظاہر کرتا ہے۔ خلاف اوسکے بعض الفاظ کے اطلاق پاتے ہی انسان آگ بگولا ہو جاتا ہے

ہر واقعہ ہر خیال جو انسان کی طبیعت میں پیدا ہوتا اور توجّہ پاتا ہے۔ الفاظ اونہیں اپنے رنگ میں ڈھال لینے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ اور اوسی رنگ میں دوسروں پر بھی مؤثر ہوتے ہیں۔ جسقدر طبیعت میں ادعا اور تحکم ہوتا ہے۔ اوسی قدر بعض الفاظ میں بھی ہوتا ہے ایسے الفاظ گویا طبعی خیالات کا عکس لے کر اپنے رنگ میں اون کا اظہار کرتے ہیں۔ زور الفاظ میں نہیں ہوتا۔ بلکہ زور طبائع میں ہوتا ہے۔ اور چونکہ الفاظ انسانی طبائع کے تحت گرم و سرد پیار ہی سے بن چکے ہوتے ہیں۔ اسواسطے ضرورت کے وقت ایسے الفاظ کا ذخیرہ مل جاتا ہے باوجود ایسے ذخیرہ الفاظ ملنے کے بھی طبیعت کی جدت زور زد۔ نرمی۔ نسبت۔ استقلال عائل ہوتی ہے اگر کوئی طبیعت نرم اور بزدل ہے۔ تو زور آور سے زور آور الفاظ بھی وہ اثر نہیں ڈال سکتے۔ جو ایک زبردست با اثر طبیعت کے اطلاق سے اثر پیدا کر سکتے ہیں

بعض وقت لوگ بعض بولنے والوں بعض سپیکروں کی طلاقت لسانی اور زور تقریر کے معترف ہو کر الفاظ کی خوبی کو مدنظر رکھتے ہوئے نشست الفاظ بندش فقرات کی تعریف سے باز نہیں رہ سکتے۔ یہ بالکل درست ہے لیکن اگر طبیعت میں ایسے مقرر اور سپیکر کے زور نہ ہوتا۔ تو الفاظ کیا کچھہ کر سکتے۔

گندے الفاظ اور گالیوں میں بڑا زور اور بڑی اشتعالک ہوتی ہے۔لیکن ایسے الفاظ بھی طبیعت کے زور ہی سے دوسرے پر مؤثر ہوتے ہیں۔ایک کمزور طبیعت کا گالی دینا بھی کمزور ہی رکھتا ہے۔اور ایک زور اور طبیعت کے منہ سے گالی نکلتا۔جو شدت رکھتا اور جو زہر پھیلاتا ہے۔وہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

چونکہ الفاظ طبائع ہی سے نکلتے ہیں۔اس واسطے بولنے اور استعمال کے وقت بھی اون ہی سے زیادہ وابستگی اور تعلق رہتا ہے۔بڑے بڑے جلسوں میں ہمیشہ اون ہی لوگوں کو ایڈرس وغیرہ پڑھنے کے واسطے منتخب کرتے ہیں۔جن کی طبائع میں زور اور بیان میں برجستگی اور علو ہو۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ۔

بعض لوگ ایک نفیس مضمون بھی اس طرح پڑھتے ہیں۔کہ اوس کا اثر کچھ بہت اچھا نہیں پڑتا۔لیکن بعض لوگوں کے پڑھنے میں کچھ اور ہی اثر اور جذب ہوتا ہے اس سے ثابت ہے۔کہ الفاظ ایک حد تک طبائع کے تاثرات سے ماثور رہتے ہیں۔

۴۸۶

معانی الفاظ

یہہ سوال بھی خالی از دل چسپی نہیں کہ۔

،،معانی کا استدلال بعد از وضع الفاظ ہوا ہے۔

،،یا معانی مقدم رکھ کر بعد میں وضع الفاظ کی نوبت آئی ہے۔

،،کیا الفاظ اپنے معانی آپ ہی بتاتے ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔کہ

الفاظ اوس وقت بنتے یا بنائے جاتے ہیں۔جب خیال میں یا تو کوئی مفہوم

اور صورت مرتسم ہوئی - اور یا جبکہ سامنے کوئی منظر مجہول الکیفیت آگیا -
ان دونوں صورتوں کے سوا کوئی اور صورت توضیع الفاظ کی متصور نہیں جب ہمارے
سامنے قدرت کے مختلف مناظر رفتہ رفتہ پیش ہوئے۔ تو ہم نے کسی نہ کسی
رنگ میں اونکی تعبیر کی یا ایسی تعبیر کی ضرو ت کا احساس ہوا- اوس وقت ہمارے
دل و دماغ میں جو کچھہ گزرا وہ ہماری زبان اور منہ سے نکلا- یا جن طریقوں سے ہم نے کوئی
تاویل اور تعبیر کی وہ ہ نہ کوئی اشارہ کنایہ اور لفظ تہا- ایک طرف لفظ بنایا گیا- اور
دوسری طرف کوئی صورت اور کوئی منظر پیش نظر تہا- دونوں صورتوں کے ملانے
سے ایک تیسری صورت ذہن نشین ہوگی اور اوس سے ایک مفہوم قرار پا یا گیا- اس
سے ہم یہ سوچ سکتے ہیں- کہ لفظ بنانے یا اشارہ اور کنایہ سے پہلے کسی نہ کسی صورت
یا کسی نہ کسی منظر یا مدعا کا پیش نظر پیش سمع یا زیر بحث ہونا لازمی ہے- لفظ
اُسی وقت بنایا جاتا ہے اور اشارہ اوس حالت میں ہو سکتا ہے- کہ جب کوئی نہ کوئی
بات منظر- واقعہ اور کیفیت پیش نظر یا پیش سمع ہو مثلاً جب انسان کی
نگاہوں سے پہلے پہل پانی گزرا اور پینا ہی چاہا- تو اندرونہ میں سے اوس وقت کوئی
نہ کوئی لفظ نکلا ہوگا- یا کسی نہ کسی قسم کا اشارہ کیا ہوگا- جو لفظ اوس وقت انسان
کے منہ سے نکلا یا جو اشارہ کیا گیا- وہ اوس چیز کے بعد صادر ہو یا جیسے پانی کی صورت
میں دیکھا گیا- پانی پہلے سے موجود تہا- اور لفظ یا اشارہ کی نوبت بعد میں آئی- چونکہ
انسان کی ڈکشنری میں جس کا اوس وقت وجود ہی نہیں تہا- کوئی لفظ یا کوئی
تعبیری طریقہ موجود نہیں تہا- اس واسطے جو کچھہ انسان کے دل میں اوس وقت آیا
وہی منہ اور زبان سے نکل گیا- کسی نے کچھہ سوچا اور کسی نے کچھہ یہاں تک کہ پانی کے
کئی ایک نام وضع ہوگئے کسی نے پانی کہا- کسی نے ما- کسی نے آب- اور کسی نے
واٹر- انسان کی نظر سے گزرا کہ ایک اس قسم کا ہیولیٰ ہی ہے- جو دوپہر کو کھلتا ہے

اوسکی ڈکشنری میں اوس کا کوئی نام نہیں تھا۔ اوس نے یہ کیفیت دیکھ کر اوس کا نام گل دوپہر رکھدیا۔ انسان نے دیکھا۔ کہ پھول شروع شروع میں بندرہ کر شگفتہ ہوتا ہے۔ اوس نے اوس حالت کا نام غنچہ رکھدیا۔ اور جب وہ کھل گیا۔ تو اوسے پھول کہہ کر پکارا

کائنات اور اجزائے کائنات کے عکس ہی سے انسانی دل ودماغ میں تسمیہ اشیاء یا تعبیر اشیاء کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ یا جبکہ کوئی واقعہ کوئی کیفیت کوئی مدعا ذہن نشین اور متوجہ ہو ان دونوں صورتوں میں الفاظ بنائے جانے کی نوبت آتی ہے۔ اس سے یہی ثابت ہے۔ کہ پہلے سے مناظر اور کیفیات مختلفہ اور اشیاء کا موجود ہونا لازمی ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے الفاظ وضع ہو کر بعد میں اونکی تخصیص معانی اور مفہوم خاص کرنے کی نوبت آئے۔ کوئی سے لفظ لے لو۔ اوسکی پہلی کیفیت جسکی ہستی سے اوسکی ہستی نکلتی ہے کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہوگی۔ یا بہ منظر قدرت اوسکا کوئی نہ کوئی نشان پایا جاسکے گا۔ اور یا تخیل میں اوسکی کوئی نہ کوئی کسی نہ کسی رنگ میں صورت صورت پذیر ہوگی۔ ان دونوں صورتوں کے سوائے اور کوئی صورت ذہن میں نہیں آتی ہے۔ ایک لفظ اور ایک تعبیر بھی ایسی نہیں نکلے گی۔ جو بغیر تشخیص یا تعبیر پیش آئے کسی مدعا کیفیت منظر۔ شے اور خیال کے بنائی گئی۔ یا کی گئی ہو جب کوئی شخص یہ کہتا ہے۔ کہ

،، تمھیں یہ کام کرنا چاہیے۔

،، تمھیں یہ بات ماننی پڑے گی۔

،، تمہارے واسطے یہی بہتر ہے۔

تو وہ کیفیات اور وہ واقعات جن کا ان فقرات میں ذکر کیا جاتا ہے۔ قبل از بیان اور اطلاق ان فقرات کے موجود ہوتے ہیں۔ اور اون کی ہستی ہی ان فقرات کی ہستی کا موجب ہوتی ہے۔

حکم دینے سے پہلے حاکم کے دل ودماغ میں ایک خاص قسم کی کیفیت اور ضرورت کا احساس لازمی ہے۔ بغیر اسکے کوئی حکم نہیں دیا جاسکتا۔ خیال مدعا اور کیفیت اصل اور مقدم ہیں۔ اور الفاظ اون کا خاکہ یا ایک قالب یا ایک ذریعہ تعبیر یا محرک ہر لفظ کی ہستی ان ہی موجبات کے ماتحت وجود پذیر ہوتی ہے۔ اول نقش بعدہٗ عکس۔

میں جب۔ تم۔ ہم۔ وہ۔ یہہ کہتا ہوں۔ تو اون کے اطلاق سے اول ضروری ہے۔ کہ مشار الیہم بھی موجود ہوں۔ یہ الفاظ ایک ہستی اور ایک چیز کے بیان کرنے کا ایک مخصوص ذریعہ ہیں۔

جو الفاظ ہماری دماغی یا کتابی ڈکشنریوں اور لغات میں پائے جاتے ہیں اون میں سے بہت سے ایسے ہی ہیں۔ جو محض اعتباری جہت سے اور اعتباری رنگ میں کسی ایک معنے کے تابع یا ایک معنے کے واسطے مخصوص ہیں۔ ورنہ اون الفاظ کی اپنی ذات میں کوئی ایسی خصوصیت نہیں۔ کہ وہ ایسے معانی کے حامل ہوں۔ یا اون میں سے ایسے معنے نکلتے ہوں۔ مثلاً روٹی کے لفظ میں بظاہر روٹی کی کوئی کیفیت نہیں پائی جاتی۔ روٹی کا نام محض اعتباری رنگ میں روٹی ہے۔ ورنہ لفظ روٹی معانی۔۔ روٹی کے اظہار کے واسطے کافی نہیں ہے۔ ہم لفظ روٹی سے اس واسطے مفہوم روٹی لینے کے عادی ہیں۔ کہ اس لفظ پر استعمالی رنگ میں مدتوں سے ایک زبان میں ایسا اعتبار کیا گیا ہے۔

بعض کے خیال میں یہی لفظ روٹی ایک واقعی کیفیت کے اعتبار سے روٹی کا مفہوم رکھتا ہے۔ پنجابی زبان میں لفظ روٹ سے مراد ایک ایسی شے یا اس چیز کے ہیں۔ جو کچھ چوڑی اور موٹی ہی ہو۔ چونکہ روٹی میں یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس واسطے اوسے روٹی سے تعبیر کیا گیا۔ قلم کو قلم اس واسطے کہا جاتا ہے۔ کہ وہ حروف الفاظ جملوں اور فقرات کو الگ الگ اپنے موقعہ پر لکھتا جاتا ہے۔ اور لفظ قلم کے لغوی معنے تراشنے اور نقش کرنے کے ہی ہیں۔ خواہ کوئی سی صورت ہو۔ مناخذ معانی اور اسباب مدعا پہلے سے موجود ہوتے ہیں۔ اور الفاظ بعد میں بنتے یا بنائے جاتے ہیں جب تک بچہ پیدا نہیں ہوتا۔ اوس کا نام نہیں رکھا جاسکتا۔ جب تک گھر نہیں بناتے تب تک نہ تو اوس پر نمبر دیا جاسکتا ہے۔ اور نہ وہ کسی کوچہ۔ محلہ سے منسوب ہوسکتا ہے۔ اسم کی نوبت بعد میں آتی ہے۔ پہلے مسمے ہونا چاہئے۔ جتنی اشیاء عرصہ قدرت میں پہلے سے موجود ہیں۔ اون سب کے نام بعد میں رکھے گئے ہیں۔ دنیا کے پردہ پر کوئی ایسی شئے ثابت نہیں کی جاسکتی جس کا نام پہلے رکھا جائے۔ اور اوس کا مفہوم بعد میں خاص کیا جائے۔ ہر اسم کے واسطے مسمے کا تقدم لازمی ہے۔ علویات کی مخلوق اور تعبیرات سے ہم ناواقف ہیں۔ اور نہ خدائی علم پر ہمیں عبور ہے۔ اس واسطے ان منازل کی نسبت کچھ کہہ نہیں سکتے۔ واللہ اعلم۔

الفاظ اور معانی کی حقیقت

الفاظ درحقیقت سوائے ایک ڈھانچے کے اور کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ اگر کچھ حقیقت ہے۔ تو معانی ہی کی ہے۔ الفاظ محض قالب ہیں۔ اور معانی روح رواں

اگر معانی نہ ہوں۔ تو الفاظ ہی نہ ہوں۔ معانی کیا ہیں۔ جو کچھ کارخانہ کائنات میں موجود ہے۔ جسے موجودات ہی کہتے ہیں۔ معانی کیا ہیں۔ جو کیفیات اور مواد ہمارے اردگرد اسمانی اور آفتابی رنگ میں پایا جاتا ہے۔ معانی کیا ہیں۔ حقائق اور مشتبہ صورتیں معانی کیا ہیں۔ کیفیات اور کیفیات مادیہ کیفیات موجودہ کیفیات ظاہریہ اور کیفیات باطنیہ معانی کیا ہیں۔ لوازم اور عوارض مشہودہ معانی کیا ہیں۔ جو ایک لفظ کے ذریعہ سے مان لئے جاویں۔ معانی کیا ہیں۔ استعمال کیفیت مسلّمہ جس چیز کا نام قالین اور دری رکھتے ہیں۔ وہ وجود قالین اور دری کے معانی ہیں۔ قالین اور دری محض ایک اعتباری نشان ہے۔ ان دونوں الفاظ میں قالین اور دری کی حقیقت معناً نہیں پائی جاتی حقیقت وہی ہے۔ جو ان الفاظ کے سوائے موجود ہے۔ اس سے اول کہ یہ دونوں الفاظ اعتباری رنگ میں وجود پذیر ہوتے۔ وہ حقیقت موجود تھی۔ اگر وہ پہلے سے موجود نہ ہوتی۔ تو ان دونوں الفاظ کی ہستی ہی صفحۂ ہستی سے معدوم ہوتی الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ اور ان کے معانی ان سے کہیں پہلے موجود ہوتے ہیں۔

اشیائے مادی اور مناظر قدرت کو چھوڑ کر ان مجردات اور ان تخیلات پر بھی غور کرو۔ جو ہر لحظہ انسان کے دل و دماغ میں نشو و نما پاتے رہتے ہیں۔ اور جن کا انسان ایک بڑی حد تک محکوم ہی ہے۔ الفاظ میں آنے سے پہلے ان کا وجود موجود ہوتا ہے۔ اور ان کی ہستی کا نقش ثابت ہیں چاہتا ہوں۔ کہ کسی شخص سے کوئی ذکر کروں۔ اوسے کوئی بات کہوں۔ قبل اسکے کہیں کوئی ایسا ذکر کسی سے کروں۔ الفاظ کا ذخیرہ بظاہر موجود نہیں ہوتا۔ حالانکہ اوس ذکر کرنے کی کیفیت اور مصالحہ میرے دل و دماغ میں موجود ہوتا ہے۔ اسی موجودہ مواد کے مطابق میں الفاظ کی تلاش کرتا ہوں۔ ایسی امثلہ سے ثابت ہے۔ کہ معانی اور الفاظ میں وہی نسبت ہے۔ جو

قالب اور روح میں ہے۔ پہلے روح ہے۔ اور بعدازاں قالب پہلے خیال ہے۔ اور بعدازاں وہ کیفیت جو اوس خیال کا ثمرہ یا اثر اور نتیجہ ہے۔

یہ بھی مثال دی جاسکتی ہے۔ کہ یا یوں بھی پوچھا جاسکتا ہے۔ کہ

" زبان مقدم ہے یا انسان

اس کا جواب یہہ ہوگا۔ کہ جیسے اور ہستیاں اپنے اپنے اسماء اور تعبیرات سے مقدم ہیں۔ ایسے ہی زبان بعد میں ہے۔ اور انسان اوّل اگر انسان نہ ہوتا۔ تو زبان بھی نہ ہوتی۔ انسان کے ہونے ہی سے زبان وجود پذیر ہوئی ہے۔ اگر ہمارا صانع اور خالق نہ ہوتا۔ تو ہم بھی نہ ہوتے۔ یہ جدا بات ہے۔ کہ زبان کی ہستی قدرتی دفاتر میں مرقوم ہوتی۔ اسی طرح یہہ بھی کہا جائے گا۔ کہ تخیلات اور مناظر قدرت زبان سے مقدم ہیں۔ اگر خیالات اور مناظر قدرت نہ ہوتے۔ تو زبان بھی نہ ہوتی۔ پہلے یہ دونوں صورتیں صورت پذیر ہوئیں۔ پھر زبان نے جنم لیا زبان ان دونوں سے نکلی اور ان ہی پر اوس کا مدار ہی ہے۔ اگر تخیل زبان کی ماں ہے۔ تو مناظر قدرت اوس کا باپ ہیں۔ اگر مناظر قدرت اوسکی ماں ہیں۔ تو تخیل اوس کا باپ ہے۔ زبان نے ان دونوں کا دودھ پیا اور ان دونوں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور ان ہی کی توجہات کا وہ اثر اور ثمرہ ہے۔

دو ضمنی سوالات کا جواب

یہہ سوالات بھی اس بحث میں اٹھ سکتے ہیں۔

(الف) جب کوئی لفظ بغیر اسکے وجود پذیر نہیں ہوسکتا۔ کہ اوسکے ہونے سے پہلے اوسکے متعلق کوئی نہ کوئی حقیقت کیفیت اور معانی موجود ہوں۔ تو الفاظ

بے معنی کی بابت کیا تاویل ہوسکتی ہے۔

(ب) جب طبائع انسانی میں قدرتاً اسماء مودعہ ہیں۔ تو پھر یہ قیاس کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔ کہ جب تک کوئی مواد پہلے سے موجود نہ ہو تب تک کوئی لفظ متلفظ نہیں ہوسکتا۔ پہلے سوال کا یہ جواب ہے۔ کہ

بعض وقت انسان جو بے معنے الفاظ رٹ یا بول دیتے ہیں۔ تو ایسے الفاظ کی ۲ دو قسمیں ہوتی ہیں۔

(۱) تابع مہمل۔ یا لغات تابع

(۲) تابع عناصر کلام

جب کوئی لفظ تابع مہمل بولا جاتا ہے۔ تو اوس سے پہلے کوئی نہ کوئی لفظ حروف اور تلفظ میں اوس تابع مہمل کے ہم ردیف موجود ہوتا ہے۔ اور ایسا لفظ اوسی کے وزن پر اور اوسی کی شکل میں بولا جاتا ہے۔ جیسے۔

" حقہ دقہ۔

" تاش واش۔

" کام وام۔

" چلم ولم۔

" پیسہ ویسہ۔

جب پہلے سے اون کے مرادف لفظی کی صورت میں الفاظ موجود ہوتے ہیں۔ تو یہہ سوال اون کی نسبت کیونکر ہوسکتا ہے۔

دوسری قسم کے الفاظ انسان کے منہ سے وہ نکلتے ہیں۔ جو عناصر کلام باہر نہیں ہوتے۔ مثلاً مندرجہ ذیل بے معنے الفاظ۔

تام۔ چام۔ گن۔ ین۔ پن۔ عن۔ دب۔ ڈب۔ چان۔ پان۔ پل

پل - فرچی -

یہ جتنے بے معنے الفاظ بولے گئے ہیں - ان کے بولنے سے اول عناصر کلام یعنی - حروف حرکات ترکیب حروف اصول ہجا وغیرہ موجود ہیں - کوئی لفظ بے معنے ان عناصر کلام سے باہر نہیں ہوتا - جب عناصر کلام سے باہر نہیں رہا - تو کہا جائے گا - کہ اعتراض کی زد سے ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں - اور دوسرے یہ کہ انسان جسقدر الفاظ بے معنے بولتا ہے - وہ بہ مقابلہ ایک زبان یا بعض زبانوں کے بے معنے ہوتے ہیں - دنیا کی کل زبانوں کے مقابلہ میں اونہیں بے معنے نہیں کہا جا سکتا - اون کا اکثر حصہ کسی نہ کسی زبان کے الفاظ سے ٹکر کھاتا ہے - اور اوس دوسری زبان میں اون کے کچھ نہ کچھ معانی ہوتے ہیں - مثلاً اوپر کے بے معنے الفاظ میں سے الفاظ ذیل اون زبانوں میں جو اون کے محاذ میں درج ہیں - کوئی نہ کوئی معنے رکھتے ہیں اگرچہ کسی دوسری زبان میں اون کے کوئی معنے نہ ہوں -

	لفظ	معنے	کس زبان میں
(۱)	تام +	پورا	عربی میں
(۲)	چام +	چمڑا	ہندی میں
(۳)	گن +	بندوق توپ	انگریزی میں
(۴)	ین +	+ +	شاید دنیا کی کسی اور زبان کا کوئی با معنے لفظ ہو -
(۵)	+	+ +	اگر زیر سے بولیں تو سوئی کے معنے ہو جائینگے -
(۶)	عن +	سے	عربی میں
(۷)	دب +	دباؤ	پنجابی میں

جاپانی زبان میں ین روپیہ کو کہتے ہیں -

لفظ	معنے	کس زبان میں
(۸) ڈُب	+ داغ	پنجابی میں
(۹) چان	+	شاید کسی اور زبان میں کوئی معنے ہوں۔
(۱۰) پان	+ خارش	پنجابی میں
(۱۱) ٹل		انگریزی میں
(۱۲) پل		شاید کسی اور زبان میں یہہ معنے دار ہو۔
(۱۳) فر		عربی میں بمعنے شوکت
(۱۴) پچی	+	شاید کسی زبان میں یہہ بھی با معنے ہو۔

دیکھو ان ۱۴ لفظوں میں کسقدر لفظ کسی نہ کسی زبان کے با معنے الفاظ ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ساری زبانوں کے الفاظ سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ تو شاید کوئی لفظ ہی بے معنے نہ نکلے۔ اس سے یہ ہی ثابت ہوا کہ ہم بہت سے الفاظ کو بے معنے جانتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ صرف اون زبانوں کے مقابلہ میں بے معنے ہیں جن کے الفاظ اور معانی سے ہم واقف ہیں۔

اگر ہم ساری زبانوں کے الفاظ اور معانی الفاظ سے بالاستیعاب واقف ہوں۔ تو شاید کوئی لفظ ہی جو ہم بول سکیں۔ دنیا کی زبانوں میں بے معنے نکلے۔ یہ خیال معمولی نہیں ہے۔ اس پر ایک وسعت کے ساتھہ غور کرکے دیکھو گے۔ تو تمہیں یہ پتہ لگ جائے گا۔ کہ انسان کے اندرونہ میں سے جو الفاظ خارج ہوتے ہیں۔ اون کا اکثر حصہ کسی نہ کسی زبان میں با معنے ہوتا ہے۔ اس سے یہ کم لوگ

کا موقعہ مل سکتا ہے۔ کہ قدرت کی جانب سے انسان کو جو ملکہ تکوینی دیا گیا ہے۔ اوسکی
وسعت کہاںتک ہے۔ یا یہ کہ ہمارا ملکہ تکوین ایسا قوی اور ایسا وسیع ہے۔ کہ جو لفظ
نکلتا ہے۔ وہ کچھہ نہ کچھہ معنے رکھتا ہے۔ اور اوس سے یہہ بھی ثابت ہے۔ کہ دنیا میں
اس وقت جسقدر زبانیں بولی جاتی ہیں۔ وہ آپس میں سب کی سب ایک
اتصال اور واسطہ رکھتی ہیں۔

سوال دوم کا جواب یہ ہے۔ کہ

قدرت کی جانب سے انسان کے اندرونہ یا انسان کی طبیعت اور ذہن
میں الفاظ بناکر نہیں رکھے گئے ہیں۔ اور نہ اوسے الفاظ یاد کرائے گئے ہیں۔ بلکہ
مراد ودیعت اسماء سے یہہ ہے۔ کہ انسان کو ایک ایسا ملکہ تکوین دیا گیا ہے۔ جو
ضرورت کے وقت الفاظ اور اسماء بنالیتا ہے۔ جب اوسے کوئی منظر قدرت
یا مجموعہ اشیاء یا کوئی چیز دکھائی دیتی۔ یا پیش آتی ہے۔ تو وہ اوس کی
تعبیر کے واسطے کوئی نہ کوئی لفظ وضع کرلیتا ہے۔ جب وہ کوئی شئے اپنے سامنے
پاتا ہے۔ یا اوس کے اندرونہ میں سے کوئی خیال پیدا ہوتا ہے۔ تو ملکہ تکوینی
کی مدد سے اوسکی تعبیر کرتا جاتا ہے۔ دیکھو جب کوئی اجنبی سماں دیکھتا ہے
تو کس خوب صورتی سے — اوسکی تعبیر کرتا ہے جب کوئی خیال اوسکے
دل و دماغ میں گشت کرتا ہے۔ تو کس طرح وہ الفاظ کے ذریعہ سے اوس کی تعبیر
یا اوس کا اظہار کرتا ہے۔ بایں صورت وہ استحالہ لازم نہیں آتا جس کا خدشہ
اس سوال میں کیا گیا ہے۔

۴۸۶

اقسام معانی

معانی کی بھی الفاظ کی طرح چند قسمیں ہیں۔ اور ان ہی اقسام معانی سے جانا جاسکتا ہے۔ کہ ان کی وسعت اور جامعیت کیسی اور کہاں تک ہے۔

(الف) واقعی معانی۔

(ب) کیفی معانی۔

(ج) حسی معانی۔

(د) اعتباری معانی۔

(ہ) نسبتی معانی۔

واقعی معانی وہ ہیں۔ جو عین مناظر اور مودعات قدرت کے مطابق ہوں۔ جیسے الفاظ زمین۔ برق۔ ستارگان۔ سیارگان آفتاب اور ماہتاب کے معانی ان میں کوئی مبالغہ نہیں۔ کوئی اعتباری رنگ نہیں جب سورج کا لفظ.... اطلاق پائے گا۔ تو اوس سے سورج ہی مراد ہوگا۔ سوائے اس کے کہ اوس کے ساتھ کوئی اور فرضی جوڑ لگادیا جائے۔ جیسے ہم چو آفتاب ہم چو ماہتاب مثل آفتاب۔ مثل ماہتاب نجم الہند برق وغیرہ وغیرہ۔

کیفی معانی وہ ہیں۔ جو بعض اشیاء اور بعض صورتوں کی کیفیات کے اعتبار سے موضوع ہوں جیسے لفظ شربت کے معنے ایک من جہت شرب اور ایک من جہت امتزاج اور عمل خاص کے شربت میں کوئی واقعی حقیقت کیفیت ساطع

نہیں ہے۔ ایک خاص کیفیت کے اعتبار پر ایک قوام کا نام شربت رکھا گیا ہے
حسی وہ معانی ہیں۔ جو باعتبار ادراک اور احساس کے موضوع یا مسلم ہوں جیسے
خوشی مسرت غم اور رنج ان الفاظ میں تو کوئی ایسی حقیقت نہیں پائی جاتی۔ جو
ان کا مفہوم تسلیم کیا جاتا ہے۔ صرف ایک قسم کے احساس کی وجہ سے ایک
خاص کیفیت یا حالت کا نام جو انسان کے دل و دماغ سے وابستہ ہوتی ہے۔
خوشی مسرت اور اس کیفیت اور حالت کے خلاف کا نام غم اور رنج رکھا گیا ہے۔
اگر ہم خوشی مسرت غم اور رنج کی کوئی شکل وہیئت دریافت کریں۔ تو اوس کا
جواب ہمیشہ نفی میں ہوگا۔ اور کوئی نہیں بتا سکے گا۔ کہ اوسکی منظری کیفیت
کیسی ہوتی ہے۔

اعتباری معانی وہ ہیں جو محض ایک یا چند اعتبارات کے ماتحت موضوع
اور مسلّم ہوں۔ میز اور الماری میں کوئی حقیقت میز اور الماری کی نہیں پائی جاتی
محض ایک اعتبار کی بنیاد پر ایک مجموعہ لکڑی اور لوہے پیتل کا نام میز اور الماری
رکھدیا گیا ہے۔ اور اسی نام سے اعتباراً یہ مفہوم بھی نکل آتا ہے۔ تقریباً ہر زبان کے
ہندسوں کی شکل جداگانہ ہے۔ اشکال میں بہت کچھہ فرق ہے۔ لیکن مطلب سب
شکلوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اس سے بھی ثابت ہے۔ کہ محض اعتباری رنگ میں
بعض معانی فرض کرلئے گئے ہیں۔ ایک انگریزی خواں جس ہندسہ سے دو ۲ اور تین ۳
مراد لیتا ہے۔ ہندی خواں اوس کی دوسری شکل سے بھی وہی مراد لیتا ہے۔ ایک
کسی اور شکل سے وہی مراد لیتا ہے۔ اور دوسرا کسی اور شکل سے نتیجہ ایک ہی ہے
یہ قسم بہ نسبت دیگر اقسام کے بہت زیادہ ہے۔ اور اس قسم کے تحت جسقدر الفاظ
ہیں کسی اور قسم میں نہیں ہیں۔ بعض الفاظ اعتباری معانی رکھتے ہیں۔ مگر رفتہ
رفتہ ایسے اعتبارات کو بھی حقیقت پر محمول کیا گیا ہے۔ جیسے دوسرے الفاظ میں

مجاز ہی کہنا زیبا ہے۔ یہ انسانوں کے نام خطاب القاب کیا ہیں محض اعتباری زید اور خالد و بکر کے نام ہیں زیدیت۔ خالدیت اور بکریت کیا ہے۔ اگر کسی اجنبی مجلس میں زید کو خالد اور خالد کو بکر اور بکر کو زید کہہ کر پکارا جائے۔ تو کون اسپر اعتراض کر سکتا ہے اور کسے اس تعبیر میں کوئی شک ہو سکتا ہے۔

ہزاروں اشیاء اور ہزاروں سمول کے نام ہر ایک زبان میں جداگانہ ہیں۔ حالانکہ حقیقت اور کیفیت اُن تمام اشیاء اور تمام سموں کی ایک ہی ہوتی ہے۔ یہہ اعتباری تو ہے۔ کہ ہر شے اور ہر سمان مختلف زبانوں میں ایک خاص معنے رکھتا ہے۔ علم ہندسہ ایک یقینی علم کہا جاتا ہے۔ مگر جب ہم یہ پوچھتے ہیں۔ کہ کیوں دو کو دو اور تین کو تین اور پانچہ کو پانچہ کہا جاتا ہے۔ اور کیوں ان کی شکلیں (۲+۳+۵) متصور ہیں۔ کیا۔ دو کو۔ چو۔ تین کو ٹین اور پانچہ کو کیا پنچہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور کیا بجائے اشکال معمولہ کے اُن کی یہ شکلیں نہیں قائم کی جا سکتیں۔

۷ ۶ ۵ ۴ ۳ ۲ ۱

اگر کسی اجنبی ملک اور قوم میں بجائے اشکال اور الفاظ مفروضہ کے یہ شکلیں اور یہہ ہندسے لکھے یا بیان لئے جائیں۔ تو کیا کسی کو بھی ان پر اعتراض ہو سکتا ہے

نسبتی معانی وہ ہیں۔ جو کسی نسبت کی حیثیت سے کسی کیفیت سے منسوب ہوں۔ مثلاً چارپائی۔ بوجہہ چارپا ہونے کے ایک سونے والی چیز کا نام رکھا گیا ہے۔ ورنہ لفظ چارپائی سے تو اور ایسی چیزیں بھی مراد لی جا سکتی ہیں۔ اور ہر چارپایہ شے پر لوگ سوتے نہیں ہیں۔ اور نہ انہیں چارپائی کہا جاتا ہے۔

معانی کی دیگر اقسام

پھر معانی کی باعتبار وسعت اور بھی دو قسمیں ہیں۔

(الف) قطعی معانی۔

(ب) غیر قطعی معانی۔

قطعی معانی وہ ہیں۔ جن کے سوا اور کوئی معنے یا صورت استعمال نہ ہو۔ مثلاً کتاب کا لفظ من جہت کتاب اور کسی چیز پر نہیں بولا جاتا۔ جب لفظ کتاب کا اطلاق ہوگا۔ تو اس سے صرف کتاب ہی مراد ہوگی۔

غیر قطعی وہ معانی ہیں جو ایک شے کے سوائے اور اشیاء اور دیگر صور پر بھی حقیقتاً یا مجازاً اطلاق پا سکیں۔ مثلاً ید عربی میں ہاتھ کا نام بھی ہے۔ اور طاقت۔ قوت۔ زور کے معنوں میں بھی استعمال پاتا ہے۔ عموماً جب کسی ایک ہی لفظ کے مختلف معانی مراد ہوتے ہیں۔ تو ان میں سے اصلی یا ابتدائی معنے صرف ایک ہی ہوتے ہیں۔ باقی کے مجازاً نسبتاً۔ اور اعتباراً اطلاق پاتے ہیں۔ مثلاً ید کے معنے اگر طاقت کے اصلی ہوں۔ تو چونکہ ہاتھ میں ہی ایک طاقت اور زور ہوتا ہے۔ اس واسطے اس کا نام ہی عرب والوں نے ید رکھ دیا۔

اسی طرح کبھی نسبت مزید سے مختلف معانی مراد لئے جاتے ہیں۔ جیسے آتش کے حقیقی معنے تو آگ ہی کے ہیں۔ لیکن جب آتش معدہ اور آتش دل اور آتش رشک و حسد آتش بغض و عداوت اور آتش محبت و عشق کہا جاتا ہے۔ تو مطلب اس سے آگ ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ حدت اور وہ جوش جو جذباتی رنگ میں ان منسوبات اور ان اشیاء میں پایا جاتا ہے۔ اور اپنے رنگ جذباتی

میں مشتعل ہوکر آتش کی طرح مزاج میں گرمی پیدا کرتا ہے۔

حیثیت زبان باعتبار معانی

وہی زبان کامل اور اصل یا فطری زبان سمجھی جائے گی۔ اور اوسی زبان کی نسبت یہہ کہا جائے گا۔ کہ اوسکی وضع اور ترکیب میں زیادہ ملکۂ تکوینی یا قابلیت ذہنی کو ملحوظ رکہا گیا ہے۔ جس کے معانی واقعی اور اصلی مفہوم رکھتے ہوں۔ بعض زبانین ان اوصاف سے کسی نہ کسی حد تک متصف ہوتی ہیں۔ لیکن اون میں سے بعض زبانیں مثلاً سنسکرت اور عربی زبان بالخصوص یہ خوبی رکھتی ہیں۔ عربی زبان کے اکثر الفاظ واقعیت پر متلفظ ہیں۔ جب اون کا روٹ اور مشتق دیکھا جاتا ہے۔ تو اون کے وہی معنے اور وہی مفہوم نکلتا ہے۔ جو مروجہ معانی سے مراد ہوتا ہے۔ مثلاً۔ لفظ قلب۔ ضمیر۔ دماغ۔ حافظہ۔ الہام۔ عقل وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں۔ کہ اون کا مفہوم ٹھیک وہی ہے۔ جو ان الفاظ کے اصلی معانی کا ہے۔ یہہ معانی کوئی اعتباری رنگ نہیں رکھتے۔ اور نہ اعتباری زور پر ان کا ایسا اطلاق ہوتا ہے جن معانی کے ماتحت ایسے الفاظ کا عربی میں اطلاق ہوتا ہے۔ وہ معانی ٹھیک اوسی رنگ میں معمول ہیں جس رنگ میں ذہنی اور تنقیدی حقیقت ہوتی ہے۔ جب ہم دل کی تعبیر لفظ قلب سے کرتے ہیں۔ تو جو کچھہ دل کی حقیقت ہے۔ وہ اس لفظ میں ہی ہوبہو آجاتی ہے۔ لیکن خلاف اسکے دل کے لفظ کی یہ حقیقت نہیں۔ اور اسی طرح ضمیر کا لفظ ہی ہے۔ علمی رنگ میں جو لفظ ضمیر کے معنے ہیں وہی لغوی معنے بھی ہیں۔ عربی زبان میں صدہا ایسے لفظ مل سکتے ہیں جنکی حقیقت لغوی معانی سے ہوبہو ہوکر کھاتی ہے۔ اور لغوی معانی ہی ایک حقیقت رکھتے ہیں

میرا خیال ہے۔ سنسکرت اور عربی کے سوا بہت کم دوسری زبانیں ایسی ہیں۔ جن کے الفاظ کی یہہ حقیقت ہو۔

۱۸۶

ارتقاءِ الفاظ معانی وزبان

جس طرح دنیا کے اور اشیاء رفتہ رفتہ ترقی کرتے یا تنزل پذیر ہوتے ہیں اسی طرح زبانیں اور اون کے الفاظ و معانی بہی ترقی پاتے یا تنزل پذیر ہوتے ہیں۔ کم سے کم میں تو یہہ مان چکا ہوں۔ کہ شروع میں زبان ایک ہی تہی۔ یا سب موجودہ زبانوں کا جو اس وقت دنیا میں بولی جاتی ہیں۔ ایک ہی شروع تہا۔ پہلے پہل اشارات اور کنایات سے کام لیا گیا۔ پہر رفتہ رفتہ تلفظ کی نوبت آئی۔ جس طرح اشارات اور کنایات کچہہ عرصہ کے بعد ترقی پاتے پاتے تلفظ تک پہنچے۔ اسی طرح تلفظ ہی رفتہ رفتہ ترقی پاتا گیا۔ پہلے پہل جس قسم کے الفاظ تہے۔ اون کی وہ صورت باقی نہ رہی۔ اون میں بہت کچہہ تغیر و تبدل ہوتا گیا۔ انسان کی شروع میں مثال بچوں کی سی تہی۔ دیکہو اب ہی بچے شروع شروع میں کیسے توتلے پن سے بولتے ہیں اور اون کے منہ سے کسطرح ٹوٹے پہوٹے الفاظ نکلتے ہیں۔ اگر بچوں کی زبان لکہی جاوے تو پڑہنے والے نہ تو سمجہہ سکیں گے۔ کہ یہ کسی شستہ زبان کے الفاظ ہیں۔ اون میں وہی الٹی پلٹی بے ترتیبی ہوگی۔ جو عموماً ناترقی یافتہ زبانوں میں ہوتی ہے۔ نہ تلفظ درست ہوگا

اور نہ ترکیب اور ترتیب بعینہٖ یہی صورت اور یہی کیفیت شروع شروع میں زبان کی بہی تھی۔ یہ ترقی اور یہ شستگی اور یہ طلاقت جو ہم اسوقت دیکھتے ہیں۔ یہ صدیوں اور مدتوں کی ارتقائی ترقیات کی وجہ سے ہے۔ وہ زبانیں جو ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ اور اب تک جنکی کیفیت شروع ہی سے نسبت رکھتی ہے۔ دلیل ہے اس بات کی کہ جو زبانیں رفتہ رفتہ ترقی نہیں پاتی ہیں۔ اونکی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں گنڈہیلوں۔ ساہنسیوں۔ پکھی واروں۔ پیرنیوں۔ کولیوں۔ دھانکوں۔ جنگلیوں۔ کی زبانیں اور بولیاں تمثیلاً پیش کی جاسکتی ہیں۔ ان زبانوں کا رواج اور بول چال چونکہ ایک محدود قوم میں رہا۔ جسے دوسری قوموں کے لوگ اور ہمسائے نہ سمجھتے ہیں۔ اور نہ بولتے ہیں۔ اسواسطے ان زبانوں کو لفظی اور معنوی کچھ بہی ترقی نہ ہوئی جہاں سے اون کا شروع ہوا تھا۔ وہیں اون کا خاتمہ بہی ہوگیا۔ اون لوگوں کو بولتے سنو تو طبیعت گھبراتی ہے۔ اور کراہت کرتی ہے۔ نہ تلفظ میں لذت اور نہ طرز بیان میں جذب اور اثر اور نہ معانی میں کشش ہوبہو جانوروں کی بولیاں سمجھ لو۔

اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے۔ کہ یہی صورت اور یہی کیفیت شروع شروع میں اُن زبانوں کی بہی تھی۔ جنہیں اسوقت صفحۂ دنیا پر ترقی یافتہ شستہ اور علمی کہا جاتا ہے اور جو خزائن ادبیہ کا ایک قیمتی حصہ ہیں۔

اب تم پوچھو کہ زبانیں ارتقائی رنگ میں کیونکر ترقی کرتی ہیں۔

اس امر کے فیصلہ کے لئے ہمیں زبان کے اون حصوں پر غور کرنا چاہیئے۔ جو اون لوگوں میں بولے جاتے ہیں۔ جنہیں بعرف عام عوام الناس یا جہلا کہا جاتا ہے۔ وہ الفاظ جو ان لوگوں کی زبان سے نکلتے یا جنہیں یہ لوگ بولتے ہیں۔ گویا زبان کے وہ حصے ہیں۔ جو ابھی اپنی پہلی حالت کے کچھ کچھ قریب ہیں۔ مثلاً۔

میں تینوں کہنا ہاں میرا آکھنا ان من لے۔ نہیں تے میں تیرے نال اچھا نہ ورتانگا

توں تاں میری گل نہیں سُندا پر میں تینوں کہہ دناں ہاں۔ یہ الفاظ پنجابی زبان کے ہیں۔ اور ایک عام پنجابی بول رہا ہے۔ گو ان کا مطلب صاف ہے۔ اور ہر پنجابی اسکو بہ خوبی سمجھ لے گا۔ مگر ان الفاظ کی حروفی ترکیب باعتبار ثقالت اور لطافت گری ہوئی ہے۔ اب ان کی دوسری شکل ملاحظہ ہو۔

میں تمہیں یا تمکو کہتا ہوں۔ میرا کہنا مان لو۔ نہیں تو میں تم سے اچھا نہیں برتوں گا۔ تم تو میری بات نہیں سنتے۔ پر میں تجھے یا تمہیں کہہ دیتا ہوں۔ یہ صورت اور یہ تلفظ ان الفاظ کا بہ رنگ ارتقا و رفتہ رفتہ بدلا ہے۔ اور یہ کوئی دو تین ہفتہ دو تین ماہ اور دو تین سال کا کام نہیں مدتوں کے بعد یہ صورت صورت پذیر ہوتی ہے۔ ایک دوسری مثال ہی یوں پیش کی جاسکتی ہے۔

وہ شخص ایک بڑا نہ دان [نادان] ہے۔ اوسکی تمیئر [تمیز] اچھی نہیں۔ اوسدی [اوسکی] بدہ۔ کھراب [خراب] ہے۔ یہ میری بات درسل [درست] ہے۔ اوسکا مجاج [مزاج] چڑھا ہوا ہے۔ آپ کو ملوم [معلوم] ہے۔ کہ میں ہمیشہ اوسکے نال اچھا سلوک کرناں ہاں [کرتا ہوں]۔ تا ہنوز یہی دشتور [دستور] جاری ہے۔ سکر [شکر] کی بات ہے۔ کہ آپ سب کچھ جانتے ہیں۔

یہ اوس زمانہ یا اوس صدی کی زبان ہے۔ کہ جب ایک بڑی حد تک زبان کی ترقی ہو چکی تھی۔ لیکن آپ دیکھ سکتے ہیں۔ کہ جن الفاظ کے تحت دوسرے الفاظ لکھے گئے ہیں۔ وہ مدتوں کے بعد اون کے قائمقام سمجھے گئے ہیں۔ اور یہ ترقی ان میں رفتہ رفتہ ہی ہوئی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جو زبانیں پائی جاتی ہیں۔ خصوص وہ السنہ جو شستہ۔ ترقی یافتہ اور علمی زبانیں کہلاتی ہیں۔ کچھ چند ہفتوں کی اصلاحات اور ترقیات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ بلکہ صدیوں اور قرنوں کا۔

جسطرح انسانی تہذیب اور انسانی ترقیات قرنوں اور صدیوں کا اندوختہ ہیں۔ اوسی طرح لسانی ترقیات بھی صدیوں کی کمائی ہیں۔ اور چونکہ لسانی ترقیات

اور لسانی ارتقاء بھی انسانی ترقیات ہی کا ایک جزو اعظم اور رکن اہم ہے۔ اسواسطے اسکی رفتار بھی دوسری انسانی ترقیات کے ساتھ ساتھ ہی رہتی ہے۔

ہر زبان خصوص اون زبانوں کے لغات اور دیگر کتب ادبیات سے پایا جاتا ہے کہ بہت سے الفاظ رفتہ رفتہ متروک ہوتے گئے ہیں۔ اگرچہ عام طور پر اون کا اطلاق ہوتا ہو۔ مگر جماعت خواص اور باعلم لوگوں میں اونہیں نہ بولا جاتا ہے۔ اور نہ لکھا جاتا ہے

متروکات کی چند قسمیں ہیں۔

(الف) متروکات عامہ۔ (ہ) متروکات تقریری۔

(ب) متروکات خاصہ۔ (و) متروکات تحریری۔

(ج) متروکات مختلف فیہ۔

(د) متروکات ادبی۔

ایک وہ متروکات ہیں۔ جو عام طور پر متروک ہیں۔ نہ اونہیں خاص بولتے ہیں۔ اور نہ عام گویا ایسے الفاظ دائرہ زبان ہی سے نکل چکے ہیں۔ اونکی ہستی ہی مٹ چکی ہے۔ اور اب اونکا زبان اور کاغذ پر آنا ناممکن ہے۔ وہ ہمیشہ کے لئے فراموش ہو چکے ہیں۔

متروکات خاصہ وہ ہیں جنہیں عوام تو بولتے ہیں۔ لیکن خواص میں اون کا رواج نہیں۔

متروکات مختلف فیہ وہ ہیں جنہیں ایک گروہ استعمال کرتا ہے۔ اور دوسرا نہیں کرتا۔ جیسے اردو زبان کے ایسے متروکات کی بابت دلی اور لکھنؤ والوں میں اختلاف ہے۔ یا کوئی شاعر اون کا استعمال صحیح سمجھتا ہے۔ اور کوئی درست نہیں جانتا۔

متروکات ادبی وہ ہیں۔ جو تحریر میں تو نہیں استعمال کیئے جاتے۔ لیکن عام بول چال میں ہر کوئی بولتا ہے۔

متروکات تقریری وہ ہیں۔ جن کا تقریر میں عموماً استعمال نہیں کیا جاتا۔ یا بہت ہی کم ہوتا ہے۔ متروکات تحریری وہ ہیں۔ جو تقریر میں تو آتے ہیں۔ لیکن تحریر میں متروکات ہیں یہ متروکاتی سلسلہ کچھ آج کل کا نہیں۔ اسے بھی صدیاں ہی گزرتی ہیں۔ ذرا اُردو ہی کی پہلی تصنیفات و تالیفات اور بول چال دیکھو۔ کہ موجودہ اُردو سے اوس میں کسقدر اختلاف ہے۔ اور کتنے یا کوڑیوں الفاظ اس نوخیز زبان میں سے چھنٹ چھنٹ کر متروکات میں مل رہے ہیں۔ آج اگر بانیان اُردو موجود ہوتے تو اونہیں موجودہ اُردو کی کیفیت دیکھ اور سُن کر خود ہی ایک حیرت ہوتی۔

اُردو پر ہی موقوف نہیں۔ ہر زبان کا شروع وسط اور موجودہ وقت متضاد رنگ اور متضاد سماں رکھتا ہے۔

ابتدائی انگریزی میں اس قسم کے الفاظ ملتے ہیں۔ کہ اون کا سمجھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ارتقائی رنگ میں انگریزی زبان جس علو تک پہنچی ہے۔ اوسکی ریس پہلی انگریزی کیسے کر سکتی ہے۔ ہر زبان ارتقائی رنگ میں بصورذیل ترقی پاتی ہے۔

(الف) بہ تنقید الفاظ۔

(ب) بہ انتخاب الفاظ۔

(ج) بہ حسن معانی۔

(د) بہ وسعت معانی۔

(ہ) بہ وسعت مضامین

(و) بہ حسن ادبیات۔

(ز) بہ حسن جذب۔

ہر ترقی یافتہ زبان میں یہی باتیں ہیں۔ جن کی بنیاد پر اوسے کامل اور ترقی یافتہ کہا جاتا ہے۔ ایک طرف مختلف اوقات میں تنقید الفاظ ہو کر جامع خوش آیند لطافت خیز

الفاظ ذخیرہ لسانی میں بڑھتے جاتے ہیں۔ یہ سرمایہ اس خوبی سے جمع ہوتا جاتا ہے
کہ زبان کے اندر خود بہ خود انتخابی قوت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ پہلے الفاظ کا ذخیرہ بھی
اون الفاظ جدید کا خیر مقدم کرتا ہے۔ جو تکمیل اور حسن زبان کے واسطے ایک اچھا ذریعہ
ثابت ہوں۔ دوسری طرف اسکے ساتھہ ہی حسن معانی میں بھی اضافہ اور ترقی ہوتی
جاتی ہے۔ بہت سے لفظ ایسے ہوتے ہیں۔ جو بذاتہ جامع اور خوش آیند ہیں۔ لیکن
اون کا طریق استعمال اونہیں اونکی ذاتی خوبی سے کسی حد تک دور رکھتا ہے۔
رفتہ رفتہ ایسے الفاظ اپنے صحیح پہلو پر استعمال پاکر حسن معانی کے حامل ثابت
ہوتے ہیں۔ اور طبیعت اون معانی سے رفتہ رفتہ آشنا ہوتی جاتی ہے۔

اسی طرح الفاظ میں بھی رفتہ رفتہ وسعت معانی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ بعض
الفاظ تنگ خیالی یا تنگی استعمال یا بے استعمالی سے اپنی وسعت کے مطابق
باعتبار معانی استعمال نہیں پاتے۔ زبان اون سے اسقدر مستفید نہیں ہوتی جس
قدر کہ ہونی چاہئیے جب زبان کا بہت سا حصہ ٹکسالی ہوتا جاتا ہے۔ تو ایسے الفاظ کی ایک
صحیح پہلو سے نوبت آتی ہے۔ اور زبان اوس حد تک اون سے رفتہ رفتہ مستفید ہوتی
ہے۔ جس حد تک کہ ہوسکتی ہے۔ کوئی زبان اوس وقت تک ترقی یافتہ نہیں کہی
جاسکتی۔ جب تک کہ وہ مختلف مضامین اور مختلف علمی اور عملی مقاصد کے بیان
کی وسعت اور ظرف وطاقت نہ رکھتی ہو جس زبان میں یہ طاقت نہیں اور ایسا ظرف
نہیں رکھتی۔ وہ ایسی زبان نہیں کہی جاسکتی۔ کہ جسے ایک علمی زبان کہا جاتے جب
یہ وسعت اور ایسا ظرف کسی زبان میں موجود ہو جاتا ہے۔ تو اوسوقت کہا جاتا ہے
کہ اوس زبان کا ذخیرہ ادبیات ایک حسن اور ایک جامعیت رکھتا ہے۔ کسی
زبان کا ادب اوسوقت تک جامع اور اگر حسن وزیبا نہیں کہلا سکتا۔ جب تک وہ
مضامین مختلفہ اور مقاصد متضادہ کے بیان کرنے میں علمی قوت نہ رکھتی ہو جسکے

زیادہ پڑھ کر یا یہ کہ ان سب ترقیات کا لب لباب اور نچوڑ یہ ہونا چاہیئے. کہ
اوس زبان میں ایک ایسی کشش ایک ایسا زور اور ایک ایسا جذب اور ایسی
وسعت پیدا ہو جائے۔ جو ہر معرکہ ادبی اور ہر عرصہ علمی اور میدان عملی میں ایک قوت
ایک جامعیت اور ایک خوبی کے ساتھ کام دے نکلے۔ جو زبانیں ایسا زور ایسا جذب
ایسی جامعیت رکھتی ہیں۔ وہ کسی مقصد اور کسی مضمون کے لیئے بیان کرنے یا لکھنے
میں کسی دوسری زبان کی شرمندہ احسان نہیں ہوتیں۔ اخذ مضامین اور تمسک
مقاصد اور بیان مناظر میں وہ ہر ایک پہلو سے اوسی شان و شوکت اوسی وسعت
اور اوسی زور سے حصہ لیتی ہیں۔ جو ایک ترقی یافتہ اور کامل زبان کی خصوصیات
میں سے ہوتا ہے۔ نہ شاعری اور نظم میں خم کھاتی ہیں۔ اور نہ فلسفہ اور سائنس
میں پیچھے ہٹتی ہیں۔ اور نہ تاریخ میں پسپٹی رہتی ہیں۔ نہ سیاسیات میں متامل
ہوتی ہیں۔ اور نہ ادبیات میں اون کا کونہ دبتا ہے۔ نہ تقریر میں رکتی ہیں۔ اور نہ تحریر
میں۔ ہر رنگ میں کام دے جاتی ہیں۔ اور ہر صورت میں اپنا جوہر اور اپنی جامعیت دکھانے
میں رکتی نہیں ایسی تمام باتیں اور یہ تمام خوبیاں کیا ایک دو سال یا چند سالوں میں
ہی پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسکے واسطے تو صدیاں چاہیئے۔ مدتوں کے بعد یہ حالت اور یہ
کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ سالوں کے پیچھے ایک زبان اس میدان جامعیت میں
آتی۔ اور یہ خصوصیت اور یہ رنگ پیدا کرتی ہے۔

(مدتے باید کہ کھچڑی خربوزہ شود)

اگر کوئی زبان انسانوں کی مساعی اور تنقید کا اثر ہے۔ تو انسانی نسلیں
بھی زبانوں کی جامعیت اور حسن کی بدولت ہی دولت حسن تمدن حسن اقتصاد
حسن علوم اور حسن فنون سے مالا مال ہو رہی ہیں۔ جس قوم اور جس ملک کی زبان
جامع اور کامل نہیں۔ جس قوم کی زبان میں کوئی حسن اور کوئی وسعت نہیں۔ وہ

قوم اور وہ ملک بھی انسانی خوبیوں اور انسانی کمالات اور لازمی ضروریات سے ایک حدتک معرا اور خالی ہے ایسی قوم بعض اعزاضی رنگ میں گنگی اور بہری ہوتی ہے۔ وہ اون فضائل اور اون برکات سے مطلقاً بیگانہ ہے۔ جو اون اقوام کے حصہ بحزہ میں آتی ہیں جن کی زبانیں کامل اور جامع ہیں۔ ایک بہرا گنگا نطق کی خوبیوں اور کمالات سے جسطرح واقف نہیں ہوسکتا اسی طرح وہ لوگ اور وہ قومیں بھی اون خوبیوں سے کب واقف ہوسکتی ہیں۔

تنزل السنہ

جسطرح قومیں ترقی پاتی اور تنزل ہوتی ہیں۔ اسی طرح زبانیں بھی ترقی پاتی اور تنزل ہوتی ہیں۔ جسطرح دنیا کے کاروبار میں ارتقا لازمی ہے۔ اسی طرح انحطاط بھی لازمی ہے۔ جسطرح یہ کہا جاتا ہے۔

لکل امت اجل

اسیطرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے۔

لکل لسان اجل

تاریخ ہی نہیں بلکہ تنزل یافتہ زبانوں کی موجودہ حالت ہی باآواز بلند کہہ رہی ہے۔ کہ اونہیں جو کسی وقت جوبن اور خوبی جامعیت جذب وکمال حاصل تھا۔ آج اوسکا کوئی نشان بھی نہیں ملتا۔ تذکرۃً بھی اون کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ بھولے بھی اون پر نظر نہیں پڑتی۔ احیاناً بھی اون کا خیال نہیں آتا۔ اون کی فرعین اور اونکی ذریات تو اسوقت کچھہ نہ کچھہ جوبن پر ہیں۔ لیکن وہ اپنی ہستی اس حدتک چھوڑ چکی ہیں۔ کہ اون کا ذکر کبھی کبھی عبرتاً تو آجاتا ہے۔ لیکن عملی سنگ میں اون کی ہستی قریباً معدوم ہوچکی ہے۔ ہندوستان میں سنسکرت ایک بڑے پایہ کی اور کامل زبان ہے۔ وہ اپنی بعض خوبیوں کے اعتبار سے دنیا کی اون زبانوں سے ٹکر کھاتی ہے۔ جو جامع اور بڑے بلند پایہ کی زبانیں ہیں۔ اوسے ساتھہ ہی یہ بھی

ایک فخر حاصل ہے۔ کہ وہ ایک مشہور قوم کی مذہبی زبان ہی ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے گذشتہ جوبن کو لئے ہوئے ہے۔ اس وقت اگر اوسکی کوئی خوبی ہے۔ تو یہ ہے۔ کہ مذہبیات میں اوسکا گاہ گاہ ذکر آجاتا ہے۔ ناگری اور بھاشا اور ہندوستان کی دیگر زبانیں قریبًا اسی مادر سنسکرت کی ذریات میں سے ہیں۔ اور ایک بڑی حدتک اوسکی محتاج اور گرویدہ ہیں۔ انہیں بہ مقابلہ سنسکرت کے اسوقت جو ترقی ہے۔ سنسکرت اوسکے مقابلہ میں رک چکی ہے۔

زبان ژند کی بھی یہی حقیقت ہے۔ سوائے مذہبی صحائف اور مذہبی ادعیہ کے اوسکا وجود بھی قریبًا متروک فہرست کی زیب و زینت ہو رہا ہے۔ اوسکی طاقت اسوقت صرف اوس حدتک رہ گئی ہے۔ جس حدتک اوسے اعتقادیات میں دخل ہے۔

ذرا پیچھے مڑکر فارسی زبان دیکھیئے سلاطین اسلام میں ہندوستان کی دھرتی دن بدن اس سے آشنا تھی۔ ہندوؤں نے ضروریات سیاسی۔ ضروریات تمدنی کے خیال سے اس میں جسقدر ترقی کرکے دکھائی۔ وہ بے شک اون کی ہمت اور اون کی زمانہ بینی اور زمانہ شناسی اور ذہانت و محنت کا ایک روشن پہلو ہے اوس ترقی اور اوس بلند پروازی کے مقابلہ میں جو بہ سال ہائے گذشتہ فارسی کی محنت کا حصہ بخرہ تھی۔ آج دیکھیئے ہندوستان میں وہ دن بدن تنزل پذیر ہے۔ خود وہ قومیں جو اسے ہندوستان میں لائی تھیں۔ آج اونکی نسلیں اس سے دن بدن بے بہرہ ہو رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آتا ہے۔ کہ فارسی کا نام ہی نام رہ جائیگا۔ عروج کے زمانہ میں کوڑیوں شاعر شاعر ہی کیسے پایہ کے جو فارسی نژاد شاعروں سے لگا کھاتے تھے۔ اس زبان کی یادگار تھے۔ آج ایسے لوگ بہت کم ملیں گے۔ جو اون شاعروں کا کلام بھی ذوق و شوق سے پڑھتے۔ یا دیکھتے ہوں

یہہ کھیل گویا دیکھتے دیکھتے ہی ختم ہوگیا -

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ؏

زبانون کا باہمی مقابلہ

براعظموں میں جہاں چند مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں - ہمیشہ زبانوں میں ایک قسم کا مقابلہ رہتا ہے - وہ گو خطوط متوازی کی طرح نہیں چلتی ہیں - اور اونکی ڈور جدا اگانہ رخ رکھتی ہے - لیکن اون میں مقابلہ ضرور رہتا ہے - گو یہ ظاہر ایک زبان دوسری کی جگہ نہ لینی چاہیے - مگر اونکی روشں اور رفتار ہی ایسی ہوتی ہے - کہ بہ تدریج ایک کے مقابلہ میں دوسری کھڑی ہو جاتی ہے - خصوص وہ زبانیں جو علمی رنگ رکھتی ہیں - ایسی ڈور میں کوئی زندہ زبان بازی ہی نہیں لے جاتی - بلکہ اپنی ہستی کو بھی قائم رکھ سکتی ہے - وہ زبان گوئے سبقت لے جاتی ہے جس میں کوئی حسن اور کوئی جذب ہو - جو مطالبات کے بیان کرنے اور مطالبات کے لینے میں کشادہ ظرف رکھتی ہو جسکے بولنے والے اوسکی ترقیات کے لیے اون وادیوں اور اون راہوں سے گذرنا سہل سمجھتے ہوں - جو فلسفہ زبان میں دکھائی گئی ہیں - اور جن کے بغیر کوئی زبان دنیا میں نہ تو ترقی کر سکتی ہے - اور نہ قائم رہ سکتی ہے - سب سے پہلا سوال یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی زبان مقابلتاً ترقی یاب کسطرح ہو - بلکہ یہ کہ

مقابلتاً قائم اور زندہ کسطرح رہ سکتی ہے - یہ دوسرا سوال ہی دراصل ترقی کا زینہ ہے - کیونکہ جو ہستی دنیا میں خود کو ماتحت اصول تنازع للبقا قائم رکھنا چاہتی ہے - وہی ترقی کی راہوں پر بھی قدم زن ہوا کرتی ہے -

جسطرح دنیا میں ہر ہستی ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ آرا ہے۔ اسیطرح زبانیں بھی ایک دوسری کے ساتھہ اپنے اپنے رنگ میں مجادلہ پیما نہیں۔ ان میں بھی ایک دوسری سے بڑہنے اور اور بازی لے جانے کا سودا ہے۔ انسانی لڑائیاں اسقدر سخت نہیں ہیں۔ جسقدر لسانی لڑائیاں پیچیدگی رکھتی ہیں۔ انسانی لڑائیوں کا معاوضہ آنے والی نسلوں اور آنے والے دولت و مال اور ثروت و برکت کے ساتھ کسی نہ کسی وقت ہو جاتا ہے۔ لیکن لسانی لڑائیوں کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ یا ایک زبان صفحۂ ہستی سے مٹاوی جاتی ہے۔ اور یا اوسکے اثر اور جذبات میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ انسانی لڑائیاں آلات کی محتاج ہیں۔ اور لسانی جنگیں خاموشی کے ساتھ عرصۂ کلام میں اپنے یاس آمیز یا فرحت خیز نشانات چھوڑتی اور ایک قوم کی خوش نصیبی اور شومی طالع پر مہر لگاتی ہیں۔ وہی زبان فتح پاتی ہے جسکی وسعت اور ظرف جامعیت کے ساتھ ایک خوش آیند جذب بھی ہوتا ہے۔ جہاں لوگ فلسفہ کی اور شاخیں پڑھتے اور اون پر غور کرتے ہیں۔ وہاں فلسفہ لسانی بھی اس قابل ہے۔ کہ اوسپر اور اسکی ارتقائی اور انحطاطی شاخوں پر بھی غور کیا جائے۔ یہ ایک ایسا دل چسپ اور خوش آیند فلسفہ ہے۔ کہ اس سے یہ معلوم ہوتا یا ہوسکتا ہے کہ انسان کی اس قوت ناطقہ نے۔ کیونکر اور کن کن ذرائع سے ترقی پائی۔ اور کیا کیا رکاوٹیں اوسکے حائل ہوئیں۔ اور کون کون سی رکاوٹیں حائل ہوسکتی ہیں۔

ترقی زبان کے بعض دیگر وسائل

جوں جوں کوئی قوم ترقی کرتی اور جوں جوں کسی قوم کی تہذیب اور تمدن

عروج پذیر ہوتا ہے۔ ووں ووں اوسکی زبان بھی ترقی پاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ جوں جوں کسی قوم کی زبان بہ وسائل مختلفہ ترقی یاب ہوتی ہے۔ ووں ووں قوم بھی ترقی پاتی ہے۔ تہذیب اور تمدن و اقتصادیات میں ضروریات انسانی بڑھتی جاتی ہیں۔ انسانی ضروریات کے ساتھ ہی زبان بھی ترقی پاتی ہے۔ دیکھو جن جن قوموں کی ضرورتیں کم اور محدود ہیں۔ اون کی زبان بھی اب تک محدود ہے۔ جس گھر کے ممبر سادگی کے ساتھ گزارہ کرتے ہیں۔ وہاں تم مختلف اشیا مختلف نمونوں کی چیزیں اور سامان نہیں۔ دیکھوگے وہی دو چار چیزیں جن سے زندگی کا دھندا چل سکتا ہے۔ لیکن جہاں تم زندگی کی ضرورتیں زندگی کے لوازمات زیادہ پاؤگے دوسرے الفاظ میں تہذیب کی کشمکش زیادہ دیکھوگے۔ وہیں سامان بھی زیادہ اور مختلف قسم کا ہوگا۔ یہی کیفیت زبانوں کی بھی ہے۔ جہاں تمدنی۔ تہذیبی۔ اقتصادی۔ اخلاقی۔ مذہبی۔ اور سیاسی ضروریات زیادہ ہونگی۔ وہیں ذخیرۂ زبان بھی وافر پایا جائے گا۔ ضرورت کے ساتھ ہی زبان بھی ترقی کرتی ہے۔ جس گھر اور جس کنبے میں لیمونیڈ سوڈا واٹر وغیرہ کا استعمال ہی نہیں کیا جاتا اوس گھر میں ان الفاظ کا دخل ہی بہ مشکل ہو سکتا ہے۔ لیکن جس گھر لنبے میں ان کی مانگ ہے۔ وہاں ان کے متعلق ہر ایک لفظ پایا جائے گا۔

۷۸۶

۱۶ اگست [۱۹]ء

اجزائے زبان

زبان کی تفریق اور تقسیم عبارتی رنگ میں کئی ایک حصوں یا جزوں پر مشتمل ہے

اقسام ترکیبی یا اقسام تنظیمی

(الف) حرف۔

(ب) لفظ۔

(ج) جملہ۔

(د) فقرہ۔

(ہ) عبارت۔

یہ تقسیم لفظی پہلو سے ہے۔ جب تک چند حروف ترکیب نہیں دیئے جاتے تب تک لفظ نہیں بنتا۔ اور جب تک ایک لفظ سے زیادہ الفاظ ترکیب نہیں پاتے تب تک جملہ نہیں بنتا۔ اور جب تک چند جملے نہیں جوڑے جاتے۔ تب تک فقرہ نہیں بنتا۔ اور جب تک چند فقرات ترکیب نہ پائیں۔ تب تک عبارت نہیں بنتی

اصطلاح لسانی میں لفظ سے مراد وہ چند حروف ہیں۔ جو آپس میں ترکیب پاکر کوئی معنے پیدا کریں۔ یا ایک ایسی ترکیب میں آسکیں جو باوجود بے معنے ہونے کے بھی حروف کا ایک منضبط مجموعہ ہوں۔ جہاں ایسی ترکیب حروفی پائی جائیگی۔ اوس پر لفظ کا اطلاق ہوسکے گا۔ عام اس سے کہ اوسکے معنے ہوں یا نہ ہوں۔

بعض وقت حروف کے بھی معنے لئے جاتے ہیں۔ مگر اوسی صورت میں جب اونہیں ترکیبی ہیئت میں رکھا جائے۔ جیسے الف سے سید صاعین۔ سے فی الواقعہ مگر ایسا شاذ ونادر ہوتا ہے۔ جملہ سے مراد دو یا تین یا چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اور یہ شاذ ونادر ہی پانچ چھ الفاظ سے زاید ہوتا ہے۔ جیسے

،، وہ کہتا ہے۔

،، وہ جاتا ہے۔

،، وہ سنتا ہے۔

فقرہ سے وہ ترکیب مراد ہے۔ جس میں چند جملے ہوں۔

مثلاً۔

مجھے فی الواقعہ ایک گھوڑی کی ضرورت ہے۔

میں فی الواقعہ آپ سے خلوص رکھتا ہوں۔

اتفاق اور حقیقت ایک نعمت ہے۔

خلاف خیال سے معاندت نہیں ہونی چاہیئے۔

ہر قوم ہمت اور ارادہ ہی سے ترقی یاب ہوتی ہے۔

جس عبارت کے حصہ کا مطلب وضاحت کے ساتھ چند جملوں میں ختم ہو جاتے۔ وہ ایک فقرہ ہے۔ عبارت سے مراد وہ سلسلہ ہے جو چند الفاظ چند جملوں اور چند فقرات کا مجموعہ ہے۔ اور اوسکا کوئی اندازہ اور کوئی پیمانہ نہیں ہے چند جملوں یا چند فقروں پر بھی ختم ہو سکتی ہے۔ اور چند صفحات پر بھی عبارت سے مراد بیان اور تعبیر ہے۔ اگرچہ کیسی ہی مختصر اور طویل عبارت ہو۔ یا تو وہ ایک ہی حصہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور یا اوسکے چند حصے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ حصے مختصر ہوتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ذرا طویل ایک ہی مسلسل عبارت کے کئی ایک تعبیری حصے ہو سکتے ہیں۔ اور ہر حصہ دوسرے حصے سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ اور اوس کا مجموعی نتیجہ اخیر پر جا نکلتا ہے۔ اور کبھی ہر حصہ کے ساتھ ہی نتیجہ بھی ختم ہو جاتا ہے

اقسام تنزیہی

فصاحت اور بلاغت ایک فن ہے۔ اور اسکے قوانین اور ضوابط بھی اس فن پر ہر زبان ترقی یافتہ ہیں۔ مختلف پیرایوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہم نہیں چاہتے۔ کہ اون ضوابط اور قوانین کے نقطہ بحث کے تحت کچھ لکھیں ہم صرف طبعی رنگ یا طبعی اقتضاء کے پہلو سے صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں۔

حسن بیان۔ فصاحت اور بلاغت کی بنیاد خود انسان کی اپنی طبیعت

ہی سے پڑتی ہے۔ یا پڑی ہے۔ انسان طبعًا حسن بیان کا مشتاق اور منتظم کلام کا آرزومند ہے۔ اگرچہ کوئی انسان کیسا ہی محدود خیالات اور معمولی معلومات رکھتا ہو۔ پھر بھی اوس کا رجحان اور اوس کا میلان حسن بیان اور حسن کلام کی تلاش میں رہتا ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے قوانین اور بلاغت کے ضوابط وہی تو ہیں۔ جو انسان کی طینت سے متموج ہوتے ہیں۔ اور جنہیں ایک ضبط اور ایک ترتیب میں لایا گیا ہے۔ اور اون کا نام فصاحت اور بلاغت رکھا گیا ہے۔

اون مشہور اقسام بیان کے علاوہ جو فصاحت اور بلاغت کی کتابوں میں بیان ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل اقسام تعبیر بھی وہ ہیں۔ جو عام طور پر ایک ترقی یافتہ زبان کی خوبیوں میں داخل ہیں۔

(الف) شاعری۔

(ب) ضرب الامثال۔

(ج) محاورات۔

(د) فقرات جاذبہ۔

(ہ) اجزائے موثرہ۔

یہ اجزا ہر ترقی یافتہ اور جامع زبان کے وہ ریزے ہیں جنہیں ادبی اصطلاح میں جواہر کلام کہنا نازیبا نہیں۔ ان ہی پر زبانوں کی عمدگی خوبی موقوف ہے۔ اور ان ہی پر زبانوں کے کمال حسن کا مدار ہے۔ ان سب اجزا کا ترجمہ کھلے کھلے الفاظ میں (ہم کلامی اور تخاطب) ہے۔ انسان کا یہ بھی طبعی خاصہ ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے پر اثر ڈالنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ اور اثر ڈالنے کے واسطے ہم کلامی ہی ایک بڑا موثر ذریعہ ہے۔ اور اسکے موثر بنانے کے واسطے رفتہ رفتہ زبانوں میں ایسی صورتیں اور ایسے طریقے پیدا ہو گئے ہیں

جنہیں اپنے اپنے رنگ میں اپنے اپنے حدود میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ان میں
سے شاعری ایک ایسا چلتا طریقہ ہے۔ جو آج تک بہت ہی کامیاب ثابت ہوا
ہے۔ اگرچہ شاعری میں ایک ایسا حصہ بھی ہوتا ہے۔ جو بہ بعض وجوہ تعریف نہیں
کیا جا سکتا۔ مگر پھر بھی شاعری اور شاعروں نے جو کچھہ کرکے دکھایا ہے۔ اور اوس
سے ادبی دنیا کو جو رونق ہوئی۔ اور جو تاثیراتی سرمایہ ملا ہے۔ وہ بہت کچھہ مشکوری
کے قابل ہے۔ حسن بیان۔ تلخیص بیان تنقید بیان آداب بیان ایجاز بیان
میں جس خوش اسلوبی اور جس خوبی سے شاعری نے حصہ لیا ہے۔ وہ کسی اور
طریقہ نثر ہی کو نصیب نہیں ہوا۔ بیشک نثر ہی زبان کی جان اور ادبیات کی
روح ہے۔ لیکن جو رنگ شاعری نے پایا ہے۔ وہ کچھہ اور ہی ہے۔ نثر بھی ایک
ایسا ہی رنگ رکھتی ہے۔ مگر دوسرے رنگ میں شاعری سے دوسرے درجہ پر
ضرب الامثال ہیں۔ یہ بھی ایک شاعری کا حصہ ہے۔ جو ایک دوسرا رنگ رکھتا ہے
ضرب الامثال نے بھی اس دنیا میں بہت کچھ کرکے دکھایا ہے۔ گو شاعری کی طرح اوسے
وقعت حاصل نہیں۔ لیکن اوسکے تاثرات بلیغہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ
بہت کچھہ کام دیتی ہیں۔ لیکن ایک خاموشی اور متانت کے ساتھ تمثیلی رنگ
میں اون کی کارگذاری بہت کچھہ ہے۔ اور اوس سے انکار کرنا ادبی گناہ ہے۔ تیسرے
درجہ پر محاورات ہیں۔ محاورات ہی ادبیات زبان کی جان ہیں۔ یہ وہ سامان
زبان ہے۔ جو رفتہ رفتہ مختلف ہم کلامیوں سے مستنبط ہے۔ جسطرح ایک شعر
ایک ضرب المثل ایک تفصیل ایجازی رنگ میں بیان کرتی ہے۔ اسیطرح
ایک محاورہ بھی ایک تفصیل کا اختصار ہوتا ہے۔ محاورات کی یہ خصوصیت
ہے۔ کہ وہ اختصار کے ساتھہ اگلی پچھلی عبارت کو خوبصورت اور خوش آیند بنا
دیتے ہیں۔ اور اون تعبیرات فصاحت اور ارکان بلاغت کی یاد دلاتے ہیں۔

جو صدہا ہم کلامیوں کے بعد تنقیدی صورت میں انتخاب میں لائے گئے ہیں۔
محاورات کے بعد نثر میں فقرات جاذبہ کی نوبت آتی ہے۔ ایسے فقرات بھی
محاورات کی طرح رفتہ رفتہ ترکیب پاتے ہیں۔ نثر میں یہ اسطرح ہوتے ہیں۔ جیسے
ستاروں میں آفتاب اور چاندی و تانبہ میں سونا اور موتی و لعل۔
اجزائے موثرہ سے مراد اقوال مستند اور ملخصات محکمہ مراد ہیں۔ یہ بھی کمال اور
خوبی زبان کے واسطے ایک سندی خوبی رکھتے ہیں۔ محاورات۔ فقرات جاذبہ اور
اقوال موثرہ شاعری میں بھی بعض وقت کھپائے جاتے ہیں۔ جس سے شاعری
بھی ایک شاندار اضافہ کی مالک ہو جاتی ہے۔ اور دوسرے الفاظ میں یہ کہ شاعری
بھی بجائے خود چند محاورات یا ضرب الامثال ہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔

۷۸۶

۲۱ ستمبر ۱۹۶۳ء

(زبان اور لغات)

لفظ لغت کے معنے کسی قوم کے وہ الفاظ ہیں۔ جو اس میں بولے جاتے
ہیں۔ یا وہ الفاظ جو تقریباً غیر معروف ہیں۔ ہر ترقی یافتہ زبان لغات رکھتی ہے۔
یا ہر زبان میں لغات کا بنایا جانا۔ ترقی کا پہلا زینہ ہے۔ لغات کیا ہے۔
الفاظ کا وہ ذخیرہ جو کسی زبان میں بولے جاتے ہیں۔ الفاظ کا وہ مجموعہ جسے
ایک قوم اپنی زبان میں سے سمجھ کر بولتی ہے۔
الفاظ کا وہ ذخیرہ جن کے معانی ایک زبان میں تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یا
جن کے معانی پر استعمالی رنگ میں کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا۔
"لغوی معانی وہ ہیں۔ جو الفاظ کے وہی مطالب اور وہی مفہوم رکھتے ہوں۔

جو ایک سادہ یا ذاتی رنگ میں اون سے مخصوص ہے۔

،، اصطلاحی وہ معانی ہیں۔ جو تحت بعض اغراض قرار دئے جاتے ہیں۔

،، لغات میں عموماً وہی معانی درج ہوتے ہیں۔ جو عام طور پر ایک لفظ سے منسوب ہیں۔ کبھی کبھی وہ معانی بھی درج کیئے جاتے ہیں۔ جو کسی لفظ سے اعتباری رنگ میں خاصکر لیئے جاتے ہیں۔

،، صرف معانی ہی کا بیان کرنا۔ اور لکھنا ایک لغات نویس کے ذمہ ہمت پر نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یہ بھی کہ ایسے الفاظ کا تلفظ کس طرح کیا جاتا ہے پیش سے زبر سے۔ زبر سے۔ زیر سے۔ جزم سے اور کبھی کبھی وہ تلفظات بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جو اہل زبان میں مختلف فیہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ اس مقصد پر جداگانہ کتابیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ مگر بعض لغات میں ہی اون کا ایک بڑی حدتک بیان ہوتا ہے۔ اور جو لغت یا لغت نویس اس مقصد پر توجہ نہیں کرتا۔ وہ اپنے لغت کو غیر مکمل رکھتا ہے۔ یا ایسا لغت غیر مکمل ہوتا ہے۔

لغات میں مذکر اور مونث کی بحث بھی کی جاتی ہے۔ لیکن اس بحث کیلیئے بعض زبانوں میں جداگانہ راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ مقصد اور یہ بحث بجائے خود ایک خصوصیت اور طوالت چاہتی ہے۔ اور سادہ لغات یا صرف لغات اسکے متحمل نہیں ہوسکتے۔ اور خصوصاً اون لغات نویسوں کے واسطے یہ مرحلہ نہایت ہی تکلیف دہ ہے۔ جو کسی ایسی زبان کا لغت لکھتے ہیں۔ جو السنہ غیر کی بھی ایک بڑی حدتک محتاج ہو۔ جسکا اپنا یا ذاتی سرمایہ کم ہے۔ زبان اردو یا انگریزی کے بحث مذکر اور مونث ایک تکلیف دہ اور ژولیدہ بحث ہے۔ فارسی۔ عربی۔ بھاشا۔ سنسکرت۔ انگریزی الفاظ اپنی زبانوں میں کسی اور طرح بولے جاتے ہیں۔ اور اردو میں آکر اونکی تذکیر اور تانیث کا رنگ ،، کچھہ اور ہوجاتا ہے جس رنگ میں فرنچ

الفاظ اپنے اندرونی احاطہ میں بولے جاتے ہیں۔ وہ نقشہ انگریزی زبان میں آکر باقی نہیں رہتا۔ عموماً جب کسی ایک زبان میں دوسری زبانوں کے الفاظ مستعمل ہوتے یا رواج پاتے ہیں۔ تو عموماً اون کا تلفظ تذکیر اور تانیث اپنے اصلی رنگ میں باقی نہیں رہتی۔ عموماً وہ رنگ قبول کرتی ہے۔ جو منتقل الیہ یا غاصب زبان رکھتی ہے اردو زبان میں بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں۔ کہ جو عربی فارسی اور ہندی انگریزی میں کوئی اور رنگ رکھتے ہیں۔ اور اردو میں منتقل ہوکر اون کا تلفظ اور ان کی تذکیر اور تانیث کا کچھ اور نقشہ ہو جاتا ہے

لغات کی تین قسمیں ہیں۔

(الف) لغات رسمیہ۔

(ب) لغات اصطلاحیہ۔

(ج) لغات تاریخیہ

لغات رسمیہ تو وہ لغات ہیں۔ جن میں صرف وہی معانی لکھے اور بتاتے جاتے ہیں۔ جو ذاتی اور سادہ طور پر کسی ایک لفظ سے مختص یا منسوب ہیں۔ جیسے کہ ہر ایک زبان میں عام لغات ہوتے ہیں۔ لغات اصطلاحیہ وہ لغات ہیں۔ جن میں وہ معانی لکھے اور بتائے جاتے ہیں۔ جو چند اصطلاحات اور چند مسلّمات کے ماتحت گھڑ لیے گئے ہیں۔ جیسے الفاظ۔

علم۔ فن۔ فلسفہ۔ حکمت۔ نظر۔ تنقید۔ تقریظ۔ بحث۔ مناظرہ مشاہدہ۔ کون۔ فساد۔ کیمیا۔ مذہب۔ دُنیا۔ تحقیق۔ تفتیش۔ تدقیق حقیقت۔ صوفی۔ مراقبہ۔ مجاہدہ۔ معانقہ۔ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے الفاظ لغوی معنے تو کچھ اور رکھتے ہیں۔ اور اصطلاحی کچھ اور۔ لغوی معانی معانی مصطلحہ کے حامل نہیں ہوتے۔ لیکن مصطلحہ معانی ایک حد تک معانی لغوی

کے حامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ اصطلاحی وہ معانی ہیں۔ جو ایک خاص رنگ اور خاص بحث کی خاطر تکلفاً گھڑ لیے جاتے ہیں۔ یا یہ کہ لغوی معانی کی جو ایک خاص تاویل یا تمیز کی جاتی ہے۔ اور جو بایں حالات ایسی تاویل یا تعبیر ناگزیر ہوتی ہے۔ کیونکہ محض لغوی معانی سے کام نہیں چلتا۔ یا محض لغوی معانی وہ بات پوری نہیں کر سکتے۔ جو ایک غور کرنے یا ایک بحث کرنے والے کے واسطے باعتبار اپنے مقاصد اعلے یا مقاصد خاص یا اغراض علمیہ کے مہیا ہونے چاہیئے۔ لغات تاریخیہ وہ لغات ہیں۔ جن میں ایک بحث طلب لفظ کی تاریخ حقیقت اور کیفیت بھی بتائی جاتی ہے۔ مثلاً جب لفظ فلسفہ کی بحث چھڑتی ہے۔ تو ایسا لغات لکھنے والا بتاتا ہے کہ یہ لفظ فیلا اور سوف سے مرکب ہے۔ فلسفہ کیا ہے۔ اور کب سے اور کہاں پر اسکی بنیاد پڑی اور کون کون اس میں شہرت رکھتے ہیں۔ اور ایک قوم کے فلسفہ کو دوسری قوم کے فلسفہ سے کیسی اور کیا نسبت ہے۔

تار اور ریل یا ٹرین کے معانی بتاتے ہوئے اوس کا فرض ہے۔ کہ یہ بھی بتائے۔ کہ ان کا بانی کون تھا۔ اور کب ان کی بنیاد پڑی۔ اور ان کے جاری ہونے پر کیا کچھ وقوعات پیش آئے۔ برف کے معانی لکھنے کے وقت علمی رنگ میں جتانا پڑے گا۔ کہ برف کیا ہے۔ اور اسکی حقیقت کیا ہے۔ اور دنیا کے بعض مدبروں اور سائنس والوں نے اوس سے کیا کچھ کام لیا۔ اور ان کاموں سے دنیا والوں کو کیا فائدہ پہنچا۔

طب کا لفظ کیا معنے رکھتا ہے۔ اور اوس سے کیا کچھ مراد ہے۔ اور کیونکر انسان اس سے واقف ہوا۔ اور اسکا شروع کہاں سے اور کب سے ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ گیس۔ ہیڈروجن۔ نیٹروجن کیا ہیں۔ اور انکی حقیقت کیا ہے۔ اور کس زمانہ میں انہیں دریافت کیا گیا۔ اور کس نے کیا۔

فلسفہ انفرادی۔ اور اجتماعی کیا ہے۔ اور کون کون لوگ اور کس کس زمانہ میں اسکے اندر شہرت اور کمال رکھتے تھے۔

شعر کیا ہے۔ اور کس زمانہ میں اور کیونکر دنیا میں شعر بازی شروع ہوئی اور صحیح معنوں میں کون شاعر ہوسکتا ہے۔

شاعر کون ہے۔ اور متشاعر کون ہے۔

تاریخ کیا ہے۔ اور کب سے وہ لکھی شروع ہوئی۔

زمانہ کیا ہے۔ اور اوس سے کیا مراد ہے۔

بڑے بڑے شہر اور بڑے بڑے دریا دنیا میں کہاں کہاں اور کون کون ہے بالفاظ دیگر ایسی تاریخ لغات گویا ایک انسکلو پیڈیا یا ایک دارۃ المعارف ہوتا ہے اسی قسم کی بحثیں اور تفصیلات لغات تاریخیہ میں کی جاتی ہیں۔

رسمی لغات میں تین قسم کے الفاظ درج ہوتے ہیں۔

" جو عام بول چال میں آتے ہیں۔

" جو خواص کی بول چال میں آتے ہیں۔

" جو تصانیف اور تو الیف میں لائے جاتے ہیں۔

تیسری قسم کے الفاظ سے عموماً وہی لوگ واقف ہوتے ہیں۔ جو اونہیں تصنیف اور تالیف میں لاتے ہیں۔ اور بعض ایسے الفاظ ہی ہیں جن سے استعمالی رنگ میں بعض مصنفین اور مؤلفین ہی کم واقفیت رکھتے ہیں۔ ایسے الفاظ عموماً مغلق اور سنگین الفاظ کے نام سے تعبیر پاتے ہیں۔

جب ایک سیاست دان اور ایک فلاسفر یا ایک حکیم ایک سیاسی یا ایک نصاب سیاست یا ایک قانون سیاست یا ایک قانون حکمت وضع کرتا ہے۔ تو اوسے اپنے بیان اور ایسے ضابطے کے واسطے معانی عامہ کے مقابلہ

میں اون اعلےٰ اور اخصّ معانی کی ضرورت پڑتی ہے - جو لغات رسمی میں نہیں ہوتے ہیں - چونکہ ایسے رسمی معانی بوسعت کام نہیں دے سکتے - ناچار اوسے وہی رسمی معانی ایک حد تک مدنظر رکھکر اونہیں ایک خاص رنگ میں لے جانا پڑتا ہے اور ایسی تاویل اور تعبیر سے وہ اپنا کام نکالنے میں کامیابی خیال کرتا ہے - اور اس طریق عمل سے اوسکا کام بہت کچھ یا ایک سہولت کیساتھ نکل ہی جاتا ہے جس قدر ایسے اصطلاحی معانی بعض رسمی معانی کے بالمقابل وضع کیے گئے ہیں - اونکے مقابلہ سے پتہ لگ سکتا ہے - کہ رسمی معانی یا محض لغاتی معانی وہ باتیں نہیں پوری کرسکتے تھے - جو اصطلاحی معانی کی بدولت نکلتی ہیں - اصطلاحی معانی میں باعتبار مقاصد زیر بحث کے ایک کافی وسعت ہوتی ہے - اور رسمی معانی میں یہ بات نہیں ہوتی - رسمی معانی صرف عام بول چال اور عام کاروبار زندگی کا ہی کام دے سکتے ہیں - مراحل علمی میں ان سے عموماً کام نہیں لیا جاسکتا - کیونکہ اون میں وہ وسعت نہیں ہوتی - جو علمی رنگ میں ضروری ہوتی ہے - علمی رنگ میں اون سے بعض اغراض کے تابع توڑ پھوڑ کر کام لینا پڑتا ہے - اور معمولی کاروبار میں ایسی باتیں عموماً نظرانداز کی جاتی ہیں - مثلاً جب ہم لفظ تنقید - نظر - تحقیق - اور تفتیش عام کاروباری زندگی میں بولیں گے - تو ان کی بابت مزید بحث اور کسی تفصیل کی ضرورت نہیں پڑے گی - بعض وقت تو یہ خیال ہی نہ رہے گا - کہ کون کون سے لفظ بولے گئے ہیں - لیکن جب علمی پہلو مدنظر رکھکر ایسے الفاظ اطلاق پذیر ہوں گے - تو اوسوقت کچھ اور ہی کیفیت ہوگی -

جب زید بکر کو عام کاروبار میں یہ کہے گا - کہ اوپر نظر تو کرو - تو اسکا مفہوم محض ایک معمولی مفہوم ہوگا - لیکن جب وہی زید علمی رنگ میں نظر کا لفظ اطلاق کرے گا - تو اس میں ایک ایسی وسعت پیدا ہوجائے گی - کہ اسی لفظ (نظر) پر ایک

مستقل کتاب ہی لکھی جاسکتی ہے۔ اور جب نظر اور تنقید میں فرق جتایا جائے گا تو بحث کا کچھ اور ہی رنگ ہو جائے گا۔ لوگ دن میں کئی دفعہ لفظ تحقیق اور تفتیش بولتے ہیں۔ لیکن جب یہی دو لفظ عدالتوں کے کمروں میں بولے جاتے ہیں۔ تو ان کی وسعت کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔ پولیس والے کبھی تحقیق کا لفظ رپورٹ ضمنیوں میں نہیں لکھینگے تفتیش ہی لکھینگے۔ ایک مجسٹریٹ جب کوئی استغاثہ زیر دفعہ ۲۰۲ ضابطہ فوجداری کسی دوسرے کے پاس بھیجے گا۔ تو ہمیشہ لفظ تفتیش لکھیگا۔ اسیطرح تصور اور تصدیق کے الفاظ عام کاروباری زندگی میں کچھ اور مفہوم رکھتے ہیں۔ اور جب منطق اور فلسفہ وحکمت میں ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ تو کچھ اور معنے ہو جاتے ہیں۔ تصور و تصدیق کی بحثوں پر لکھنے والوں نے اب تک صدہا صفحے لکھ ڈالے ہیں۔

جزی اور کلی دو سادے سے لفظ ہیں اور عام کاروباری زندگی میں ان کا اطلاق ہمیشہ سادہ طور پر ہی رہتا ہے۔ لیکن جب انکی بحث منطق میں ہوتی ہے۔ تو ان کا رنگ اور وسعت کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

تعجب اور حیرت بھی دو ایسے لفظ ہیں۔ کہ عام معمولات میں ان کا اطلاق ہمہ رنگ ہوتا ہے۔ لیکن جب فلسفہ میں ان کی بحث چھڑتی ہے۔ تو یہی فلسفہ کا شروع اور فلسفہ کی روح و روان اور خاتمہ ثابت ہوتے ہیں۔ شب و روز انسان سو دفعہ لفظ انسان کا بولتا ہے۔ لیکن جب ایک علمی پہلو سے یہ لفظ زیر بحث آتا ہے۔ تو اسکی تشریح کیواسطے بڑی بڑی کتابوں اور ملفوظات کی ضرورت پڑتی ہے۔ حافظہ ہر شخص رکھتا ہے۔ اور روزانہ اس سے کم و بیش کام بھی پڑتا ہے۔ لیکن جب علمی رنگ میں حافظہ کی بحث کرتے ہیں۔ تو یہ بھی ایک مشکل باب کھلتا ہے۔

ہر گھڑی ہم کسی نہ کسی خیال میں مبتلا اور مصروف رہتے ہیں۔ اور ہر گھڑی خیال کا ذکر ہوتا ہے۔ لیکن جب علمی رنگ میں خیال پر روشنی پڑتی ہے۔ تو کچھ اور ہی سماں ہوتا ہے۔ روز دل اور ضمیر کا ذکر ہوتا ہے۔ اور ہمیں ان الفاظ کے اطلاق سے کچھ بھی تعجب نہیں ہوتا۔ اور نہ کوئی مشکل پڑتی ہے۔ لیکن جب علمی رنگ میں دل اور ضمیر کی بحث کرتے ہیں۔ تو ہم اُن مشکلات میں پھنس جاتے ہیں۔ کہ جنکا اکثر حصہ اب تک بھی حل نہیں ہوا ہے۔ جسطرح انسان ظاہری باطنی کیفیت رکھتا ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ کی بھی دو کیفیتیں ہوتی ہیں۔ ظاہری اور باطنی ظاہری حالت سے ایک کاروباری حالت مراد ہے۔ اور باطنی سے ایک علمی کیفیت جسطرح انسان خود ترقی کرتا جاتا ہے۔ اسی طرح اوسکے تحت ادراکات الفاظ نے بھی رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ وہی زبان ترقی یافتہ یا علمی کہی جاسکتی ہے جس میں اس قسم کے الفاظ کا ذخیرہ وافی اور کافی ہو۔ اور ضرورت پر مانگ تانگ کی نوبت نہ آئے۔ اور علمی رنگ میں کساد بازاری نہ ہو۔

(اصطلاحات)

اصطلاحات ہمیشہ اولتی بدلتی اور بنتی رہتی ہیں۔ کیونکہ جوں جوں زبان کے مقابلہ میں نئے نئے مقاصد اور نئی نئی ضروریات نشو و نما پاتی ہیں۔ دوں دوں مرادی معانی کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اصطلاحات کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) مفردہ۔

(ب) مرکبہ۔

بعض دفعہ ایک مفرد لفظ ہی ایک اصطلاح کا کام دے جاتا ہے۔ جیسے نظر اور تنقید اور بعض دفعہ کسی مزید ترکیب کی ضرورت پڑتی ہے جیسے علم النفس والقوائے

وغیرہ وغیرہ - جسطرح الفاظ ترک ہوتے رہتے ہیں - اسی طرح اصطلاحیں بھی ترک ہوتی رہتی ہیں - کیونکہ حقائق اور کیفیات کی بابت ہمیشہ ایک نئے رنگ سے بحث ہوتی ہے - اور اس صورت میں ضرورت ہوتی ہے - کہ اصطلاحات میں بھی تبدیلی کی جائے - اور وہ نیا پہلو اختیار کیا جائے - جو زیادہ تر روشن اور مفید ہو -

اصطلاح کیا ہے - ایک خلاصہ بعض قراریافتہ صور اور مطالب و اغراض کا یا ایک نقش آیندہ عنوان یا ایک مختصر سادہ یا پیچیدہ اصطلاح روشن اور مفید ہوتی ہے جو اپنے اندر باعتبار ایک علمی بحث کے بجائے خود ایک جامعیت اور وضاحت رکھتی ہو - نئی اصطلاحات کا بنانا اگرچہ گونہ مشکل رکھتا ہے - مگر جب کسی زبان میں علمی مطالب کے بیان کی ضرورت پڑتی ہے - تو اصطلاحات یا تو خود وضع کی جاتی ہیں - اور یا دوسری زبانوں سے لی جاتی ہیں - دونوں صورتوں میں زبانیں بہ علمی پہلو ترقی پذیر ہوتی ہیں -

---

۲۸۶

۲۳ ستمبر ۱۶ء

املا

ہر زبان میں الفاظ کے لکھنے یا الفاظ کی ترکیب کا طرز جیسے جداگانہ ہے ایسے ہی رسم املا بھی جداگانہ ہے۔ بعض زبانوں کی رسم املا آپس میں ایک بڑی حد تک ملتی جلتی ہے۔ اور بعض کی مختلف ہے۔ جو زبانیں آپس میں زیادہ تر ملتی ہیں۔ یا جن کی ابجدیں ایک ہی طرز رکھتی ہیں۔ ان کی رسم املا بھی ایک ہی ہے۔ اور جن زبانوں کی ابجدوں اور رسم تحریر میں فرق ہے۔ ان کی رسم املا بھی جداگانہ ہے۔

املا سے یہ مراد ہے۔ کہ کسی زبان میں کوئی لفظ کس کس حرف کیساتھ لکھنا چاہیئے یا اوسکے تلفظ میں کون کون سی حرکات اور کتنے ... اور کون کون سے حروف لانے چاہیئے۔ اصطلاحی رنگ میں املا سے مراد ہر ایک زبان کی رسم الخط سے ہے۔

دنیا میں جسقدر زبانیں اسوقت بولی جاتی ہیں۔ اون کے لکھنے کے تین طریقے ہیں۔

(الف) دائیں ہاتھ سے بائیں کو۔

(ب) بائیں سے دائیں کو۔

(ج) اوپر سے نیچے کو۔

جو سامی زبانیں کہی جاتی ہیں۔ اون میں سے عربی زبان دائیں سے بائیں ہاتھ لکھی جاتی ہے۔ اور عبرانی زبان بائیں سے دائیں کو فارسی زبان عربی زبان سے الحاق نہیں رکھتی۔ بلکہ سنسکرت برثانی ژند زبان سے لیکن وہ بھی عربی ہی کی طرح لکھی جاتی ہے۔ سنسکرت۔ جرمن۔ فرنچ۔ انگریزی وغیرہ تمام زبانیں

بائیں سے دائیں ہاتھ لکھی جاتی ہیں۔ اردو زبان عربی و فارسی کی رسم الخط رکھتی ہے
رسم الخط دو قسم پر ہے۔

(۱) رسم الخط متعلق بہ طرز تحریر۔

(۲) رسم الخط متعلق بہ ترکیب حروف۔

اردو دوسری قسم سے وابستہ ہے۔ بعض زبانوں میں جو بعض حروف بعض الفاظ سے مخصوص ہیں۔ وہ محض ایک اعتباری رنگ میں ہیں۔ مثلاً عربی زبان میں الفاظ سرف۔ صرف۔ غرض۔ وعظ۔ رتبہ۔ رابطہ۔ امر عمر۔ نظم۔ نزول۔ نظر جو مختلف حروف سے لکھے جاتے ہیں۔ یہ محض اعتباراً ہے۔ اور بعض زبانوں میں تلفظ کی ثقالت۔ خفت۔ نسبت۔ اور خشونت کی وجہ سے بھی بعض حروف بعض الفاظ سے مخصوص ہیں۔ مثلاً سرف اور صرف کا اگر صحیح تلفظ کیا جائے۔ تو س اور ص کی آواز میں ضرور کچھ نہ کچھ فرق نکلے گا۔ اس قسم کے تلفظی اور صوتی امتیازات اور آوازوں سے رفتہ رفتہ رسم الخط یا املا میں فرق ہوتے ہوتے ایک قاعدہ قرار دیا گیا۔ کہ سرف س سے لکھا جاوے۔ اور صرف ص سے اور یہ فرق ایک باریک فرق ہے۔ بولنے میں ان کا بہت کم فرق معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ املائی رنگ میں مختلف الفاظ کے معانی میں فرق ہو جاتا ہے۔ اس واسطے اب جہاں خلاف رسم املا کوئی لفظ عربی۔ فارسی اور اردو زبانوں میں لکھا جاتا ہے۔ وہاں معانی اور مطالب میں بھی فرق آجاتا ہے۔

اگرچہ طرز عبارت اور سلسلہ مضمون سے بعض وقت پڑھنے والے غلط املائی حالت میں بھی صحیح مطلب نکال لیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی گونہ وقت ہوتی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو یہ املائی گورکھ دھندا بہت کچھ اعتباری

رنگ رکھتا ہے۔ اور بعض زبانوں کی پیچدگی کا موجب بھی ہو رہا ہے۔ بعض وقت بعض لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ عربی ابجد کے متحد الصوت حروف کی وجہ سے املائی رسم بہت کچھ پیچیدہ اور تکلیف دِہ ہو رہی ہے۔ اونہیں ہر زبان کے املائی طرز اور املائی رسم دیکھنے کے بعد یہہ یقین ہو جائے گا۔ کہ قریبًا ہر زبان میں ایسی ہی مشکلات موجود ہیں۔ مثلاً انگریزی میں بھی سپلیل کا طریقہ ایسا تکلیف دِیہہ ہے۔ کہ بعض وقت اچھے اچھے ماہر انگریزی دان بھی رہ جاتے ہیں۔ بعض الفاظ میں چھ۶۔ سات۷۔ آٹھ۸۔ نو۹۔ حروف لکھے جاتے ہیں۔ اور پڑھنے میں صرف تین۳ چار۴ اور پانچ۵ آتے ہیں۔ بعض حروف کا تلفظ کچھ اور ہوتا ہے۔ اور لکھنے کے بعد کچھہ اور آواز دیتا ہے۔ اس املائی اختلاف سے یہ بھی پتہ لگ گیا۔ کہ زبانوں کے اختلافات باہمی محض مختلف ممالک اور ماحول میں رہنے کی وجہ سے ہیں۔ ورنہ سب زبانیں ایک ہی ماخذ رکھتی ہیں۔ اور اون سب میں ایک اتصال اور اتحاد ہے۔ جو کوئی ایک زبان املائی مشکلات رکھتی اوس قسم کی مشکلات دوسری زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

املائی رسوم یا املائی قیود کا اثر ہر زبان میں معانی الفاظ پر خصوصیت سے پڑتا ہے۔ گویا ایک طرح سے بعض معانی قیود املائی کے تحت ہیں مثلاً سرف اور صرف اوس حالت میں صحیح معانی دے سکتے ہیں۔ جب سرف (س سے) اور صرف (ص سے) لکھا جائے۔ اگر اسکے خلاف ہو جائے۔ تو دونوں کے معانی میں اُلٹ پلٹ ہو جائے گا۔ دیکھو اس قید اعتباری کی وجہ سے معانی میں کسقدر فرق آنے کا اندیشہ ہے۔ اس سے ثابت ہے۔ کہ اکثر اعتباری صورتیں اور اعتباری قیود رفتہ رفتہ تعین کا درجہ پا لیتے ہیں۔ اور بولنے والے اونہیں ایک حقیقت پر محمول کرنے لگتے ہیں

رسوم املائی وجہیں مندرجہ ذیل ہو سکتی ہیں:

(الف) امتیاز صوت۔

(ب) حسن صوت۔

(ج) تدریجی عمل تحریر۔

(د) مفروضہ ترکیب حروف۔

ہر قید املائی کی وجہ یہی چار یا ان ہی چاروں میں سے کوئی نہ کوئی ہوگی۔ قیود املائی رفتہ رفتہ ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ زبانوں کا املا جو اسوقت پایا جاتا ہے۔ یہ منجا منجایا ہے۔ مدتوں کے بعد اسکی یہ صورت بنی ہے۔ پرانی کتابیں اور پرانی تحریریں دیکھنے سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ کہ ابتدائی صورتیں اور قیود املا کیا تھیں۔ جرمن میں ایک کتاب قرآن مجید کے رسم الخط کی آٹھ سو سال گذشتہ کی بابت چھپی ہے۔ اوس سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ شروع میں کس کس رسم خط کے ماتحت قرآن لکھا جاتا رہا ہے۔ ہر زبان میں جو خطوط کی مختلف قسمیں مروج ہیں۔ اون سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ رفتہ رفتہ رسم الخط ترقی پاتی رہی ہے۔ اور رفتہ رفتہ قیود املا میں بھی تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اب تک بعض زبانوں میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں۔ کہ جو دونوں طریقوں سے لکھے جاتے ہیں۔ مثلاً اردو میں ہی .. ۔ دیکھو۔ بعض کے نزدیک (ذ) سے ذرا صحیح رسم الخط ہے۔ اور بعض کے خیال میں (ز) سے ذرا لکھنا چاہیئے۔ اسی طرح بعض اور الفاظ کی رسم الخط یا ترکیب حروفی میں بھی اختلاف ہے۔

حرکات تلفظ

قیود املا کی طرح ہر زبان میں تلفظی حرکات میں بھی اختلاف ہے۔ ان حرکات کا نام دوسرے الفاظ میں موٹے طور پر۔ زبر۔ زیر۔ پیش رکھا گیا ہے۔ ہر

زبان کے الفاظ پر ان تین حرکات زبر۔ زیر۔ اور پیش کی حکومت ہے۔ کوئی سی زبان لے لو۔ اوسکے لفظ یا تو زبر سے متلفظ ہوں گے۔ اور یا زیر یا پیش سے اور یہ حرکات سہ گانہ عموماً شروع وسط اور اخیر اجزا کو محتوی ہوتی ہیں۔ ان تین حرکات کے سوائے ایک اور حرکت بھی ہے۔ جسکا نام شد ہے۔ شد کا عمل جداگانہ ہوتا ہے۔ وہ ان سہ گانہ حرکات کی مبطل یا مزیل نہیں ہوتی۔ بجائے خود عامل ہے۔ اسکے ساتھ ہی ایک پانچویں قسم جزم اور سکون کی بھی ہے۔ وہ بھی جداگانہ عمل کرتی ہے۔ کسی دوسری صورت کے مخل نہیں ہوتی۔

مثلاً۔ کِشتی بالفتح کُشتی بالضم۔ کفایت بکسر کفر بالضم۔ کفور بہ ضمتین کلفت بہ ضمتین وسکون و فا۔ کالونت بفتح اول۔ و لون وفتح واو۔ مدفع مدغم بالضم و بالشد۔ وغیرہ وغیرہ۔

حرکات تلفظ کا زیادہ تر مدار سماعت اور صوت پر ہے۔ جسطرح الفاظ سُننے میں آتے رہے اور جیسے جیسے اہل زبان بولتے رہے۔ اونہیں کے مطابق حرکات بنائی گئیں۔ اور ان حرکات سہ گانہ یا شد یا جزم وسکون کا مدار بھی زیادہ تر صوت پر ہی ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کِشتی بولتے ہیں۔ تو اوسوقت ہمارے منہ اور منہ کی حرکت کی کچھ اور شکل ہوتی ہے۔ اور جب بالضم کُشتی کہتے ہیں۔ تو اوسوقت ہمارے منہ کی شکل کچھ اور ہو جاتی ہے۔ جب ہم کفایت کا لفظ منہ سے نکالتے ہیں۔ تو اوسوقت منہ کی شکل اور کشادگی و بندش کچھ اور رنگ رکھتی ہے۔ اگر ہر لفظ کے بولنے کے وقت انسان کے منہ کی شکل کا فوٹو لیا جائے تو بآسانی پتہ لگ جائے گا۔ کہ ہر لفظ کے بولنے کے وقت منہ کی شکلیں کیسی مختلف ہوتی ہیں۔

ان اشکال دہانی ہی سے یہہ زیرَ۔ زبرَ۔ پیشُ۔ جزمْ۔ سکونْ اور شدّ

کی بنیاد پڑی ہے۔ مثلاً جب انسان لفظ مرغ بولتا ہے۔ اور اسکے ساتھ ہی مدغم کہتا ہے۔ تو دونوں حالتوں میں منہ کی شکل مختلف ہوتی یا مختلف بن جاتی ہے

اگرچہ یہ حرکات اور زیر و زبر اور پیش وغیرہ ایک ہی حد تک اعتباری ہی ہیں۔ مگر انہیں ایک حالت میں باعتبار اشکال دہانی طبعی بھی کہا جاسکتا ہے اور پھر بھی یہ کہنا ہی پڑے گا۔ کہ

اگر ہم کشتی کا تلفظ بجائے بالفتح کے بالضم اور کشتی کا بجائے بالضم کے بالفتح بولنے یا لکھنے کے عادی ہوتے۔ تو کوئی دقت نہ ہوتی۔ اور رفتہ رفتہ یہی تلفظات صحیح مانے جاتے۔

اگر زیرَ و زبرَ و پیشُ و جزمْ و سکون و شدّ کے بولنے کے وقت ہم انسان کو بولتے سنیں اور غور سے کام لیں۔ تو ہمیں پتہ لگ جائے گا۔ کہ جسطرح حروف کی بنیاد اور ترکیب منہ اور زبان ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ اوسیطرح زبر و زیر وغیرہ کی بنیاد بھی دہانی حرکات ہی ہیں۔ مثلاً

کونَ۔ کیاَ۔ توُ۔ کیِ۔ زیدَ۔ اور مبرّا بولنے کیوقت غور سے دیکھوگے۔ تو منہ کی شکل سے بھی پیش زبر زیر شدّ کا پتہ لگتا جائے گا۔ لفظ کون کے بولنے سے حلق کا اوپر کا حصہ حرکت کرتا ہے۔ کیا کے بولنے سے ایک ہموار سی صورت صورت پذیر ہوتی ہے۔ کی سے واقعی ایک زیریں حرکت کا اظہار ہوتا ہے۔ مبرا کے بولنے سے منہ اور زبان کی حقیقت ہی مشدّد ہو جاتی ہے۔

فتدبر

۲۸۶

۲۴ مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

امین اور غاصب زبانیں

عملی اعتبارات کے ماتحت زبانوں کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) لسان امین۔

(ب) لسان غاصب۔

امین وہ زبان ہے۔ جو دوسری زبانوں کے الفاظ لے کر اون کی شکل ہیئت اور اونکے تلفظ میں عموماً سوائے چند مستثنیات کے دست اندازی نہیں کرتی۔ نہ تفرس ہوتا ہے۔ نہ تعرب دنیا بھر کی زبانوں میں کسی نہ کسی حد تک خاصۂ امانت پایا جاتا ہے۔ لیکن امین زبان وہی زبان کہی جائے گی۔ جس کا عمل کثیر موید امانت ہو۔ شاذ و نادر تصرفات معانی میں ہوتے ہیں۔ کیونکہ کبھی وہ عمداً ہو جاتے ہیں اور کبھی ایک عام استعمال کی وجہ سے اور کبھی عدم احتیاط تلفظ سے انسانی زبانوں میں اول درجہ پر اردو دوئم درجہ پر فارسی امین زبانیں کہی جا سکتی ہیں ان دونوں زبانوں میں جب دوسری زبانوں کے الفاظ منتقل ہوتے ہیں۔ تو وہ اپنی اصلی ہیئت نہیں چھوڑتے۔ یا اون کی اصلی ہیئت اور اصلی تلفظ میں کوئی تصرف نہیں کیا جاتا۔ فارسی زبان میں تو گاہ گاہ ایسا تصرف ہو بھی جاتا ہے۔ اردو زبان میں بہت ہی شاذ و نادر ایسی صورتیں آئی ہے۔ اسوقت اردو زبان میں جسقدر الفاظ عربی۔ فارسی۔ سنسکرت۔ بھاشا۔ اور انگریزی کے کھپ چکے ہیں

اور جو ایک بڑی حد تک لکھے اور بولے جاتے ہیں - اون میں کسی قسم کا تصرف بھی روا نہیں رکھا گیا - نہ تو اون کے ... تلفظ میں فرق آیا ہے - اور نہ شکل و ہیئت میں جس طرح وہ اپنی زبانوں میں بولے اور لکھے جاتے تھے ویسے ہی اب بھی معمول ہے - یہ جدا بات ہے - کہ بعض الفاظ عام لوگوں کی زبان سے کسی قدر غلط بولے جاتے ہوں - یا کوئی لکھنے والا اونہیں غلط لکھ دیتا ہو - ورنہ اپنی اصلی ہیئت میں ہو بہو اون کا استعمال ہوتا ہے - عموماً الفاظ ذیل انگریزی کے اپنی ہی صورت میں لکھے اور پڑھے یا بولے جاتے ہیں -

ٹرین - پلیٹ فارم - ٹکٹ - سنگلر - سنگل - ڈبل - فارم - گراس فارم - جج - مجسٹریٹ - وارنٹ - سمن - کورٹ - ڈپٹی کمشنر کمشنر - فنانشل کمشنر - سوسایٹی - سوشل - فیشن - ریفارم - ریفارمین میٹنگ - لیکچر - وار - کانگریس - لیگ - جنرل - سپیشل - ایکسپریس - ڈون اپ - ڈاکٹر - ہیڈ کلارک - ہیڈ کنسٹبل - سب انسپکٹر - سپرنٹنڈنٹ - ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ - انسپکٹر جنرل - وغیرہ وغیرہ یہ سب الفاظ اپنی اصلی صورت اصلی تلفظ باقی رکھ کر پڑھے لکھے اور بولے جاتے ہیں - میری رائے میں یہ بات کسی زبان کیواسطے ایک بڑی خوبی کی بات ہے - اس صورت میں مشتقات کی طرف نہیں جانا پڑتا جیسے کہ انگریزی زبان میں جانا پڑتا ہے - انگریزی زبان ساری دنیا کی زبانوں سے بڑھ کر غاصب اور ہادم الفاظ ہے - انگریزی زبان غیر السنہ کے الفاظ کا امانت کے ساتھ خیر مقدم کرہی نہیں سکتی - اوس میں جو لفظ منتقل ہوتا ہے - توڑ مروڑ کر استعمال پاتا ہے - نہ تو اوسکی شکل و ہیئت باقی رہتی ہے - اور نہ اوسکا تلفظ صحیح رہتا ہے - کثرت استعمال سے اوسکی حقیقت بگڑ جاتی ہے - اور کچھ پتہ نہیں لگتا - انگریزی زبان میں صدہا الفاظ دوسری زبانوں کے کہپا ہیے

گئے ہیں۔ اون میں سے شاید دو چار ہی اپنی اصلی صورت اور اپنے اصلی تلفظ کے مطابق استعمال پاتے ہوں۔ ورنہ سب کی کایا پلٹ ہو چکی ہے عربی اور سنسکرت زبان میں ہی غیر السنہ کے جو الفاظ منتقل ہوتے ہیں۔ اون کا تلفظ اون کی اپنی شکل و ہیئت بھی کسی حد تک قائم اور ثابت نہیں رہی۔ پڑھنے لکھنے اور بولنے میں ایک اچھا تصرف کر لیا جاتا ہے۔ اسکی زیادہ تر وجہ یہ ہے۔ کہ ایسی زبانوں کے بولنے والے اصلی تلفظ کی حالت میں ایسے الفاظ غیر السنہ کا تلفظ کرنے سے عاری ہوتے ہیں یا کبھی کبھی خواہ مخواہ توڑ مروڑ کر بولتے اور لکھتے ہیں۔ ایسی زبانیں غاصب زبانیں ہیں اور ان کی قوت ہاضمہ بہت کم اور معمولی ہوتی ہے۔ وہ اصلی صورت میں غیر السنہ کا کوئی لفظ بھی ہضم نہیں کر سکتیں اور نہ اُن میں مواد بیرونی ایک خوبی کے ساتھ کھپ سکتا ہے۔ یہ ایک نقص ہے۔ لیکن باوجود اس نقص اور کمی کے ہی ایسی زبانیں اسواسطے ترقی یافتہ اور جامع ہیں۔ کہ وہ الفاظ غیر کے لینے اور کھپانے سے پرہیز نہیں کرتیں جو بجائے خود ایک وصف ہے۔ بعض زبانیں ہی عربی زبان کے خود اپنا ہی اسقدر ذخیرہ الفاظ رکھتی ہے۔ کہ اونہیں بہت کم دوسری زبانوں سے مدد لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی طرح سنسکرت بھی ایک وسیع اور جامع زبان ہے۔ لیکن ان دونوں زبانوں میں ہی غیر زبانوں کے الفاظ منتقل ہو کر اپنی اصلی ہیئت چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

۲۸۶

کلاسیکل زبانیں

دنیا میں سات (۷) مندرجہ ذیل ایسی زبانیں ہیں۔ جنہیں (کلاسیکل) زبانیں کہتے ہیں۔

(۱) سنسکرت۔

(۲) عربی۔

(۳) عبرانی۔

(۴) ژند۔

(۵) یونانی۔

(۶) لاطینی۔

(۷) فرینچ۔

یہ ہر سات زبانیں پرانی زبانیں ہیں۔ اور یہ وہ زبانیں ہیں۔ جو پرانے زمانوں یا شروع کے زمانوں میں علوم وفنون کا ذخیرہ اور ادبیات کا مخزن رہ چکی ہیں۔ یا جن میں سے موجودہ دوسری زبانوں نے بہت کچھ لیا ہے۔ یا یہ ایسی پرانی زبانیں ہیں۔ جو دنیا کے اقطاع اعظم میں بولی جاتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اون میں سے بعض زبانیں مقابلتاً مثل سنسکرت۔ عبرانی۔ ژند کے اوس حالت کو پہنچ گئیں۔ جو اونہیں اب حاصل ہے۔ یا یہ کہ اون کی شہرت اور گرم بازاری رفتہ رفتہ سرد پڑتی گئی۔

ان میں سے بعض زبانیں مثلاً سنسکرت۔ ژند یونانی لاطینی۔ فرنچ ایک سلسلہ میں اور عربی و عبرانی دوسرے سلسلہ میں ایسی زبانیں ہیں۔ کہ جن کا ماخذ ایک ہی ہے یا اون کا ایک دوسری زبان کے ساتھہ ایک ہی رشتہ ہے۔ یا یہ کہ اُن سب کا اپنے اپنے سلسلہ میں ماخذ ایک ہی ہے۔ ان میں سے بعض زبانیں مثلاً سنسکرت ژند یونانی لاطینی اور فرنچ ایک ہی سلسلہ میں ہونے کی وجہ سے ایرین زبانیں اور عربی و عبرانی وغیرہ سماطیعی زبانیں کہلاتی ہیں۔ ایرین زبانوں کے بولنے والے سامی اور تورانی نسلوں سے الگ تھے۔ یہ کہا جائے گا۔ کہ دونوں قسم کی زبانوں کے بولنے والے شروع میں ایک ہی جگہ یا ایک ہی خطہ میں رہتے تھے۔ اور اون کا خاندان کہنہ اور اون کے اباو اجداد ایک ہی نسل سے تھے۔ یا یہ کہ اونکا مورث اعلےٰ ایک ہی تھا۔

یہ بحث ہمیشہ دل چسپی سے پڑھی جاتی اور مختلف فیہ بھی ہے۔ کہ دنیا کی کل یا موجودہ انسانی نسلوں اور انسانی ذریات کا مورث ایک ہی ہے۔ یا ایک ہی ہونا چاہئے۔ یا یہ کہ انسانی موجودات مختلف مورثوں کی اولاد ہے۔ اور اون مختلف مورثوں کا زمانہ بھی مختلف تھا۔ مذہبی نقطہ خیال سے۔ خواہ کسی مذہب کو مدنظر رکھہ کر سوچو۔ تو کل انسانی ذریات کا مورث اعلےٰ ایک ہی تھا۔ چاہے آدم علیہ السلام ہو۔ اور چاہے برہما وغیرہ وغیرہ۔

اگر مسٹر ڈاروِن کی تھیوری لی جائے۔ تو پھر بھی ایک ہی سلسلہ سے انسان کا بتدریج ارتقائی ترقی کرنا پایا جاتا ہے۔ جو لوگ اسپر زور دیتے ہیں کہ انسان کے مورث جداگانہ تھے۔ وہ ایک ایسی دلیل کے زور پر اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ دراصل جو ثبوت زیادہ تر فرضی رنگ رکھتا ہے۔ چند خصوصیتیں یا چند اختلافات لے کر ایک بات یا ایک واقعہ کا ثابت کرنا کبھی یقینی نہیں ہوسکتا

بعض کے خیال میں بندر سے رفتہ رفتہ انسان بنا ہے - یہ ایک ایسی ہی دلیل
یا ایسا ہی استدلال ہے - جیسے کوئی یہ کہے - کہ چونکہ سرخاب اور خرگوش کو حیض آتا
ہے اور عورت کو بھی حیض آتا ہے اسواسطے عورت کی نسل اور انسان ایک ہی نسل سے ہیں - اور یہ امر اون
کے یک جدی ہونے پر دال ہے - یہ کہنا - کہ چونکہ سامی اور تورانی زبانیں دوسری
سات زبانوں کے الفاظ سے نسبت نہیں کھاتیں - ایک جلد بازی ہے - اگر قبل
اسکے کہ باہم زبانوں کا مقابلہ کر کے نسلوں کی وحدت اور اخوت پر غور کریں - خود نسلوں
کے مقابلہ سے اسکا فیصلہ کرنا چاہیے - ڈارون کی تہیوری میں معمولی معمولی نشانات
اور علامات پر بندر سے انسان کا رشتہ ملایا جاتا ہے - اور دوسری طرف بڑی بڑی
قریبی مناسبتیں اور یکسانیتیں اور علامتیں چھوڑی جاتی ہیں - اگر سات
زبانوں کی کوئی ابتدائی زبان اب گم ہو چکی یا صفحہ دنیا سے مٹائی گئی ہے - اور
یہ سات زبانیں جنہیں ہم ردیف کہا جاتا ہے - اوس گم شدہ زبان کی ذریات
نہیں - تو کیوں یہ قیاس نہیں کر لیا جاتا - کہ یہ سامی اور تورانی زبانیں بھی اوسی ایک
گم شدہ زبان کی یادگار نشانی ہیں - سات زبانوں سے سامی زبانوں اور تورانی
زبانوں کو بھی ملا کر دیکھو گے - تو پتہ لگ جائے گا - کہ وہ بھی اسی سلسلہ میں سے
ہیں - حروف ابجد کے ملانے اور جوڑنے سے صاف طور پر پتہ لگ سکتا ہے - کہ
یہ زبانیں ایک ہی ناطقہ کا نتیجہ اور اثر ہیں - اور ایک ہی شجر لسان کی شاخیں اور
پھل ہیں - اسقدر دور دراز قومیں اور نسلیں نکل گئیں - کہ رفتہ رفتہ اون میں زمین
آسمان کا فرق ہو گیا - خود ان زبانوں ہی کے اندر دیکھو کسقدر اختلافات ہیں -
اور کسقدر دقت سے ان میں مناسبتہ پیدا کی جاتی ہیں - اگر انسان ایک ہی
صورت کی یادگار ہیں - تو یہ زبانیں بھی ایک گم شدہ زبان سے وابستہ ہیں -
اور میری رائے میں یہ بحث بھی کسی قدر [illegible] ہے - کہ کوئی زبان گم ہو گئی

جنکی یہ سب زبانیں شاخیں ہیں۔ کوئی ایسی زبان نہیں ہے۔ جو خود گم ہوکر اپنی نشانیاں ان موجودہ زبانوں میں چھوڑ گئی ہو۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ انسان کس خطہ یا کن قطعات سے دوسرے ممالک میں منتقل ہوتا گیا۔ بس وہی پہلا قطعہ ایسا ہے جسمیں وہ شروع کی زبان بولی جاتی تھی۔ جو قطعہ ایسا خاص کیا جائے گا۔ اوس میں ایک پرانی زبان پائی جائیگی خواہ کسی حالت میں ہو۔ بس وہی انسانوں کی ابتدائی زبان سمجھی جائے۔ اگر ایک خطہ ملک سے نکل کر انسانی نسلیں دوسرے خطہ میں جاکر رنگ و روپ بدل دیتی ہیں تو کیا زبانوں میں اسی طرح تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

شروع کی زبان برنگ اشارات اور کنایات تھی۔ جس کا اب تک پتہ لگ رہا ہے۔ اگر کوئی ابتدائی زبان گم بھی ہوئی ہے۔ تو اوسکے نشانات اب تک موجودہ زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور ہم غور کرنے کے بعد اونکا پتہ لگا سکتے ہیں۔ عربی زبان یا عبرانی زبان سامی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ اگر غور کروگے۔ تو عربی اور عبرانی کے بعض الفاظ اور بالخصوص ابجد ان کی دنیا کی دوسری زبانوں کی ابجدوں سے ٹکر کھاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم ردیف زبانوں کی مناسبت کے واسطے الفاظ باپ - ماں - بیٹا - بیٹی - بھائی - بہن - یا پدر - مادر - پسر - دختر - برادر - خواہر - وغیرہ سے استدلال کیا جاتا ہے - یا اسی قسم کے اور چند استدلال پیش کئے جاتے ہیں - اگر ان ہی نظایر سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے - تو اس قسم کے الفاظ السنہ سامی اور تورانی سے بھی ٹکر کھاتے ہوتے پیش کئے جاسکتے ہیں -

مثلاً اردو اور پنجابی میں والدہ کو اماں او ماں کہتے ہیں - عربی میں ماں کو (ام) کہتے ہیں - اماں اور (ام) میں دیکھو کیسی صاف نسبت ہے -

سنسکرت میں پرتھوی زمین کو کہتے ہیں - اور عربی میں ارض زمین کا نام ہے

انگریزی میں زمین کو ارتھ کہتے ہیں۔ دیکھو ان تینوں الفاظ میں کیسی نسبت ہے سنسکرت میں مایا سے مراد مادہ ہے اور عربی میں مادہ گویا مایا ہے۔ ان دونوں میں بھی کیسی قریبی نسبت ہے۔

انگریزی میں ٹال طویل یا لمبے کو کہتے ہیں۔ اور عربی میں بھی طال اور طویل لمبے کو کہتے ہیں۔

انگریزی میں سٹیبل اصطبل کا نام ہے۔ اور عربی میں بھی سٹیبل سے مراد اصطبل ہے۔

کرم سنسکرت میں فعل کو کہتے ہیں۔ اور عربی میں کرم سے مراد بخشش مہربان ہے بخشش اور مہربانی بھی ایک فعل ہے۔

قیماق عربی میں بالائی کو کہتے ہیں۔ اور انگریزی میں کریم بالائی ہے۔ ان دونوں میں ایک ایسی نسبت اور مشابہت ہے۔ کہ یہ کہنا مشکل نہیں۔ کہ قیماق ہی سے کریم نکلا ہے۔ یا اوسکا دوسرا رنگ ہے۔

میٹر انگریزی میں مقدار یا پیمانہ کے معنے رکھتا ہے۔

عربی میں معیار کے بھی اس کے قریب قریب معنے ہیں۔

یونانی زبان میں ایک لفظ مونڈ یا مونس ہے۔ جسکے معنے موافقت کے ہیں اسکے مقابلہ میں عربی میں لفظ مونس ٹھیک ان ہی معنوں میں استعمال پایا جاتا ہے

متواردات السنہ

توارد سے مراد اصطلاحی رنگ میں ایک بات ایک مضمون ایک شعر کا دو مختلف شخصوں سے ایک ہی رنگ میں صادر ہونا ہے۔ متواردات کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) توارد لفظی۔

(ب) متوارد معنوی۔

یعنی کبھی تو تفقیہ متوارد الفاظ میں ہوتا ہے۔ اور کبھی معنوں میں اور کبھی دونوں میں جب ہم کبھی اکٹھے ہو کر کسی مجلس میں بیٹھتے ہیں۔ تو بعض وقت دو آدمی دونوں طرف سے کوئی بات کرتے ہیں۔ یا کسی خیال کا اظہار ہوتا ہے۔ تو جو زید کہتا ہے۔ وہی بکر کہتا ہے۔ یعنی جو بات زید کے دل میں آتی ہے۔ وہی بکر کے دل میں بھی آتی ہے۔ بعض وقت ایسا توارد ہوتا ہے۔ کہ سننے والوں کی طبیعت حیران رہ جاتی ہے۔ اور دراصل اسی کا توارد صحیح نام ہے۔ چونکہ انسان کی طبیعت مدرک واقعہ ہوئی ہے۔ اور بعض وقت عامہ ادراک کے تحت ایک انسان وہی بات سوچتا ہے۔ جو ایک دوسرا سوچتا ہے اسواسطے توارد ہو جاتا ہے۔ اگرچہ توارد سمجھ سوچ کر نہیں ہوتا۔ اور ایک دوسرے کے دل سے یا ایک دوسرے کے خیال سے دوسرا واقف نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ ذہن رسا بعض وقت باوجود مختلف ہونیکے بھی ایک ہی مرکز مدنظر رکھتا ہے۔ اسواسطے بعض امور بعض فقرات بعض مضامین اور بعض خیالات میں توارد ہو جاتا ہے۔ یہ صرف خیالات مضامین اور نظم و نثر میں ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ افعال میں بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض وقت صناع ایک ہی قسم کی صنعت کا استدلال کرتے ہیں۔ اور دونوں میں قریباً مشابہت ہوتی ہے۔

لسانی تواردات میں اکثر الفاظ دو مختلف زبانوں کے بعض وقت معانی میں ہو بہو مل جاتے ہیں۔ اور حیرت ہوتی ہے۔ کہ کسطرح ان الفاظ میں ایسی مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ ایک لفظ مغرب میں بنایا گیا۔ یا معنی پذیر ہوا ہے۔ اور دوسرا مشرق میں۔

اگرچہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ کہ شاید ایک زبان کے بعض الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو گئے ہوں۔ لیکن جب اس پر کوئی اور دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ تو یہی کہنا

پڑتا ہے۔ کہ دراصل ذہنی توارد ہی اس کا موجب ہوا ہے۔

اگر مختلف السنہ کے الفاظ پر تنقیدی نظر ڈالی جائے۔ تو پتہ لگ سکتا ہے۔ کہ ان میں کیسی مشابہت اور معانی میں کہاں تک انطباق ہے۔ مثلاً عربی میں لفظ شاق کے معنے دشوار رنج آور اور رنج کے ہیں۔ انگریزی میں بھی لفظ Shake شاق بھی بہ معنے بیقراری حیلہ۔ جنبش کمزوری۔ پست ہمتی وغیرہ وغیرہ آتا ہے۔ دیکھو ایک عربی لفظ ہے۔ اور دوسرا انگریزی مگر دونوں میں ایک نسبت ہے۔ اور دونوں کے معانی قریباً ایک ہی ہیں۔

لفظ (تسلیم) کے عربی میں معنے زشت یا زشت کردن کے ہیں۔ اور انگریزی میں لفظ Blame قریباً ان ہی معنوں میں مستعمل ہے۔ انگریزی میں لفظ Name کے معنے نام کے ہیں۔ اردو میں نام اور پنجابی میں (ناں) ان ہی معنوں میں آتا ہے دیکھو پنجابی کا (ناں) ٹھیک (نون) ہے۔

انگریزی میں لفظ (ڈے) (day) دن کے معنوں میں آتا ہے اردو یا ہندی میں تو دن ہے۔ ملتانی میں بعض لوگ (ڈن یا ڈہینہہ) بھی بولتے ہیں۔

لفظ (Satan) سٹان بہ معنے شیطان انگریزی میں آتا ہے۔ اور فارسی میں شیطان ہے۔

لفظ ستارہ فارسی میں اور انگریزی میں لفظ (Star) ایک ہی معنوں میں آتے ہیں۔

انگریزی میں لفظ (Mirror) بہ معنے آئینہ ہے۔ اور عربی میں لفظ (مرآت) ان ہی معنوں میں آتا ہے۔

انگریزی میں لفظ میٹر (Matter) مادہ کے معنوں میں ہے اور عربی لفظ (مادہ) ہے۔

سنسکرت میں لفظ (آستک) قائل خدا کے معنوں میں ہے۔ اور انگریزی میں لفظ تھی ایسٹ (Theinst.) ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے
انگریزی میں لفظ (Leaunt) کے معنے دبانے دھمکانے کے ہیں۔ اردو اور پنجابی میں بھی لفظ ڈانٹ یا ڈانٹنا کے یہی معنی ہیں۔ انگریزی میں لفظ (Saint.) انہیں معنوں میں ہے۔ جن معنوں میں لفظ (سنت) ہندی میں ہے۔

انگریزی کا لفظ (moon) اور نیا ایک ہی معنے رکھتے ہیں۔ اور دونوں کا تلفظ بھی قریباً ایک ہی ہے۔

عربی میں لفظ (کفن) کے معنے صوف اور جامہ مردہ کے ہیں۔ اور انگریزی میں لفظ (Coppere) کے معنے تابوت کے بھی ہیں۔

عربی میں مسجد اور انگریزی میں (Mosque) ایک ہی رنگ رکھتے ہیں۔

اور بھی بیسیوں الفاظ ایسے مل سکتے ہیں۔ جو توارداً مختلف زبانوں میں آچکے ہیں۔ خواہ یہ توارد طبعی ہو۔ اور خواہ انتقالی حالت میں اگر دوسری صورت مانی جاوے۔ تو ماننا پڑے گا۔ کہ سب زبانوں کا شروع کوئی ایک ہی زبان تھی۔ رفتہ رفتہ اختلاف ہوتا گیا۔

۴۸۶

یکم اکتوبر سنہ ۱۶ء

اتصال السنہ

اتصال السنہ کی بحث میں ہمیں ایک ہی سرزمین یا ایک ہی قطعہ ملک سے رفتہ رفتہ متصلہ اور ملحقہ اقطاع ممالک اور اقطاع اقوام میں بھی جانا چاہیئے۔ اس سے ہمیں بآسانی پتہ لگ جائے گا۔ کہ دنیا کی ساری زبانوں میں کسقدر بُعد قربت اور اتصال ہے۔ اور کسطرح ایک زبان دوسری زبان سے بتدریج جدا ہوتی گئی ہے۔ اس مقابلہ سے خود بخود ہی یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہر زبان اپنی حد استعمال ختم ہونے پر دوسری زبان ملحقہ کو اپنے اندوختہ اور آثار میں سے کیا کچھ دیتی اور تفویض کرتی ہے

آؤ ہم اپنے ہی صوبہ پنجاب میں امرتسر سے جالندھر کو چلیں اب ہمیں کرتارپور میں ٹھہر کر دیکھنا اور سننا چاہیئے۔ کہ امرتسر اور ماجھ کی بولی میں جو کرختی اور جو درشتی ہے۔ وہ حدود کرتارپور میں آکر ایک بڑی حد تک بدل گئی ہے۔ گویا ان دونوں بولیوں کے تفریق اور امتیاز کے واسطے دریا بیاس ہی ایک حد فاصل ہے۔ اب جو تم شہر جالندھر میں داخل ہوگے۔ تو وہاں اور ہی سماں پاؤ گے۔ جالندھر سے نکل کر لودیانہ ہوتے ہوئے۔ جب ہم شہر انبالہ میں پہنچینگے۔ تو لہجہ رسم طلاقت اور سلیست و ثقالت الفاظ میں بالکل فرق پایا جائے گا۔ یہاں پہنچکر تم معلوم کر سکو گے۔ کہ پنجابی زبان کی حکومت بدل کر کوئی اور حکومت آنے والی ہے۔ اب تم سیدھے سہارنپور سے ہوتے میرٹھ طے کرتے ہوئے دلی دارالخلافہ ہندوستان میں چلے جاؤ۔ اگرچہ راہ میں جاتے تمہیں سرزمین زبان مختلف رنگوں میں سنائی اور دکھائی دے گی مگر دلی میں پہنچکر تمہیں کہنا پڑے گا۔ کہ پنجابی بالکل رخصت ہو چکی ہے۔ اور وادی

زبان میں چھوٹی چھوٹی وادیاں آکر ایک اور ہی اجنبی وادی آگئی ہے۔ پھر یہاں سے تم الہ آباد اور جبل پور اور سورت ہوتے ہوتے بمبئی میں جا پہنچو۔ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہاں آکر زبان کا کچھ اور ہی رنگ ہو گیا ہے۔ یہاں کے بعض الفاظ اور بعض مختصر فقرات میں تمہیں پنجابی اور سندھی زبان کا گمان گزرے گا۔ بمبئی سے لوٹ کر تم براہ اجمیر شریف گوڑگانوں کے راستہ سے نکلتے ہوئے۔ فیروز پور طے کرنے کے بعد رائے ونڈ کے راہ سے منٹگمری اور ملتان وا آلپو طے کرتے ہوئے مظفر گڑھ ڈیرہ غازی خاں ڈیرہ اسمٰعیل خاں۔ کوہاٹ۔ بنوں۔ میاں والی۔ شاہ پور ہونے کے بعد کیمل پور سے پشاور چلے جاؤ۔ اور وہاں سے ایبٹ آباد ہزارہ۔ ہوتے ہوئے راولپنڈی میں آنکلو۔ اور راولپنڈی سے ٹرین میں بیٹھ کر جہلم۔ گجرات۔ سیالکوٹ۔ گوجرانوالہ۔ لاہور سے نکل کر گورداسپور کے راستہ سے کانگڑہ۔ ہوشیار پور میں آجاؤ۔ تمہیں اس سارے چکر سے معلوم ہو جائے گا کہ اس چھوٹے سے چکر میں تمہیں کسقدر زبانوں سے سابقہ پڑا۔ اور اگر تمہیں فرصت ہو تو تم بمبئی سے حیدر آباد دکن۔ اندہور۔ بھوپال۔ بڑودہ۔ اور مدراس میں بھی ہو آؤ۔ اور پشاور سے کابل تک ہی جا پہنچو۔ تو یہ چیز بھی تمہیں اس رائے پر لے آئیگا۔ کہ

جب تم ایک علاقہ کی حدود لسانیہ سے گزر کر دوسرے علاقہ زبان میں جاتے ہو۔ تو تمہیں بہت سے ایسے الفاظ بھی سنائی دیں گے۔ جو ان زبانوں کے ہیں جنہیں تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ یا تمہیں بعض الفاظ ایسے بھی سنائی دیں گے۔ جو ان زبانوں کے الفاظ کی نقل یا ملتے اور متقلبہ حصہ ہے۔ جو تم پہلے سن چکے ہو۔ دلی اور کابل میں جا کر تمہیں یہ بھی پتہ لگ جائے گا۔ کہ بعض وہ الفاظ جو پنجاب اور سندھ میں بولے جاتے ہیں۔ وہ ان شہروں میں بھی ادنے تغیر کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ یا یہ کہ ان دونوں علاقوں کے بعض الفاظ توڑ مروڑ کر پنجاب اور سندھ کے علاقہ

میں بھی لوگ بولتے ہیں۔ تمہیں بعض ایسے الفاظ بھی سنائی دیں گے۔ جو اپنی اصل جنم بھومی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن دوسری زبانوں میں جا کر اون کا لہجہ شکل تلفظ اور بعض حالات معانی ہی اول بدل گئے ہیں۔ دیکھو ماں کا تلفظ کابل اور ایران میں جا کر مادر بن گیا۔ اور انگریزی میں مدر اور عربی میں اُم۔

عربی میں (لفظ اُم) بھی میری رائے میں مادر یا مدر ہی سے ملتا ہے۔ بے شک یہ کہا جائے گا۔ کہ عربی زبان آرین زبانوں سے کوئی رشتہ نہیں رکھتی۔ لیکن میری رائے میں دنیا کی کل ابتدائی اور ما بعدی زبانوں میں رشتہ تھا۔ رفتہ رفتہ دوری اور اختلاف وسائل اور اختلاف ضروریات کی وجہ سے فرق پڑتا گیا۔

اس معمولی سرگشت کے بعد تم غور کرو۔ کہ اس چکر میں تمہیں کتنے ایسے الفاظ سننے پڑے۔ جو خود تمہاری مرزبوم میں بھی بولے جاتے تھے۔ اگرچہ اون میں کچھ ہیر پھیر تو ہو گیا۔ لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں زبانوں کے ثبوت تعلق اور اتصال کے واسطے اون کی ہستی ایک قوی دلیل شمار ہو سکتی ہے۔

اگر تم سمندر کے پار بھی چلے جاؤ گے۔ تب بھی تمہیں بہت سے ایسے الفاظ سننے پڑیں گے۔ جو سمندر کے اس طرف بھی بولے جاتے ہیں۔ اور تم حیران ہو جاؤ گے۔ کہ سمندر پار کسطرح آگئے۔ اور اگر تم ذرا اس نقطہ خیال سے غور کرو گے۔ تو تمہاری عادات اور ضروریات و خیالات کو ان لوگوں کے خیالات عادات اور ضروریات سے کیا نسبت ہے۔ جو سمندر پار رہتے ہیں۔ اور جنکی بولیاں تمہاری بولیوں سے ایک بڑی حد تک الگ ہیں۔ تو تمہیں حیرت کے ساتھ یہ پتہ بھی لگ جاوے گا۔ کہ بہت سی عادتیں اور بہت سے معاشرانہ خیالات اور معادانہ عملیات تم سے ملتے جلتے ہیں۔ اور تمہیں آسانی سے یہ کہنے کا موقعہ بھی مل سکتا ہے۔ کہ سوائے چند باتوں اور چند خصوصیات کے ان نیت اور مقتضیات انسان کے اعتبارات سے سمندر پار اور سمندر وار کی نسلیں

ایک ہی ہیں۔ اور سب کا مورث اعلیٰ بھی ایک ہی ہے۔ یا ایک ہی ہونا چاہیئے۔

افسوس بعض لوگ بندر کی ہڈیوں بندر کے اعضاء اور بندر کی حرکات اور عادات سے تو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہ انسان دراصل بندر ہی کی ذریات میمون سے ہے۔ لیکن دنیا کی انسانی نسلوں کے اتصالات طبعی اور اتصالات خیالی سے اس قرار دینے میں متامل ہیں۔ کہ سب انسان ایک ہی مورث اعلیٰ کی ذریات میں سے ہیں۔ اور ان سب کا جدامجد ایک ہی تھا۔ اور شروع کی بولی بھی ایک ہی تھی۔

اسی طرح یہ بھی کہنا چاہیئے۔ کہ سب زبانیں اور سب الفاظ ایک ہی زبان کی شاخیں ہیں۔ جسطرح مختلف ممالک اور اقطاع زمین کے اختلاف آب وہوا اور ضروریات کی وجہ سے خود ہمارے رنگ وروپ اور عادات میں فرق آگیا۔ اسی طرح زبانوں اور الفاظ السنہ میں بھی رفتہ رفتہ فرق آتا گیا۔ صرف الفاظ میں ہی ادل بدل نہ ہوا۔ معانی میں بھی ہو گیا۔ اور لہجہ بھی بدل گیا۔ جوں جوں انسانی نسلیں ایک دوسری سے دور ہوتی گئیں۔ دوں دوں زبانیں بھی بدلتی گئیں۔

باوجود ان اختلافات کے بھی زبانیں ایک دوسری سے ملتی ہیں۔ اور یہ ثابت کرتی ہیں۔ کہ اون سب کا شروع ایک ہی تھا۔ اور وہ سب کی سب کسی ایک ہی تنہ کی شاخیں اور ایک ہی شجر شیریں کا میوہ ہیں۔

ان مختلف قوموں کے عادات اشکال اور رجحانات کا مقابلہ کر کے دیکھو۔ جو اپنا اصلی وطن چھوڑ کر کسی دوسرے دور دراز ملک میں جا رہی ہیں۔ باوجود اسکے کہ مدتیں اور عمریں اونہیں دوسرے اقطاع ممالک میں آئے کو ہو گیا ہے۔ لیکن اب تک اونکی بعض نسلی خصوصیات جھلک مار ہی جاتی ہیں۔ بنی اسرائیل کی مختلف نسلیں جو افغانستان اور کشمیر میں مدتوں سے آکر بسی ہیں۔ اونکی بعض عادتیں اور

اسرائیلی خصوصیتیں اب تک شام اور بیت المقدس و فلسطین کی اسرائیلی نسلوں ہی میں ملتی ہیں۔ تو آریہ نسلیں جو ہندوستان میں آئیں۔ اونکی بعض باتیں اور خصلتیں اپنے وطن والوں سے ٹکر کھاتی ہیں۔ یہی کیفیت زبانوں کی بھی ہے باوجودیکہ مختلف اقطاع میں زبانیں منتقل ہوتی رہیں۔ اور مختلف مراحل سے اون کا گزر ہوا۔ پھر بھی ساری زبانوں میں ایک نسبت پائی جاتی ہے۔ ایسی نسبت کہ جس سے یہ دلائل ثابت ہوتا ہے۔ کہ

دنیا کی سب زبانوں کی ماں صرف ایک ہی زبان تھی۔ یا یہ کہ سب زبانوں کا شروع صرف ایک ہی زبان تھی۔ اور اون میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہ صرف دوری اور تبدیل آب و ہوا اور ضروریات زندگی کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اور اگر ہم ذرا بہ نظر امعان دیکھیں گے۔ تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ زبانوں کا اختلاف اوسی اصول پر ہے۔ جو اصول اختلاف ذریات انسانی کے متعلق سلیم دلائل کے ماتحت تسلیم کرنے کے قابل ہے۔

۷۸۶

۳ اکتوبر ۱۶ء

اختلاف السنہ

یہ سوال بھی دل چسپی سے خالی نہیں۔ کہ ایک طرف اس وقت اس پر زور دیا جاتا ہے۔ کہ

اگر دنیا کی ایک ہی زبان ہوتی۔ تو دنیا والوں کو اسوقت تفریق اور اختلاف السنہ کی وجہ سے جو تکلیف ہو رہی ہے۔ اور جو کچھ متضاد سامان ادن میں نمو پا رہا ہے۔ وہ نہ ہوتا۔ ساری دنیا میں ایک ہی زبان کے ہونے کی وجہ سے حکومت سیاست مذاہب تجارت علوم وفنون اخلاق اور اقتصادیات کی قریبًا ایک ہی صورت ہوتی۔ نہ ترجموں کی ضرورت پڑتی۔ اور نہ مختلف زبانوں کی تعلیم کی جب کوئی غیر زبان نہ ہوتی تو اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم یا داخلہ غیر زبان کا سوال ہی نہ اُٹھتا۔ اپنی ہی زبان ہوتی۔ اور اپنا ہی سرمایہ اب تو یہ وقت ہے۔ کہ اپنی زبان کے ساتھ دوسری زبانیں بھی سیکھنی پڑتی ہیں۔ مدتوں گزرنے پر بھی ادن میں کمال حاصل نہیں ہوتا اگر ایک زبان میں علوم وفنون ہیں تو دوسری میں مغایرت کی وجہ سے پڑھے یا پڑھائے نہیں جا سکتے۔ اور تراجم میں مشکل پڑتی ہے۔ اگر زبانوں کا ملکہ تکوینی قدرت ہی نے دیا ہے۔ اور زبانوں کا الہام قدرت ہی کرتی ہے۔ تو کیا اوسکے اس طریق عمل میں یہ ایک نقص نہیں۔ کہ خواہ مخواہ صدہا زبانوں میں انسان کو پھنسا کر اوسکی آسانی اور اوسکی سہولت کی راہیں بند کیں۔ اور لوگوں پر اور بھی بار مشکلات رکھا گیا۔

بسکہ در ہر صورت آزار است دامن گیر ما
بستر بیمار گردد صفحہ از تصویر ما

بیشک اختلاف السنہ سے ہمیں بعض وقت بہت ہی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس سوال کے جواب سننے کے اول ہمیں انسانی اختلافات پر بھی نظر اور غور کرلینا چاہیئے۔ کیونکہ اختلاف السنہ کا سوال انسانی اختلافات سے زیادہ تر تکلیف دہ اور قابل بحث ہے۔ انسانی اشکال انسانی ہیأت انسانی خیالات اور انسانی ارادوں کے اختلاف اور تضاد سے کسکو انکار ہوسکتا ہے۔ اور کون اس سے واقف نہیں۔ یہ تو ایک ذاتی شہادت ہے۔ اور ممکن نہیں۔ کہ کوئی بشر اس سے انکار کرسکے۔

اگر اختلافات واشکال انسانی اور خیالات واجتہادات انسانی کی ضرورت اور افادت سے ہم واقف ہیں۔ اور وہ ہمارے واسطے تمدنی اور اقتصادی دونوں رنگوں میں مناسب اور موزون ہیں۔ تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اختلاف السنہ اون سے بھی زیادہ ضروری اور موزون ہے۔ السنہ بھی ایک انسانی اجتہاد ہیں۔ اور انسانی قیاس غایت درجہ یہ کہ اجتہاد اور یہ قیاس زیادہ تر یا ابتدا ملکہ تکوینی یا ایک ذہنی ملکہ اور الہام سے منسوب یا وابستہ ہے۔ لیکن بہر حال اونکے اجتہادی ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اجتہادات میں وحدت اور یکسانیت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وحدت صرف خدائی رنگ میں ہی موجب برکات ہے باقی صورتوں میں سوائے وحدت ملی کے وحدت موجب برکات نہیں۔ بلکہ باقی صورتیں کثرت کی ضرورت ہے۔ اور کثرت ہی وحدت کی عظمت اور احترام پر شاہد ہوتی ہے۔ باقی صورتوں میں اگر کثرت نہ ہو۔ تو وحدت کی کوئی ہستی ہی باقی نہیں رہتی۔ مثلاً اگر انسان ایک ہی ہوتا اوسکے ساتھ کوئی دوسرا انسان نہ ہوتا۔ تو دنیا کی یہ حالت اور یہ رونق نہ ہوتی۔ اور اگر اس کائنات میں صرف ایک ہی شکل وشباہت اور ایک ہی شان کے اشیاء اور ہستیاں پائی جائیں۔ تو یہ دنیا یوں دلچسپ نہ ہوتی۔ بلکہ ایک غم خانہ انسان طبعاً اختلاف پسند ہے۔ اور سوائے اختلاف پسندی کے اوسکی زندگی خوش ہی نہیں رہتی اوسے چین ہی نہیں آتا۔ ایک ہی غذا اور ایک ہی لباس پر کون سے انسان طوعاً صابر

اور شاکر رہتا ہے۔ جدید اشیا کے دیکھنے سے دل و دماغ پر جو فرحانہ خیالات ہجوم کرتے ہیں
اون کا ان اختلافات سے ہی صحیح اندازہ ہوسکتا ہے۔ کسی کے ایک ہی شکل کے
بچے اور ایک ہی وضع کے مکانات اور پارچات ہوں۔ تو وہ ہمیشہ تفرید اور تفریق
کا دل سے خواہاں رہتا ہے۔ یہ تمام چھوٹی چھوٹی باتیں جو ایک طرح سے انسانی
زندگی کا لازمہ ہیں ثابت کرتی ہیں کہ انسان شروع سے لیکر اخیر تک اختلاف پسند ہے۔ جب
اختلاف پسند تھا۔ اور اوسکے اجتہادات بھی مختلف تھے۔ تو لازمی تھا۔ کہ اجتہاد السنہ
بھی مختلف فیہ ہوتا۔ اور اسکی قدرت ہی حامی تھی جیسے کہ ایک الہامی کتاب میں کہا گیا۔ کہ
خود خدا نے ہی زبانوں میں اختلاف رکھا ہے۔ بایں معانی اختلاف السنہ تحت
حکم خدائی یا تحت الہام ہے۔ جیسے کہ اشکال کے اختلاف سے گریز نہیں۔ اور اوسے
ہم اپنے حق میں مفید اور آسائش وہ خیال کرتے ہیں۔ ایسے ہی اختلاف السنہ بھی
ہے۔ اب ہم دوسرے رنگ میں یہ دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ اختلاف السنہ کا فائدہ کیا ہے۔

فائدہ جتانے سے اول ہم اس بات کا اعتراف کریں گے۔ کہ بعض معاملات میں
بیشک ایک قسم کی تکلیف بھی ہے۔ لیکن بہ مقابلہ اوس تکلیف کے فوائد زیادہ ہیں۔

(اول) اگر دنیا میں صرف ایک ہی زبان ہوتی۔ تو انسان کے لسانی اجتہادات ایک ہی قسم کے ہوتے
(دوم) لسانی ملکہ تکوین کی عملی حالت ایک ہی قسم سے مربوط رہتی۔ اور اس میں برنگ
دیگر کوئی ترقی نہ ہوسکتی۔

(سوم) ملکہ تکوین کی قابلیت بھی بہت محدود رہ جاتی۔ قدرت نے اوس میں جو نشو و نمائی
طاقت رکھی تھی۔ وہ رک جاتی۔

(چہارم) وہ انسانی خاصہ جسے اختلاف پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جس پر
ترقیات کا بہت کچھ مدار ہے۔ پست پڑ جاتا ہے۔

(پنجم) چونکہ انسان اپنے اصلی مرکز سے ہٹ کر دوسرے مواقع پر منتقل ہوگیا تھا۔
اسواسطے اون مواقع کے اعتبارات سے اوسکی قوتوں اور اوسکے جذبات اور ضروریات
میں اختلاف لازمی تھا۔ اسواسطے اجتہادات لسانی اور عملی ملکہ تکوین کی ذریات

میں بھی اختلاف کی ضرورت تھی۔ اور وہ سوائے اسکے ظاہر نہیں ہوسکتا تھا۔ کہ الفاظ اور زبانیں جداگانہ نشو ونما پاتی رہیں۔

(ششم) لسانی کیفیات اوسی صورت میں ترقی پا سکتی ہیں۔ جب اذہان انسانی اپنے اپنے رنگ میں مترقی ہوں۔ اور جداگانہ ترقی کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ کہ الفاظ اور زبانوں میں کافی اختلاف ہو۔

(ہفتم) اگر ایک ہی زبان دنیا میں ہوتی۔ تو علوم وفنون میں اسقدر ترقی نہ ہوتی اور لوگوں کے اذہان بوسیدہ اور کاہل یا دم بخود رہکر معطل ہو جاتے۔

(ہشتم) انسان کا یہ طبعی خاصہ ہے۔ کہ وہ جداگانہ ترقی اور جداگانہ نشو ونما کو پسند کرتا ہے۔ اور جداگانہ سلسلہ عمل سے خوش ہوتا ہے۔ اگر سارا شہر ایک ہی کمرہ میں بسایا جائے۔ تو تمدنی اور شہری ترقی نصیب نہیں ہوسکتی۔

(نہم) انسان جداگانہ روایات کے ماتحت جداگانہ کوشش اور جداگانہ جدوجہد کے اظہار کی خواہش رکھتا ہے۔ اور اوسی جداگانہ خواہش کے زور سے اوسکی ذہنی اور اجتہادی طاقتیں ایک بڑی حد تک ترقی کر جاتی ہیں۔

(دہم) انسان ہمیشہ اون کوائف اور اون حقائق کے ادراک اور انکشاف کی جانب زیادہ توجہ کرتا ہے۔ جو اوسکے ذہن سے مجہول ہوں۔ ایک زبان کا دوسری زبان سے متضاد ہونا۔ ایک مجہولیت ہے۔ اور ایسی مجہولیت مستلزم ہے۔ اس امر کی کہ دوسری قومیں خصوصاً ایسی زبان کے حاصل کرنے کی جانب متوجہ ہوں۔ اور اون کی اس توجہ سے اون کے اذہان میں تدریجی ترقی ہوتی جائے۔

(یازدہم) مجہولیت اور اجنبیت ایک فلسفہ یا دہانہ فلسفہ ہے۔ جبتک اجنبیت مجہولیت حیرت۔ اور تعجب نہ ہو۔ تب تک انسان فلسفی رنگ میں انکشاف حقائق کیطرف متوجہ نہیں ہوتا۔ دنیا میں زبانوں کی تاریخ اور زبانوں کی فلاسفی کی کوئی ہستی نہ ہوتی۔ اور انسانوں کو اسکا شوق ہی نہ ہوتا۔ تو یہ ادبی نقطہ خیال سے ایک بڑی بھاری کمی تھی۔

(دوازدہم) مختلف زبانوں کی مختلف ترقیاں اور مختلف خوبیاں مختلف کمیاں اور

مختلف نقص ایک دوسری زبان کے واسطے ایک نوٹس اور ایک تحریک ہیں اگر صرف ایک زبان ہوتی۔ تو یہ کیفیت نہ ہوتی۔

(سیزدہم) ہر شخص ہر کنبہ ہر خاندان اور ہر گروہ اور ہر قوم اور ہر فرقہ دوسروں سے اپنے اسرار اور بعض امور کا اخفا چاہتا ہے۔ اگر زبانوں میں اختلاف نہ ہوتا۔ تو یہ اخفا باقی نہ رہتا

(چہاردہم) اضداد ہی سے اشیا کی قیمت میں اضافہ اور کمی ہوتی ہے۔ اختلاف السنہ ایک ضد ہے۔ اور اوس سے ایک دوسری کے مقابلہ میں اون میں کمی اور بیشی قیمت کی ہوتی رہتی ہے

(پانزدہم) قدرت کی خوشی بھی اسی میں ہے۔ کہ اشکال کیطرح عناصر کیطرح کیفیات کیطرح حقائق اشیا کیطرح اور کائنات کیطرح زبانیں بھی مختلف ہوں۔ اگر زبانیں ایک ہوتیں۔ تو انکی مناسبت دیگر سے باقی نہ رہتی۔

خدا کی مخلوق رنگارنگ کی ہے۔ بوقلمونی اوسکی ایک لازمی شرط ہے۔ کوئی وجہ نہ تھی۔ کہ دنیا کی زبانیں اس سے خالی اور محروم رہتیں۔

(شانزدہم) جب انسان کی تمام دیگر تمدنی کیفیات مختلف فیہ ہیں۔ اور رسوم و رواجات میں بھی گونہ فرق ہے۔ تو زبانیں بھی مختلف ہونی چاہئیں۔

(ہفدہم) جب مختلف کاریگر اور مختلف صناع اور مختلف نقشے اور مختلف سامان اور ڈیزائن ہوں۔ تو عمارت بھی مختلف ہوگی۔ اور کاریگری بھی مختلف ہوگی۔ چونکہ بانیان زبان یعنی ماہرین زبان اور ترکیب دہندگان زبان نشانگان زبان تعبیر کنندگان زبان اور ناطقین زبان جداگانہ تھے۔ اسواسطے لازمی تھا۔ کہ دنیا کی تمام زبانیں بھی مختلف فیہ ہوتیں۔

(ہژدہم) ہر قوم فطرتاً اور طبعاً چاہتی ہے۔ کہ وہ اور قوموں کے مقابلہ میں آزادانہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو۔ بایں ضرورت بھی لازمی تھا کہ زبانوں میں اختلاف ہوتا۔ کہ ہر قوم اُسکے ذریعہ سے ترقی پا سکے۔ باوجود اس اختلاف اور تضاد کے بھی اُن سب میں موروثی اور مادی جہت سے ایک قسم کی وحدت اور نسبت بھی پائی جاتی ہے۔ جو ہر ایک زبان پر غور کرنے سے بوجہ احسن ثابت ہو سکتی ہے اور جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس سے یہ ثابت ہے۔ کہ ہم ایک وحدت سے کثرت کی جانب آئے گئے ہیں۔ اور ہماری کوئی واحد زبان مختلف زبانوں کی واضع اور موجد ہوئی ہے۔ اور اُسی پہلی اور موروثی

زبان کو ساری زبانوں کے مقابلہ میں ام الالسنہ کہلانے کا صحیح حق حاصل ہی۔ چاہے کوئی ہو۔ گو ہمیں غیر زبانوںکے پڑھنے سی تکلیف تو ہوتی ہی مگر جب ہم اُنسے واقف ہو کر انکی عمدگیوں انکی ادبی خوبیوں جداگانہ کمالات جداگانہ ادبیات اور جداگانہ محاورات اور جداگانہ ضرب الامثال سے واقف ہوتے ہیں۔ تو ہمیں جو خوشی ہوتی ہے۔ اُسکا اندازہ بھی ادبی لفظ نگاہ سے ہم ہی کر سکتے ہیں۔

انسان کا یہ طبعی اور فطری خاصہ ہے۔ کہ وہ انکشاف عقدہ اور ادراک مسائل ادقہ اور احساس مقاصد اجنبیہ سے ایک خاص قسم کی خوشی اور ذوق اپنی طبیعت اور اپنے دل و دماغ میں پاتا ہی۔ ہندسہ کے جوابات اقلیدس کے حل اور اشعار کے سمجھنے اور مطلب نکالنے سے ہمیں جو خوشی ہوتی ہی۔ وہ ایک خاص خوشی ہی۔ گو اشعار اور سوالات ہندسہ سے ہم تعلیمی پہلو سے واقف اور شناسا ہوتے ہیں مگر آخر ان میں ایک قسم کی اجنبیت اور مجہولیت ضرور ہوتی ہی۔ اور وہ اجنبیت زبان سے بعض حالات میں تکلیف دہ نہیں ہوتی۔ اسیطرح جب انسان اجنبی السنہ سے شناسائی حاصل کرتا ہے۔ تو اوسے اسپر ایک فخر ہوتا ہی۔ دیکھتے نہیں ہو کہ جب کوئی طالب العلم دوسری زبانوں میں ڈگری لیتا ہی۔ تو کس شان اور کس شوق سے مجلسوں اور اخباروں میں مبارکباد دیجاتی ہے۔ اور لوگ کیسا فخر کرتے ہیں۔ یہ بات اپنی زبان میں امتیاز حاصل کرنے سے کم حاصل ہوتی ہے۔

شان حسن بھی ایک اجنبیت رکھتی ہی یہی وجہ تو ہی۔ کہ نقادان حسن اور صرافان وجاہت اسی اجنبیت کی وجہ سے ہمیشہ اوسکے جویاں اور وارفتہ رہتے ہیں۔ وعدہ کی قدر و منزلت ہمیشہ وعدہ کی بے وفائی سے ہوتی ہی ہر چیز اپنی ضد سے قدر پاتی ہی۔ مگر اپنی زبان نہ ہوتی۔ تو ہونیکی حیثیت سے اوسکی قدر اور محبت اور غیرت کیا ہوتی۔ اور اگر غیر زبان ہی نہ ہوتی۔ تو غیر زبان کی عمدگیوں خوبیوں اور برائیوں کی بابت نوٹس کیا اور کب لیا جاتا۔

اگر دنیا میں سب دھاتیں سونا ہی ہوتیں تو سونے کی یہ قدر ہی نہ رہے۔ چاندی اور لوہے ہی نے سونے کی یہ قدر و منزلت کرائی ہے۔ اگر عربی اور سنسکرت مشرقی زبانوں میں نہ ہوتیں۔ تو ساری مشرق میں اور کونسی زبان کلاسیکل اور پرانی زبان کہلانے کا فخر حاصل کر سکتی تھی۔

اگر تم اپنے خاندان اپنی ذریات اپنے شہر اور اپنے ملک اپنے اور اپنی قوم کے اندرونی۔
اشکالی ہیاتی وجدانی اختلافات سے تنگ آگئے ہو۔ اور اوسے اپنی انوکھی اور مجتمعہ السانیت
کے خلاف سمجھتے ہو۔ تو اختلافات السنہ پر بھی نکتہ چینی کر سکتے ہو۔ اور اگر اوسپر کوئی اعتراض نہیں
بلکہ شناخت اور امتیاز کیواسطے ایسے اختلافات کا ہونا ہی مناسب اور موزون جانتے ہو۔ تو پھر
لسانی اختلافات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مانا کہ بعض مشکلات بھی ہیں۔ لیکن بہ مقابلہ اُن
بعض مشکلات کے بہت سے محاسن اور خوبیاں بھی ہیں۔ ایسے محاسن اور ایسی خوبیاں
جو اتحاد اور کیفیات السنہ کی صورت میں متصوّر نہیں۔

۴۸۶ ۵ اکتوبر ۱۶ء

ہندوستان کی زبانیں

اسوقت ہندوستان میں بیسیوں زبانیں مختلف صوبوں اور اقطاع ہندوستان میں بولی
جاتی ہیں۔ اُن میں سے چند زبانیں ہی مشہور اور کسی حد تک علمی رنگ رکھتی ہیں۔ جیسے اُردو۔
ہندی۔ یا ہندوستانی۔ بنگالی۔ گجراتی۔ سندھی۔ ان سب زبانوں میں ہندی کا عنصر
زیادہ تر پایا جاتا ہے۔ اُردو زبان ہر صوبہ میں قریبًا سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض اقطاع اور
اور صوبوں میں وہ عمومًا بولی نہ جاتی ہو۔ لیکن کسی نہ کسی حد تک سمجھی ضرور جاتی ہے۔ لیکن
ترقی اور ملکی مشترکہ کامرانی کیواسطے یہ ضروری ہے۔ کہ اسوقت جسقدر زبانیں کسی حد تک
ترقی کر رہی ہیں۔ انکی ترقی اور وسعت لگاتار ترقی کرتی رہے۔ اور اپنے اپنے دائرہ اور
حدود میں انکی علمی ترقی کے اسباب بہم پہنچائے جائیں۔ کیونکہ اسی میں ہندوستانکی ترقی متصور ہے
دوسری طرف ہندوستان کی قوموں کا فرض ہے۔ کہ ایک دوسری قوم اور
ایک دوسرے صوبہ کی زبانوں میں ملکی ضروریات کے تحت شناسائی حاصل کریں۔
تاکہ اس ذریعہ سے انکے تعلقات میں اور بھی زیادہ تر وابستگی کے سامان مہیا ہوں۔
اور ایک دوسری زبان کے خیالات اور ترقیات کے معلوم کرنے کا موقعہ مل سکے۔
ہندوستان کی اقوام جیسے باعتبار ملت اور مذہب کے آپس میں تفریق رکھتی ہیں۔
ایسے ہی لسانی اعتبارات کے پہلو سے بھی اُن میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ ہر قوم

انگریزی زبان بلحاظ یا بہ ضرورت سیاسی امور اور کاروباری زندگی کے حاصل کرتی ہے۔ اسکے ساتھ ہی علمی اور ادبی ضروریات کے تحت بھی انگریزی کا کسی حدتک خیر مقدم کیا جاتا ہے چونکہ انگریزی زبان اسوقت مختلف علوم و فنون کا مخزن اور ذخیرہ بن رہی ہے۔ اسواسطے اسکا سیکھنا۔ اور اس سے علمی رنگ میں مستفید ہونا بھی ترقی خواہان ادب کیواسطے لازمی ہے۔ اور یہ ایک لازمی بات ہے۔ اُردو بھی ایسی ہی ضروریات کے تحت بعض ایسی قومیں حاصل کرتی ہیں جنکی اپنی زبانیں بھی ہیں۔ اور جو بالمقابل ترقی کررہی ہیں۔ اُردو اصل کسی ایک قوم کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ کُل قوموں کی کیونکہ اُردو کا اکثر حصہ ہندی یا بھاشا سے نکلا ہے۔ اور اوسکی اصلی ماں اور اصلی ماخذ ہندی ہی ہے۔ اس لحاظ سے اُردو بولنے والی اقوام کا بھی یہ فرض ہے۔ کہ وہ ہندی زبان سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کریں۔ خصوصًا شاعری اور نظمی پہلو سے ہندی بھاشا نزاکتوں اور خوبیوں سے اُردو زبان کے ناظموں اور شاعروں کو ضرور واقف ہونا چاہیئے۔ اس سے صرف ادبی نشوونما ہی منصور نہیں۔ بلکہ ہندوستان کی دو قوموں میں تخیلاتی اتحاد اور وابستگی کی بھی بنیاد پڑسکتی ہے۔ اور اس طریق عمل سے دونوں قومیں ادبی نقطہ نگاہ سے ایک صحیح مسلک پر آتی جائیں گی۔ کیونکہ تخیلاتی وابستگی اور تخیلاتی اتحاد زیادہ تر وسیع اور مضبوط ہوسکتا ہے۔ بہرحال ہر قوم کا یہ فرض ہے۔ کہ ہند میں رہ کر وہ ایک دوسرے کے لسانی خیالات اور ادبی خوبیوں اور علمی و تمدنی محاسن سے واقفیت پیدا کرے۔ اور ایسی واقفیت سے اپنی اپنی زبان میں ترقی کیجاوے۔ اُسکا دوسرے الفاظ میں یہ نتیجہ ہوگا۔ گویا کسی حدتک ہندوستان کی زبان ایک ہی ہے۔ اور مشترکہ ہندوستان کی قومیں ایک ہی ادبی سٹیج پر کام کررہی ہیں۔ فقط

۹ اکتوبر ۱۲ء جہلم

ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں

ہمیشہ اہل زبان کی یہ کوشش رہتی ہے۔ کہ اونکی زبان میں کسی غیر زبان

کے الفاظ مستعمل اور شائع ہوں کسی حد تک یہ خیال اور یہ کوشش اچھی ہے۔ اپنی ہی زبان کو پاک صاف رکھنا ضروری ہے۔ لیکن یہ بات اسی حد تک موزون ہوگی جب کوئی زبان بذات خود دوسری زبانوں کے جدید الفاظ جدید علمی اصطلاحات سے ایک بڑی حد تک مستغنی ہو۔ اگر کوئی زبان مستغنی نہیں ہے۔ تو خواہ یہ کوشش کیسی ہی اہم ہو۔ پھر بھی ایسی زبان دوسری السنہ کے موزون اور جدید الفاظ اور جدید اصطلاحات کے اخذ اور قبول کرنے سے رہ نہیں سکتی۔

بعض قومیں جو مدتوں اپنا خون دوسری اقوام کے خون کے ساتھ ملانے سے پرہیز کرتی ہیں۔ آخیر پیرا نہیں یہ قید توڑنی ہی پڑی۔ زبانوں کی ضروریات تو اس سے بھی زیادہ تر وسعت رکھتی یا طالب وسعت ہیں۔

موجودہ زمانہ ہر ایک قوم اور ہر ایک ملت کو دوسری قوم اور دوسری ملت سے ملا رہا ہے۔ مشکل ہے۔ کہ زبانیں بھی آپس میں نہ ملیں۔ اور ایک زبان کے بعض الفاظ اور بعض اصطلاحات دوسری زبانوں میں ضرورتاً منتقل نہ ہوں۔ بیشک جہاں تک کوئی زبان اپنے ہی دائرہ کے اندر محدود اور محفوظ رہ سکتی ہے۔ رہے لیکن ضرورت پر یہ شرط توڑنی ہی پڑتی ہے۔

یا تو خود ایک زبان والے ضرورت کی وجہ سے جدید الفاظ جدید اصطلاحات گھڑیں یا دوسری زبانوں سے لیں پہلی صورت میں بھی کبھی نہ کبھی ایک زبان دوسری زبان سے ضرورتاً مدد لیتی ہے۔ ہندوستان میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور ان کی آپس میں کسی نہ کسی حد تک وابستگی بھی ہے۔

جب اردو بھاشا اور دیگر السنہ ہند کی ممنون ہے۔ اور حدود ہند کی باہر کی زبانوں عربی اور فارسی کی بھی خوشہ چین ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ کیوں پنجابی اور دیگر متصلہ السنہ ہند سے اور بھی مزید مدد نہ لی جائے پنجابی زبان کو اردو زبان سے ایک خاص نسبت حاصل ہے۔ بعض وقت یہ خیال بھی گزرتا ہے۔ کہ

"کیا پنجابی زبان سے اُردو پیدا ہوئی ہے" "یا اُردو زبان کا بگاڑ پنجابی زبان ہے۔"
ہمنے کتاب امثال میں اس نسبت پر روشنی ڈالی ہے۔ پنجابی زبان کے الفاظ کا اکثر حصہ گویا اُردو ہی کا حصہ ہے تھوڑی سی ترمیم کے بعد پنجابی اُردو اور اُردو پنجابی بن جاتی ہے۔ یہ کوئی وجہ نہیں کہ جب اُردو زبان عربی فارسی بھاشا اور بعض انگریزی کے الفاظ بھی استعمال کرتی ہے۔ تو کیوں پنجابی کے موزون الفاظ سے بھی کام نہ لیا جائے۔
چاہے اُردو کیسی ہی نفرت ظاہر کرے۔ رفتہ رفتہ یہ ہوکے رہیگا۔ کہ پنجابی اور دیگر متصل زبان کے الفاظ موزون اُردو زبان میں کھپتے جائینگے۔ اور اہل زبان کو بھی انکا ساتھ دینا ہی پڑیگا۔
اخیر پر ہم چند فقرات پنجابی زبان کو حوالہ قلم کرکے دکھانا چاہتے ہیں۔ کہ اردو الفاظ اور پنجابی زبان میں کہاں تک موافقت اور مرافقت ہے۔

پنجابی

ہر زبان دوسری زبان نال اک رشتہ رکھدی ہے ہندوستان دیاں ساری زباناں آپس وچ رلیاں ملیاں ہن۔ پنجابی زبان دے سارے لفظ اُردو زبان نال ہوبہو رل جاندے ہن۔ ایس ہتھوں ایہ کہنا پیندا ہے۔ کہ یا تے اُردو زبان ایتھوں پنجابی زبان بگڑکے بنی ہے۔ اور یا پنجابی زبان تھوں اُردو زبان بنی ہے۔
ذرا دوہوں دے لفظاں نوں آپس وچ رلاکے تے دیکھو۔ ساری گل معلوم ہو جاندی ہے پنجابی زبان دا بھی اُردو پر کچھ نہ کچھ حق ہے۔ پنجابی زبان اُردو زبان دی خوبی تے سوہپن وچ سوہنا کردی ہے۔
جن جن الفاظ پر ہندسے دیئے گئے ہیں۔ یہ گویا خالص پنجابی الفاظ ہیں دیکھ لو۔ وہ بھی ادنے تغیر اور ہیر پھیر سے اردو بھی بن سکتے ہیں۔ باقی تو کل اُردو ہیں۔ یا ایسے الفاظ ان الفاظ سے زیادہ تر موزون اور صحیح ہیں۔ جو دلّی کے مضافات اور نواح میں بولے جاتے ہیں۔ جو گویا دلّی کی ٹکسالی زبان کے عین ہمسایہ ہیں۔ اور جس ہمسائے گت سے دلی والے انکار نہیں کرسکتے۔
جب دلّی کے مضافات کے بعض الفاظ اُردو میں لئے گئے ہیں۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ پنجابی کے بعض موزون الفاظ کا داخلہ اُردو زبان کی حدود میں کیوں نہ ہوسکے ہمیں دلی اور لکھنؤ کی ٹکسالی زبان اور خوش آیند محاورات اور اُنکی دلآویزی اور فصاحت و بلاغت سے انکار نہیں۔ اور ہم اُنکے دلدادہ ہیں۔ مگر ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے۔ کہ جب دوسری زبانوں کے بعض الفاظ اُردو میں داخل کرتے ہیں۔ تو کیوں پنجاب کو بھی یہ فخر بخشا جائے۔ یہ بحث قابل مزید بحث کے ہے۔ ماہرین زبان اُردو اور نقادان السنہ اس پر غور کریں۔ فتدبر

تمت

ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ

مرغوب ایجنسی لاہور

چوک متی

گردھر سٹیم پریس لاہور